رضیہ بٹ

یوں بھی ہوتا ہے

گُل اندامے

لنڈی کوتل کے بے آب دگیاہ پہاڑوں پر سرد اور تاریک رات اُتری ہوئی تھی۔ ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ مٹی دُھول اُڑ رہی تھی۔ شائیں شائیں کی آوازیں وقفوں کے بعد آرہی تھیں، کہیں کہیں اُگی کانٹے دار جھاڑیوں اور سوکھی شاخوں والے اکادُکا درخت، جھکڑوں کے خلاف جیسے احتجاجی آوازیں بلند کررہے تھے۔

پہاڑوں کے پتھریلے سینے پر کئی گاؤں آباد تھے۔ کچّے پکّے گھروندے تھے۔ کہیں کہیں ہموار زمین پر کھیت تھے۔ جن کی آبیاری قدرت کے رحم وکرم پر تھی۔ بارش کے چھینٹے پڑتے تو فصلوں میں جان پڑجاتی اور فصلیں لگانے والے شاداں وفرحاں لہلہاتے کھیتوں میں اپنی محنت کا ثمر دیکھتے۔

ایک آدھ گاؤں نیچے دریا کے کنارے بھی آباد تھا لیکن یہاں بھی پتھریلی زمین تھی، لوگ زیادہ تر مزدوری کرتے تھے۔ بکریاں پالتے بھینسیں رکھتے۔ اگر کوئی حصّہ سرسبز وشاداب تھا تو وہ گاؤں کے مالک خان حشمت اللہ خان کی ملکیت تھا۔ انہی ہریالے کھیتوں اور خوشبودار باغوں کے کنارے خان کی وسیع وعریض حویلی تھی۔ بہت بڑا حجرہ تھا، جہاں گاؤں کے لوگ اپنی شامیں اکٹھی گزارنے کو جمع ہوتے، دکھ سکھ کی باتیں کرتے، ایک دوسرے کے بارے میں آگہی حاصل کرتے، دوستی دشمنی کی پرکھ کرتے، خان کا حجرہ ہر خاص وعام کے لیے ہمہ وقت کُھلا رہتا تھا۔ بان کے موٹے

موٹے پایوں والے پلنگ یہاں بچھے ہوتے ۔ کچی دیواروں پر رائفلیں، بندوقیں اور شکار کیے
ہوئے جانوروں کی کھالیں لٹکی ہوتیں ۔ چلمیں رکھی رہتیں ۔ خان کے مستعد ملازم آنے
والوں کی خاطر مدارات کرتے ۔ خوشبودار تمباکو کی چلمیں تازہ کر کر کے مہمانوں کو پیش
کرتے ۔ سنہری قہوہ چینی کی بے ڈنڈی کی پیالیوں میں اُن کے سامنے رکھا جاتا ۔ جرگے بھی
خان ہی کے حجرے میں بیٹھتے تھے ۔ متنازعہ مسائل کے فیصلے بھی یہاں ہی کیے جاتے تھے

خان کی حویلی فصیل نما دیواروں کے اندر اک شانِ تمکنت سے کھڑی تھی ۔ پورے
گاؤں میں صرف یہی حویلی پکّی اینٹوں سے بنی تھی ۔ گاؤں کے مکان مٹی سے بنے تھے ۔
کھلے کھلے کچے صحن، جھکے جھکے درختوں کی ٹہنیوں اور ستونوں کے سہارے کھڑے برآمدے
اور اُن کے پیچھے ایک ایک، دو دو کمرے یا دالان ۔ ہر گھر کی ساخت تقریباً ایک جیسی ہی
تھی ـــــ ان ہی برآمدوں کے کونوں میں مٹی کے بے ہنگم سے چولہے بنے ہوئے تھے ۔
جن میں گھاس پھونس اور ٹہنیاں جلائی جاتی تھیں ۔ جن پر کالے کالے ٹیڑھے میڑھے سلور
کے دیگچے دیگچیاں اہلِ خانہ کے کھانا بنانے کے لیے رکھی رہتیں ۔ قہوہ اور چائے بہت
استعمال ہوتی ۔ جس کے لیے تام چینی کی نیلی پیلی چائے دانیاں اور پیالیاں ہر گھر میں
ضرور ہوتیں ۔

کچے گھروندوں ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور میلے کچیلے پرانے پرانے کپڑوں سے
گاؤں والوں کی مالی حالت عیاں تھی ۔ کچھ لوگوں نے بکریاں اور گائے بھینسیں پال
رکھی تھیں ۔ دودھ دہی اور لسی جوار یا باجرے کی روٹی کے ساتھ مل جاتی ۔ گاؤں کے کچھ
نوجوان اپنی مالی حالت درست کرنے کے لیے شہروں کا رُخ کر رہے تھے ۔ وہاں
محنت مزدوری کے مواقع بھی بہت تھے اور آمدنی بھی گاؤں کی نسبت زیادہ تھی ۔
زیادہ تر نوجوان شہر جا کر ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کرتے ۔ ٹرک ڈرائیوری اکثر نے
پیشے کے طور پر اختیار کر رکھی تھی ۔ کچھ بڑے بڑے کارخانوں اور کوٹھیوں میں چوکیداری

کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ معقول تنخواہ ملتی تھی ۔ گاؤں میں اُن کے گھر والوں کی
ضرورتیں محدود ہوتی تھیں ۔ اس لیے یہ تنخواہ ان کے لیے بہت ہوتی تھی ۔

ہواؤں کے جھکڑ کچھ اور تیز ہو گئے تھے ۔ کپکپا دینے والی سردی سے فضا جیسے
منجمد ہو رہی تھی ۔ کواڑ بار بار بج اُٹھتے تھے اور پرانے دروازوں کی جھریوں سے تیز ہوا
اندر در آتی تھی ۔

گل اندامے نے اس تیز ہوا سے بچنے کے لیے دروازے پر پرانی چادر ٹانگ دی
تھی ۔ اور چھینٹ کا لحاف ماں اور بھائی کے اوپر اچھی طرح سے لپیٹ دیا تھا لیکن
سات آٹھ سالہ بہادر اسمٹ سمٹ کر ماں کے پیٹ میں گھٹنے گھسا رہا تھا ـــــ ماں
کی آنکھ بار بار کھل جاتی تھی ۔

طاق میں جلنے والے تیل کے دیئے کی لَو ہوا کی زد میں آنے کے ساتھ ہی بجھنے
لگتی ۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب ہوا کا جھونکا گزر جاتا لَو برقرار ہو جاتی ۔

ماں کے برابر کی چارپائی پر گل اندامے لیٹی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا غبار نہیں
تھا وہ جاگ رہی تھی ۔ بالکل تر و تازہ تھی ۔ جب جوان آنکھوں میں سپنوں کا حُسن اُتر
آئے تو نیند کی تکان غائب ہو جاتی ہے ۔ آسودگی طمانیت اور بشاشت کا احساس
رگ رگ میں نشے کی طرح دوڑتا محسوس ہوتا ہے ۔

گل اندامے کی آنکھوں میں کُوٹے ہوئے ہیروں کی چمک تھی ۔ ہونٹوں پر بڑی دلآویز
مسکراہٹ تھی ۔ کبھی چت لیٹ کر چھت کی دھواں کھائی لکڑیوں کو تکنے لگتی کبھی گال
تلے ہاتھ رکھ کر دائیں جانب کروٹ بدلتی اور طاق میں رکھے لَو دیتے دیئے کو تکنے لگتی ۔
جس کی روشنی پورے کمرے کی تاریکی دُور کرنے سے قاصر تھی ۔ کبھی بائیں رُخ ہو کر
ماں کا چہرہ تکنے لگتی ۔ جس پر وقت نے دکھ سکھ کی کئی مہریں ثبت کر رکھی تھیں ۔ بیوہ
ماں، جسے اب آنکھوں سے ٹھیک دکھائی نہیں دیتا تھا ـــــ ساری زندگی محنت

ہی کرتی رہی تھی۔ سکھ اور سکون اُسے میسّر نہیں آیا تھا۔ دونوں بڑے بیٹے گاؤں ہی میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ روکھی سوکھی ہی چلتی تھی۔ گل اندامے کا بار کندھوں پر تھا اور بہادرے کا بوجھ بھی ابھی گھسیٹنا تھا۔ گل اندامے جب بھی ماں کا چہرہ دیکھتی، دل میں ایک کسک سی محسوس ہوتی۔ ماں کا دکھ اس لیے بھی گھمبیر تھا کہ دونوں بھائی اور شوہر دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اب بیٹے تھے جن کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ گو بیٹوں کی دوستی خان حشمت اللہ خان کے بیٹے کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کافی مضبوط سہارا مل چکا تھا۔ پھر بھی ماں تھی ہر وقت دل وسوسوں اور اندیشوں سے بھرا رہتا۔

آج گل اندامے، ماں کو دیکھ کر مضطرب اور بے چین نہیں ہو رہی تھی بلکہ اُس کے من میں بہار اُتری ہوئی تھی پھولوں کی مہک بسی تھی، شگوفے پھوٹ رہے تھے کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ خوشبو ہی خوشبو تھی۔ روشنی ہی روشنی تھی۔

آج اُس نے حیدر خاں کو دیکھا تھا۔

حیدر خاں۔

گرانڈیل سا نوجوان۔

جو اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے شہر جا چکا تھا۔ ان دنوں گاؤں آیا ہوا تھا۔ شہری ماحول نے اسے کچھ زیادہ ہی شائستہ اور پُروقار بنا دیا تھا۔ اُس نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پشاوری چپل پاؤں میں تھی اور خوبصورت تراش کی واسکٹ بھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں میں دبائے ہوئے اُس کے قریب سے گزرا تھا اور اُسے دیکھ کر ٹھٹک کر یوں دیکھا تھا۔ جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"گل اندامے" وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا" تم۔ تم گل اندامہ ہی ہو نا؟"

گل اندامہ زیرِ لب مسکرائی تھی۔ آنکھوں میں مستی بھر آئی تھی۔ شوخی سے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ چند لمحے کھڑا رہا تھا۔ پھر گل اندامے کے پیچھے پیچھے آنے والے بہادرے سے بولا تھا" بہادرے، گل اندامے کہاں جا رہی ہے ——"

" لالہ خان کو کھیتوں پر کھانا دینے"

" یہ گل اندامے ہی ہے نا؟"

" ہاں ——"

گل اندامے نے سر گھما کر اُسے دیکھا تھا۔ بے آواز قہقہے کی پھوار حیدر خاں کو اندر سے بھگو گئی تھی —— دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔

" تم کیا سے کیا ہو چکی ہو گل اندامے ——" حیدر خاں کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

" تم بھی کیا سے کیا ہو چکے ہو" اُس نے ہولے سے جواب دیا تھا۔

" گل اندامے" حیدر خاں نے قدم اُٹھاتے ہوئے کہا۔

" ہوں" گل اندامے آگے چلتے ہوئے بولی۔ بہادرا اپنی بکری کے پیچھے بھاگنے لگا تھا۔

" رُکو، نا ——" حیدر خاں نے لجاجت سے کہا۔

" نہیں حیدر خاں ——" گل اندامے اپنی بھاری چادر کو جسے اُس نے اپنے سر اور کندھوں کے پیچھے ڈال رکھا تھا، اپنے کندھوں پر لپیٹتے ہوئے بولی" شہر جا کر گاؤں کے آداب بھول گئے ہو لوگ آ جا رہے ہیں"

" تو۔ تم مجھے کہاں ملو گی؟"

" پتہ نہیں"

”گل اندامے میں تین سال کے بعد آیا ہوں۔ تمہارا بچپن کا ساتھی ہوں۔“

”لیکن اب ہم بڑے ہو چکے ہیں۔“

”ہماری محبّت بھی پل کر جوان ہو چکی ہے گل اندامے۔“

”اچھا۔“

اُس کی ہنسی ہولے سے فضا کو مترنّم کر گئی۔ حیدر خان دل تھام کر رہ گیا۔ گل اندامے تیز تیز قدم اٹھاتے بہادر سے کے قریب ہونے لگی۔

”گل اندامے۔“ حیدر خاں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”پھر کب ملوگی؟“

”پتہ نہیں۔“

”خان لالہ کا کھانا روز کھیتوں پر لے کر جاتی ہو؟“

”بھوک تو روز ہی لگتی ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”اسی راستے سے جاتی ہو نا؟“ وہ چند قدم پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

”ہمارے کھیتوں کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اور دریا پر بھی اسی راستے سے جاتے ہیں۔“

حیدر خاں کے لب متبسّم ہو گئے۔

”دریا پر بھینسوں کو پانی پلانے جاتی ہو نا؟“

”ہاں۔“

”میں کل وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”حیدر خاں یونہی نہ آجانا ـــــ کسی کو پتہ چل گیا تو....“

”تو کیا ہوگا؟“

”تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو، اور جانتے ہو کیا ہو سکتا ہے۔“

”مجھے پروا نہیں۔ میں تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔“

”احتیاط لازمی ہے۔“

گل اندامے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

اور اس وقت بستر میں پڑی کبھی وہ اس ملاقات کو ذہن میں تازہ کر رہی تھی۔ کبھی کل دریا کے کنارے حیدر خاں سے ملنے کے خیال سے محظوظ ہو رہی تھی۔ حیدر خاں اس کی آنکھوں میں، دل و دماغ میں اور روح میں سمایا ہوا تھا۔ جوان توانا مضبوط جسم اور خوبصورت مردانہ خدوخال والا حیدر خاں ـــــ وہ بھی تو تین سال میں کیا سے کیا بن گیا تھا۔

گل اندامے نے پھر کروٹ بدلی ـــــ چارپائی چرچرائی۔ پھر جھکڑ سے دروازہ بجا، کواڑ کھڑکھڑائے۔ ماں کی آنکھ کھل گئی۔

”گل اندامے۔“

”کیا ہے ماں۔“

”دروازہ کھٹکا ہے۔“

”نہیں ماں۔ جھکڑ سے دروازہ بجا ہے۔“

”تیرے بھائی نہیں آئے ابھی؟“

”نہیں ماں۔“

”اُٹھ کے دیکھو تو سہی۔ لگتا ہے، باہر کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں وہ۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ وہ شاید آگئے ہوں۔“

”اوہ نہیں ماں ـــــ وہ ابھی کہاں سے آئیں گے۔ تمہیں پتہ تو ہے۔ خان کے لڑکے کی شادی ہے۔ اور پشاور سے گانے بجانے والے آئے ہوئے ہیں۔ آج رات وہ حجرے ہی میں رہیں گے ـــــ حجرے سے ڈھول بجنے کی آوازیں کبھی کبھی ہوا کے ساتھ ادھر بھی آتی ہیں۔ میں سُن رہی ہوں۔“

"تُو سوئی نہیں ابھی ——؟"

"تُو سوجا ماں۔ خان لالہ آئیں گے تو میں اُٹھ کر دروازہ کھول دوں گی۔"

"بہت دیر لگادی اُنہوں نے۔"

"کوئی بات نہیں۔ خان کے حجرے ہی میں ہیں۔ وہ کھیل تماشا دیکھ رہے ہوں گے۔ عظمت اللہ خان کی شادی ہے ماں۔ کوئی چھوٹی موٹی شادی تھوڑا ہی ہے۔ ناچ گانا ہو رہا ہے۔ یہ محفل تو سحری سے پہلے ختم ہونے کی نہیں۔"

"ہاں ——"

"اور رحمت اللہ خان بھائیوں کا دوست ہے۔ اپنے بڑے بھائی کی شادی پر انہیں خاص طور سے بلایا ہے —— تُو سوجا —— جب وہ آئیں گے میں دروازہ کھول دوں گی۔"

"تجھے نیند کیوں نہیں آرہی؟"

"تُو تو جانتی ہے ماں۔ بھائی گھر سے باہر ہوں۔ تو ان کے انتظار میں جاگتی رہتی ہوں۔"

"ہوں" ماں نے جماہی لی پھر بولی "پگلی۔ جب جانتی ہے کہ وہ سحری سے پہلے نہیں آئیں گے تو جاگ کیوں رہی ہے۔ سو جا۔" ماں نے کروٹ بدلی۔ لحاف بہادرے پر ٹھیک سے دبایا، اس کے چہرے کو ٹٹولا اور سینے سے لگا کر غنودگی میں ڈوب گئی۔

باہر جھکّڑ اسی انداز میں چل رہے تھے۔ دُور کہیں بادل بھی گرج رہے تھے۔ شائیں شائیں کی آوازیں وقفوں سے آرہی تھیں۔ ہواؤں کے منہ زور ریلے کبھی کبھی حجرے میں جمی محفلِ موسیقی کی کوئی تان بھی اُڑا لاتے۔ کبھی گھنگروؤں کی چھنا چھن بھی فضا میں ترنم گھول جاتی۔ کبھی کبھی کُتّے بھی بھونک اُٹھتے۔ اور کوئی راہ گیر انہیں ڈرانے کے لیے لاٹھی زور سے پٹختا۔ لگتا تھا حجرے سے کوئی نیند کا رسیا محفل کو شباب پر

چھوڑ کر واپس آرہا ہے۔

دروازے اب بھی تند ہوا کے ریلے سے چرچرا رہے تھے۔ اور کواڑ بج رہے تھے۔ گل اندامے کو بھی یوں لگتا جیسے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اور ایک بار تو اس نے بستر میں پڑے پڑے پکارا بھی "کون ہے" لیکن جواب نہ ملا۔ وہ لحاف میں دبک گئی۔ یقیناً بھائیوں نے سحری سے پہلے نہیں آنا تھا۔ رحمت اللہ خان کے دوست تھے دونوں۔ اس محفل میں شرکت کا بڑا اعزاز ملا تھا دونوں کو۔ دوستی ہی قدرِ مشترک تھی۔ ورنہ کہاں خان حشمت اللہ خان کے فرزند اور کہاں دلنواز اور شہباز۔ وہ گاؤں کے مالک اور یہ اُن کے کھیتوں پر کام کرنے والے معمولی مزارعے۔ لیکن تینوں کا بچپن کا ساتھ تھا۔ ساتھ کھیلے، ساتھ پلے بڑھے۔ دلنواز اور شہباز —— خان کی حویلی میں آتے جاتے تھے۔ رحمت خان اُن کے گھر بے دھڑک اور بے روک ٹوک آتا جاتا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ گل اندامہ بھی اُن کے کھیل کود میں شریک ہوا کرتی تھی لیکن جب وہ بڑی ہو گئی تو خود ہی اُن کے ساتھ کھیلنا بند کر دیا۔ ماں اسے گھر کے کام کاج میں جوتے رکھتی۔ گل اندامہ خود بھی سمجھ دار تھی۔ وقت کے تقاضے خود بخود ہی اُس کی سمجھ میں آگئے تھے۔ کچھ یہی رویّہ رحمت خان کا بھی تھا۔ اب وہ دلنواز اور شہباز کے پاس آتا تو باہر ہی سے آواز دیتا۔ کھیتوں میں مل لیتا۔

پھر وہ پشاور پڑھنے کے لیے چلا گیا۔ پچھلے سال ہی وہ واپس آیا تھا۔ پڑھائی دوستی میں دیوار نہیں بنی تھی۔ خلوص اور محبّت نے چولا نہیں بدلا تھا۔ تینوں اب بھی ویسے ہی بے تکلّف دوست تھے۔ گل اندامے کی کبھی کبھی کھیتوں پر یا پھر دریا پر آتے جاتے رحمت خان سے مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ وہ بڑے مہذب انداز میں سر جھکائے گزرتے ہوئے اُسے سلام کرتا۔ کبھی وہ خود ہی پہل کر لیتی۔

"کیا حال ہے خان؟"

"کیسی ہو گل اندامے ؟"

بس یہی رسمی جملے ہوتے جن کا تبادلہ ہو جاتا۔ اس سے زیادہ نہ کبھی خان نے کچھ کہا تھا، نہ ہی گل اندامہ نے۔

دروازہ پھر بجا۔

کواڑ پھر کھڑکھڑائے۔

"کون" گل اندامہ نے لحاف سے منہ نکال کر کہا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ تو اس نے بڑبڑاتے ہوئے منہ لحاف کے اندر کر لیا۔

مشکل سے نیند آنکھوں میں اُتر رہی تھی۔ حیدر خان کا ہیولا دھندلا رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل اور سر بھاری ہو رہا تھا

کواڑ بجنے سے وہ پھر بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا شاید برابر والے کمرے میں بکریاں دروازے کو سینگ مار رہی ہیں۔ یا کُڈھ میں بھینس چارے کا برتن کھڑکھڑا رہی ہے۔

اُس نے منہ سر لپیٹ کر سو جانے کی کوشش کی۔

دروازہ ایک بار پھر بجا۔

یہ یقیناً دستک تھی ـــــ گل اندامہ نے لحاف سے سر نکالا۔ کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے بجنے اور کھڑکنے میں تیز کرنے کی کوشش کی۔ دروازے پر پھر ہولے سے دستک ہوئی۔

"گل لالہ آ گئے شاید" وہ بستر میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور سرہانے رکھی چھینٹ کی بڑی سی چادر اٹھا کر سر پر ڈالی، گھیر دار قمیض کو ٹھیک کیا۔

دروازہ پھر بجا۔

اسی لمحے ہوا کا کوئی ریلا حجرے سے کسی خوبصورت گیت کے بول اُڑا لایا۔

گل اندامہ حیران بھی ہوئی کہ خان لالہ اور گل لالہ کیسے محفل سے اُٹھ آئے ہیں۔ رحمت خاں نے کیسے انہیں آنے دیا ہے۔

وہ بستر سے نکلی۔ ماں کی طرف دیکھا، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ ماں کی نیند کے خراب ہو جانے کے ڈر سے اس نے آہستگی سے دروازے کی کنڈی کھولی۔ اور پھر برآمدے میں نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ باہر کپکپا دینے والی سردی تھی۔ سرکنڈوں کے چھت والے جھکے ہوئے بے ترتیب سے برآمدے سے وہ تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ کچے صحن کو اس نے سردی کے ڈر سے بھاگ کر پار کیا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" اُس نے دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب نہ پا کر اس نے دوبارہ پوچھا" کون ؟"

"گل اندامے" سرگوشی اُبھری۔

"کون" گل اندامے آواز پہچان کر گھبرا سی گئی۔

"حیدر ہوں گل اندامے۔ دروازہ کھولو"

"حیدر ـــــ" گل اندامے پر گھبراہٹ بُری طرح مسلط ہو گئی۔

"جلدی کرو، گل اندامے دروازہ کھولو۔ میں حیدر ہوں" وہ بولا۔

"تم۔ تم اس وقت کیوں آئے ـــــ؟" گھبراہٹ میں گل اندامے نے کنڈی کھول دی۔

حیدر خاں کمبل میں منہ سر لپیٹے تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر آ گیا۔ جلدی سے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور کمبل چہرے سے ہٹاتے ہوئے دروازے کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

"تم ـــــ حیدر ـــــ تم ـــــ" گل اندامے شدید سردی کے باوجود گھبراہٹ

سے پسینے پسینے ہو گئی۔

"ہاں میں ۔۔۔" حیدر خاں نے جیب سے ماچس نکال کر تیلی جلائی۔

"لیکن ۔۔۔" ڈر کے مارے گل اندامے کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

"میری جرأت پر حیران ہو؟"

"ہاں۔"

"دل کے ہاتھوں مجبور تھا گل اندامے۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ دلنواز اور شہباز آج خان کے حجرے میں ہیں۔ تم اور خالہ گھر پر اکیلی ہو۔ بس جان ہتھیلی پر رکھ کر چلا آیا۔"

"واپس چلے جاؤ حیدر ۔۔۔ یہ طریق اچھا نہیں۔ شریف لوگ ایسا نہیں کرتے ۔۔۔"

"دل کے مارے ایسا کر گزرتے ہیں۔"

"کسی کو پتہ چل گیا تو ۔۔۔"

"نہیں چلے گا ۔ چل گیا تو میں سزا بھگت لوں گا۔"

"میری بدنامی ہو گی۔"

"ایسی باتیں نہیں سوچو۔"

"حیدر یہ گاؤں ہے۔ ایسی باتوں کی لوگ جلدی بو سونگھ لیتے ہیں۔"

"گل اندامے، میں یہ سارے وسوسے ذہن سے جھٹک کر یہاں آیا ہوں۔ تم سے ملنے، صرف ملنے۔ پیار کے دو بول کہنے اور سننے ۔۔۔ بتاؤ کیا تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ نہیں کرتیں تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔" حیدر نے تیلی پھینکتے ہوئے کہا۔

"حیدر ۔۔۔" گل اندام کی آواز لرز گئی۔

حیدر نے اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔ چند لمحے بے خودی میں گزر گئے۔ پھر گل اندام نے اپنا وجود اُس کے مضبوط بازوؤں کے حصار سے نکالتے ہوئے کہا "تم کتنے دن

یہاں ہو؟"

"جتنے دن کہو گی، ٹھہر جاؤں گا۔"

"تمہیں کام پر واپس جانا ہے۔ وقت کیوں ضائع کرو گے۔"

"وقت ضائع نہیں ہو گا گل اندامے۔ تمہاری معیت میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ امر ہے۔"

"لیکن ہر روز تو تم یہاں نہیں آسکتے۔"

"تم کھیتوں پر تو روز ہی جاتی ہو۔ دریا پر بھینس کو بھی لے جاتی ہو۔"

"لیکن میں روز تم سے مل نہیں سکتی حیدر خاں۔ گاؤں کے لوگوں کی نظریں بڑی تیز ہوتی ہیں۔"

"پیشتر اس کے کہ لوگوں کی نظریں بولنے لگیں، میں تمہیں اپنا لوں گا گل اندامے ۔۔۔"

"سچ۔"

"ہاں۔"

"تو ۔۔۔"

"میں اپنی ماں اور بہن کو تمہارے ہاں رشتہ لینے کے لیے بھیجوں گا۔"

"لیکن ۔۔۔"

"کیا گل اندامے۔"

"تم جانتے ہو نا، ہمارے رشتے اکثر بدلے کے رشتے ہوتے ہیں ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔"

"پھر ۔۔۔"

"دلنواز یا شہباز کی ابھی کہیں بات تو نہیں چل رہی۔"

"فی الحال تو نہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

"کیسے ـــــ"

"میری بہن زرینے۔"

"اوہ حیدر ـــــ تم، تم کتنے اچھے ہو۔"

"تمہیں پانے کے لیے میں بہن کا رشتہ تو کیا جان بھی دے سکتا ہوں۔"

اندھیرے ہی میں گل اندامے مسکرائی ـــــ حیدر خاں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر اُس پر اپنے ہونٹوں سے مہر ثبت کر دی۔ گل اندامے نے اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔

حیدر خاں بولا ـــــ "یہ ہاتھ میں نے تھام لیا ہے ـــــ اس کو اب میرے ہاتھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ تم میری ہو گل اندامے ـــــ میری ـــــ"

"ہاں حیدر خاں ـــــ گل اندامے تمہاری ہے ـــــ جب تک جیے گی، تمہاری رہے گی۔ جب مرے گی تمہارے نام پر مرے گی ـــــ"

"گل اندامے ـــــ" حیدر خاں نے اس کا ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ لیا ـــــ

ہواؤں کا پُر زور ریلا آیا۔ دروازہ چرچرایا ـــــ دُور کتے بھونکے۔ گل اندامے نے ڈر کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"اب جاؤ حیدر خاں۔ شاید کوئی آ رہا ہے ـــــ بھائی نہ آجائیں۔ تم جلدی سے نکل جاؤ ـــــ"

"جی نہیں چاہ رہا ـــــ گل اندامے ـــــ چند لمحے اور۔"

"نہیں حیدر خاں۔ خطرہ مول نہیں لینا چاہیئے ـــــ کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیئے۔ ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔"

"تو بس جاؤ ـــــ تمہارا اس طرح آنا پہلی اور آخری بار ہے۔"

"ہاں ـــــ اب میں تمہیں ہمیشہ کے لیے لے جانے کے لیے ہی یہاں آؤنگا۔"

گل اندامے کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ـــــ اُس نے سر ہلایا ـــــ حیدر خاں نے اس کا چہرہ اندھیرے میں ٹٹول کر ہاتھوں کے پیالے میں بھرا ـــــ اور بولا۔ "خدا حافظ گل اندامے۔"

"خدا حافظ۔" گل اندامے نے جلدی سے اُس کے مضبوط ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"گل اندامے، تم میری ہو۔ میں نے تمہیں چھُوا ہے۔ اب تمہیں کوئی اور نہیں چھوئے گا ـــــ"

"میں جانتی ہوں، اب تم جاؤ۔"

"میں دو ایک دن میں اپنی ماں اور بہن کو بھیجوں گا۔"

"اچھا ـــــ"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

حیدر خاں نے کنڈی کھولی، دروازے سے گردن نکال کر کچّی گلی میں دائیں بائیں دیکھا ـــــ تسلی کر کے کہ گلی سنسان تھی۔ وہ ایک بار پھر گل اندامے کی طرف مڑا، خدا حافظ کہا اور گلی میں نکل گیا۔ تھوڑی دیر دیوار کے ساتھ ساتھ چلا۔ پھر گلی کی نکڑ سے مڑ گیا۔

گل اندامے نے ایک لمبا گہرا سانس لیتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ چند لمحے دروازے سے پشت لگا کر آنکھیں بند کیے کھڑی رہی ـــــ سانس بحال ہوتے کچھ وقت لگا۔

پھر وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی کمرے میں چلی آئی۔

"ماں"

"ہوں"

"ایک بات کہوں"

"ضرور کہو۔ ایک کیا دس باتیں کہو۔ میرے بچے۔ تم اپنی ماں سے نہ کہو گے تو کس سے کہو گے۔ جھجک کیوں رہے ہو۔ کہو کیا کہنا ہے"

"ماں، تم ان دنوں میری شادی کی فکر کر رہی ہو۔ خان بابا کہہ رہے تھے کہ..."

"ہاں رحمت خانا ـــــ تمہارے بابا تو چاہتے تھے، عظمت خان کے ساتھ ہی تمہاری شادی بھی ہو جاتی ـــــ وہ دونوں کے فرض...."

لیکن میرے لیے کوئی رشتہ نہیں دیکھا تھا آپ نے۔ اس لیے صرف لالہ کی شادی کی"

"ہاں"

"ماں۔ ایک رشتہ ہے"

"اچھا۔ خود تلاش کر لیا۔ کہاں ہے، کون ہے وہ؟"

"بہت خوبصورت۔ بہت نیک، بہت اچھی ہے۔ صرف"

"صرف کیا؟"

غریب ہے۔ ہماری طرح زمینوں، باغوں اور حویلیوں کی مالک نہیں ہے"

رحمت خاں کی بات سن کر ماں چپ ہو گئی۔ رحمت خاں، ماں کے قریب کھسک آیا۔ اُس کی گردن میں اپنا بازو ڈال کر چہرہ اس کے کندھے پر ٹکا کر سرگوشی کے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "چپ کیوں ہو گئیں ماں۔ کیا غریب ہونا جرم ہے؟

پھر تمہارے پاس اتنی دولت ہے۔ وہ کس لیے ہے ــــ کسی غریب لڑکی کو یہ بے پناہ دولت پناہ نہیں دے سکتی۔ تم نے لالہ کی شادی سربلند خان کے ہاں کی ہے۔ سربلند جو دولت میں بھی بہت بلند ہے۔ آپ نے اپنی تمنا پوری کر لی۔ اب میری...."

"لیکن بچے ــــ"

"کیا ماں"

"تمہارے خان بابا کب مانیں گے"

"اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ چاہیں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے"

"ہوں"

"ماں، تم بہت اچھی ہو۔ بلند خیالات رکھتی ہو۔ دولت کو درمیان میں لا کر بات نہ کرو۔ میری پسند دیکھو، میرا انتخاب دیکھو"

"وہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟"

"یہ جاننے پرکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ خاندان جانا پہچانا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کیا۔ میں نے تو صرف لڑکی کو دیکھا ہے ــــ"

"کہاں دیکھا ہے؟"

"کہاں؟" وہ ہنس کر بولا ــــ "ماں اسے بچپن سے دیکھتا چلا آیا ہوں۔ اب وہ بھی بڑی ہو گئی ہے۔ یقین مانو ماں، میں نے ایسی لڑکی گاؤں میں دیکھی ہے نہ شہر میں۔ وہ بہت حسین ہے۔ اس کی رنگت سنہری ہے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے ٹوٹتے ہیں۔ اس کے بالوں میں رات اُترتی ہے۔ وہ چلتی ہے تو زمین میں سے گھنگروؤں کی دھمک...."

"ہٹ" ماں نے اس کا بازو گردن سے نکالتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"کیوں ماں"

"شہر میں پڑھائی کر کے تُو بہت تیز ہو گیا ہے۔"

"نہیں ماں۔ تیز ہوتا تو وہیں سے کوئی شوخ و شنگ لڑکی پکڑ لاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے اپنے گاؤں کی سیدھی سادی، بھولی بھالی لڑکی پسند ہے!"

"سیدھی سادی، بھولی بھالی!"

"ہاں ماں ——"

"وہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے یا جاہل اَن پڑھ۔"

"پتہ نہیں۔ بچپن میں گاؤں کے اسکول میں جاتی تھی۔ اب میں نہیں جانتا کہ اس نے کچھ پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ دو چار جماعتیں شاید پڑھی ہوں۔"

"تو اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور اُسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک پھول ہے۔ جس کی مہک اور خوشبو مسحور کُن ہے۔"

"بتائے گا نہیں وہ ہے کون۔"

"اتنا کچھ بتا دیا۔ پھر بھی پوچھتی ہو وہ ہے کون ——"

"میں کیسے جانوں۔ گاؤں میں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی موجود ہے۔ تو کس کی بات کر رہا ہے؟"

"میرے دوست دلنواز اور شہباز ہیں نا ماں۔"

"اچھا۔ اُن کی بہن ——"

"گل اندامے ——"

ماں چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئی۔ رحمت خاں نے ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹتے ہوئے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔

"ماں —— چپ کیوں ہو گئی ہو —— گل اندامے کو دیکھو تو ششدر ہو جاؤ۔"

"میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔"

"اچھا ——" وہ سر قدرے اونچا کرتے ہوئے تجسس سے بولا۔

"ہاں۔" ماں سنجیدہ تھی۔

"تو ماں۔ وہ واقعی میرے بیان کے مطابق ہے نا۔ بہت حسین، بہت خوبصورت۔"

"شاید وہ تمہارے بیان سے بھی بڑھ کر ہے ——"

"اوہ ماں ——" رحمت نے لیٹے لیٹے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ماں کا سر جھکا لیا۔ ماں نے شفقت سے اُس کی پیشانی چوم لی۔ رحمت خاں نہال ہو گیا۔

"خان بابا سے بات کر دو گی نا۔" وہ سرشار لہجے میں بولا۔

"کر دوں گی۔ لیکن ......"

"لیکن کیا ——"

"وہ شاید رضامند نہ ہوں۔"

"کیوں نہ ہوں ماں —— کہہ دینا میں نے شادی کی تو صرف گل اندامے سے کروں گا۔"

"ہوں۔"

"اور اگر بابا نہیں مانے۔ تو یہ گھر بار چھوڑ کر تم سب سے دور چلا جاؤں گا۔"

"نہیں میرے بچے۔" ماں نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر پھر اُس کی پیشانی چوم لی۔

"پھر —— ماں! بابا کو تم نے راضی کرنا ہے۔ مجھے اپنے پاس رکھنا ہے تو بابا کو رضامند کرنا ہو گا۔ گل اندامے صرف غریب ہے اس میں اور کوئی عیب نہیں ——"

"ہے۔" ماں بولی۔

"کیا؟" وہ اچھل کر اُٹھ بیٹھا۔ انگلیوں سے جلدی جلدی اُلجھے بال درست کرتے

ہوئے ماں کا منہ تکنے لگا۔

"اس کا باپ اور دو ماموں قتل ہو گئے تھے۔ اُن کی ملکوں کے ساتھ دشمنی ہے۔"

رحمت خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا ـــ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ماں ـــ یہ دوستی دشمنی تو ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔"

"ہے تو ـــ"

"پھر ـــ"

"تمہاری شادی وہاں کر کے خود کو ملکوں کے نشانے کی زد میں لانے کے برابر ہے۔"

"چھوڑو ماں ـــ میں جس باپ کا بیٹا ہوں۔ جس خاندان کا فرد ہوں ملک آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے ماں ـــ میں بھی بزدل نہیں ہوں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ مجھ میں بہادری اور جرأت کا فقدان ہے۔"

"ایسی بات نہیں میرے بچے ـــ"

"تو پھر ـــ"

"تمہارے باپ کو شاید غریبی پر اعتراض نہ ہو۔ لیکن یہ دشمنی۔"

"بابا کا سہارا شہباز اور دلنواز کو تحفظ دیئے ہوئے ہے ماں ـــ ورنہ اب تک کئی قتل اور ہو چکے ہوتے ـــ بابا نے شہباز اور دلنواز کو بھی بدلہ لینے سے باز رکھا ہوا ہے ـــ انھوں نے دونوں خاندانوں کی عداوت کو ختم کرا دینے کی مثبت کوشش کی ہے۔"

"ہوں۔"

"ماں ـــ میری اچھی ماں ـــ"

"اچھا، کوشش کروں گی۔"

"صرف کوشش نہیں ـــ گل اندامے کو بہو بنا کر اس حویلی میں لاؤ گی ماں ـــ ورنہ ـــ"

ماں نے اپنا ہاتھ رحمت خاں کے منہ پہ رکھ دیا۔ رحمت خاں نے اس ہاتھ پر پُر عقیدت سے بوسہ دیا اور بولا ـــ "میری زندگی اور زندگی کی خوشیاں اس ہاتھ میں ہیں۔ وعدہ کرو ماں۔ مجھے مایوس نہیں کرو گی۔"

ماں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ رحمت خاں نے خوش ہو کر ماں کی آغوش میں منہ چھپا لیا۔

گل اندامے اپنے چھوٹے بھائی بہادرے کے ساتھ خراماں خراماں محشر بداماں چلی جا رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ بھینس اور دو تین بکریاں آگے تھیں۔ کہیں گھاس پھونس نظر آ جاتا تو بھینس منہ مارنے لگتی۔ بکریاں بھی چرنے لگتیں۔ گل اندامے بھینس کے لاٹھی مارتی، اُسے ہنکارتی آگے بڑھنے لگتی۔

"گل بی بی" بہادرا بولا۔

"کیا ہے؟"

"یہیں رُک جاتے ہیں۔ چر لیں بکریاں اور بھینس بھی کھا لے گھاس۔"

"نہیں۔ ہم نے اس چٹان تک جانا ہے۔"

"کیوں، وہاں کیا ہے ـــ؟"

"وہاں ـــ وہاں ـــ وہاں بہت کچھ ہے بہادرے۔" گل اندامے کی آنکھوں میں خوشی کے رنگ پھیل گئے۔ مسکراتے ہوئے بہادرے کو دیکھا اور پھر اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی "تھک گیا ہے کیا۔ چل بھینس کے اوپر بیٹھ جا۔"

"میں کب تھکا ہوں۔"

"تو پھر یہاں رُکنے کا کیوں کہہ رہے ہو؟"

"یہاں گھاس جو ہے۔"

"وہاں بھی ہے۔"

"چلو ___ پھر ___"

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے ___ سات آٹھ سالہ بہادرا کیا جانتا تھا کہ کونسی کشش گل اندامے کو وہاں لے جا رہی ہے۔

وہاں چٹان کے پیچھے حیدر خاں کو اس سے ملنے آنا تھا۔ اس رات کے بعد حیدر خاں اور گل اندامے مل نہیں پائے تھے۔ گل اندامے کو کھیتوں پر آتے جاتے دور ہی سے دیکھ سکا تھا حیدر خاں ___ دل قربت کے لیے مچلتا تھا، لیکن کھیتوں میں لوگ ہوتے تھے۔ گل اندامے بھی حیدر خاں کو دور ہی سے دیکھ سکی تھی۔ وہ تو ایک دوسرے سے اشارے کنائے سے بھی بات نہ کر سکے تھے۔

کل حیدر خاں نے اپنی بہن زرینے کو گل اندامے کے گھر بہانے سے بھیجا تھا۔ اور اس چٹان کے پیچھے ملنے کا گول مول سا پیغام بھجوایا تھا۔ زرینہ شاید اس پیغام کو سمجھی نہیں تھی۔ جو بھائی نے کہا تھا کہہ دیا تھا ___ گل اندامے سمجھ گئی تھی۔

آج وہ بہادرے کو ساتھ لے کر ادھر چلی آئی تھی۔ اکثر بکریاں چرانے یا بھینس کو پانی پلانے وہ ہی لے جایا کرتی تھی۔

ماں نے گھر سے نکلتے تاکید کی تھی ___ "ویرانے کی طرف نہ جانا گُل ___ اور دیر بھی نہ لگانا۔ جتنی دیر تو باہر جاتی ہے۔ میری سانس اٹکی رہتی ہے۔"

"کیوں ماں۔ میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں اب؟"

ماں چپ ہو گئی تھی۔ کیا بتاتی کہ بچی کے لیے تو اتنا خطرہ نہیں تھا۔ اب جوان ہو گئی ہے اسی لیے فکر کرتی ہوں ___ کہ کوئی بات نہ نکلے کوئی بات نہ بنے۔"

"فکر نہ کیا کر ماں۔ میرے ساتھ بہادرا بھی ہے ___ اور یہ لاٹھی بھی۔"

"اللہ تیرا نگہبان ہو۔"

"آمین ___"

گل اندامے مسکراتی اٹھلاتی، لاٹھی گھماتے، گھر سے بھینس کو ہانکتی نکلی تھی۔ بہادرا چھوٹی سی چھڑی لے کر بکریوں کو ہانک رہا تھا۔

دونوں بہن بھائی ادھر آ گئے تھے جہاں دریا کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹا بہہ رہا تھا۔ گول گول چھوٹے بڑے پتھر دریا کے اندر اور باہر صاف شفاف پانی میں چمک رہے تھے۔ اونچا نیچا کنارہ پتھریلا تھا۔ دور دور تک ریت اور گول پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں بن پتوں کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں سرکنڈے تھے۔ اور کہیں کہیں سبزہ بھی نظر آتا تھا۔

گل اندامے کچھ فاصلے پر تھی کہ حیدر خاں نے اسے آتے دیکھ لیا۔ وہ بھی اپنی بھینس کو پانی پلانے آیا تھا۔ ملنے کا بہانہ بھی تو چاہیے تھا۔

"ادھر کوئی ہے گل بی بی۔" بہادرے نے حیدر خاں کی چادر لہراتی دیکھی۔

"ہاں۔ شاید کوئی ہے ___" گل اندامے کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"پھر ادھر نہیں جاتے۔"

"کیوں؟"

"ادھر ہی ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھینس پانی پینے جا رہی ہے۔"

"تم ادھر ہی ٹھہرو۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟"

"کہیں نہیں۔ دیکھتی ہوں، اُدھر کون ہے۔"

"کوئی تو ہوگا۔"

"ہاں"

گل اندامے تیز تیز قدم اٹھاتی اس چھوٹی سی چٹان کی طرف بڑھی۔ حیدر خاں چشم براہ تھا۔

"گل اندامے" حیدر خاں شوقِ دید سے بے حال سا ہو رہا تھا۔

"حیدر خانا ــــ" گل اندامے سر کے پیچھے سرکتی چادر کا پلو پکڑتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

"یقین نہیں آتا۔ کہ تمہیں دیکھ رہا ہوں"

"تم نے بلایا۔ میں آگئی"

"نہ آتیں تو جانتی ہو، میرا کیا حال ہوتا"

وہ مسکرا کر سر نفی میں ہلانے لگی۔ حیدر خاں دلِ مضطر کو تھام کر اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"حیدر خاں، میں چلوں اب ــــ"

"کیا ــــ؟"

"واپس جانا ہے ــــ"

"ابھی تو آئی ہو"

"زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی"

"کیوں؟"

"بہادرا ساتھ آیا ہے"

"تو کیا ہوا ــــ"

"ہمیں اکٹھے دیکھ لیا تو ــــ"

"تو کیا ہوا ــــ"

"بچہ ہے نا۔ گھر جا کے کہہ دیا تو ــــ میں چلتی ہوں حیدر خاں۔ مجھے ڈر لگتا ہے"

حیدر خاں نے اُس کے سراپا پر پیار بھری نگاہ ڈالی اور بولا ــــ "یوں چھپ چھپ کر ملنا مجھے بھی ٹھیک نہیں لگتا گل اندامے ــــ لیکن کیا کروں کھُل کر ہم مل نہیں سکتے ــــ ہمارے تمہارے گھرانے میں کوئی خاص میل ملاپ بھی تو نہیں ہے، جو اسی بہانے بندہ آجا سکے"

گل اندامے ادائے ناز سے اسے دیکھتے ہوئے شرمیلے لہجے میں بولی "تو کر لونا میل ملاپ"

"وہ تو ہوگا ہی ــــ میں صرف اپنی بڑی بہن ریشمینے کے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ کل یا پرسوں وہ صوابی سے آ رہی ہے۔ میں آتے ہی ماں کے ساتھ اسے تمہارے ہاں بھیجوں گا"

گل اندامے نے اپنی حسین سیاہ آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرا لی۔ اس کے یاقوتی لب متبسم تھے۔ حیدر خاں بڑے پیار، بڑے شوق سے اُسے تکتا رہا۔

چند لمحے گزر گئے۔ نگاہِ شوق کی سیری تو نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی سیراب ہو گئی تھی گل اندامے نے نگاہ اُٹھائی۔ حیدر خاں کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا ــــ "میں چلتی ہوں ــــ حیدر ــــ"

"اچھا ــــ"

"تم واپس کب جا رہے ہو؟" وہ مڑتے ہوئے بولی۔

"ریشمینے کو تمہارے گھر بھیج کر میں چلا جاؤں گا"

"گل اندامے شریر انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "ہمارے گھر والوں کا جواب سنے بغیر چلے جاؤ گے"

"جواب کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں" وہ مستحکم لہجے میں بولا "یہ تو ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ ریشمینے مجھے خط لکھ کر مطلع کر دے گی ــــ"

" اتنا یقین ہے؟" گل اندامے شوخی سے اٹھلائی۔

" ہاں ـــ" وہ ٹھوس چٹانوں کی طرح سینہ تان کر۔۔۔ پتھریلے لہجے میں بولا ـــ" تم میری ہو گل اندامے ـــ تمہیں حاصل کرنا تو کیا کوئی تمہاری طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

وہ اور شوخ ہو کر بولی" اتنا اعتماد ہے کہ میں تمہاری ہوں ـــ"

" ہاں یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے۔"

" اگر نہ ہوا تو ـــ"

" ناممکن ـــ تقدیر میرے فیصلے کی پابند ہو گی گل اندامے۔ تم میری ہو۔"

" ہاں، حیدر خاں ـــ زندگی کے آخری سانسوں تک ـــ"

" پھر ہمیں کون جدا کر سکتا ہے گل اندامے ـــ" حیدر خاں نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ لیکن گل اندامے کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی بہادرے نے آواز دی۔

" گل بی بی ـــ"

" آئی ـــ" وہ جلدی سے مڑی۔

" خدا حافظ گل اندامے۔"

" خدا حافظ۔"

بہادرا آگے بڑھ آیا۔ اُس نے حیدر خان کو دیکھا۔ حیدر خاں کو کھیتوں پر آتے جاتے اُس نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔

" آؤ بہادرے۔" حیدر خاں نے پیار سے اُسے پکارا۔

بہادرے نے اسے سلام کیا ـــ پھر بولا۔" ادھر تم تھے لالہ ـــ"

" ہاں ـــ"

" گل بی بی ادھر کیا کر رہی تھی ـــ میں نے ادھر سے بہت آوازیں دیں۔"

" ہم نے سنی نہیں ـــ"

گل اندامے تیز تیز قدم اٹھاتی بھینس کی طرف چلی جا رہی تھی ـــ بہادرا حیدر خاں سے باتیں کرنے لگا۔ گل اندامے نے مڑ کر اُسے دیکھا اور وہیں سے آواز دی۔

" بہادرے جلدی سے آؤ ـــ گھر واپس جانا ہے ـــ ماں نے کہا تھا دیر نہ لگانا۔"

" آیا گل بی بی ـــ خود تو لالہ خان سے اتنی دیر باتیں کی ہیں۔ مجھے دو منٹ بھی رُکنے نہیں دیتیں۔"

حیدر خاں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اور وہ اُچھلتا کودتا بہن کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچا تو گل اندامے نے اُس کا کان پکڑ کر مروڑتے ہوئے کہا" کیا کہہ رہا تھا تو۔ کب باتیں کی ہیں میں نے حیدر خاں سے ـــ خبردار جو کسی سے کہا ـــ میں تو صرف ادھر دیکھنے گئی تھی کہ کون ہے ادھر ـــ"

" اتنی دیر چپ ہی کھڑی رہی تھیں تم ـــ"

" ہاں ـــ"

" اچھا۔"

" ہاں ـــ"

گل اندامے بہادرے سے ڈر رہی تھی۔ کہیں اُس نے جا کر کہہ دیا تو ـــ

دھوپ بے حد نکھری ہوئی تھی۔

صحن میں چارپائیوں پر ماں کے ساتھ زرشینے بیٹھی تھی۔ وہ آج ہی اپنے گاؤں سے حیدر خاں کے بلانے پر آئی تھی، اُس کے دونوں بچے زرمینہ کے ساتھ مٹی کے

فرش پر کھیل رہے تھے۔ مالٹے کو گیند بنایا ہوا تھا۔ جسے کبھی پاؤں سے ٹھوکر مار کر
کبھی ہوا میں اچھالتے۔ زرمینہ اُن کے ساتھ بچوں ہی کی طرح کھیل رہی تھی۔
ریشمینے، نجف خاں سے بیاہی ہوئی تھی۔ جس کا لکڑی کا ٹال تھا۔ اچھا آسودہ
حال تھا۔ ریشمینے اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ سبزی مائل نیلی بڑی بڑی آنکھوں
اور سرخ و سپید رنگت والی ریشمینے نے سبز چھینٹ کا گھیر دار کرتا پہن رکھا تھا جس
کے سُرخ پھولدار بارڈر پہ بانکڑی ٹنکی تھی۔ سینے پر چاندی کے سکے ٹنکے تھے۔ کرتے
کی چوڑی چوڑی آستینوں کے بارڈر الٹا رکھے تھے اور اس کی کلائیوں میں پڑی
چاندی کی چوڑیاں اور موٹے موٹے کڑے چھن چھن کر رہے تھے۔ کانوں میں چاندی کے
بڑے بڑے بالے ہلکورے لے رہے تھے۔ ماتھے پہ بال کٹے تھے اور سر نفاست
سے گُندھا تھا۔ مینڈھیاں کندھوں پر پڑی تھیں۔ کچھ آگے کو جھول رہی تھیں۔ تنگ
پائنچوں والی گھیر دار شلوار۔ لال چھینٹ کی تھی اور سر پہ پیچھے کو ڈالی ہوئی چادر لال رنگ
کی سبز اور نیلے پھولوں والوں تھی۔ یہ نیا جوڑا نجف خان نے اس عید پر بنوا کر دیا تھا۔
ماں بیٹی کو دیکھ کر پھولی نہ سما رہی تھی۔ وہ موٹے سے لال نگ والی سونے کی انگوٹھی
ماں کو دکھا رہی تھی جو اس نے چاندی کے گھونگھریوں والے چھلوں کے ساتھ دائیں
ہاتھ کی انگلی میں پہن رکھی تھی۔ ریشمینے نے اپنی خوبصورت آنکھوں میں لال کلنجار ڈالا
ہوا تھا۔ اور اُس کے ماتھے گالوں اور ٹھوڑی پر سبز سبز تتولے گُدے ہوئے تھے۔
ماں بیٹی باتیں کر رہی تھیں کہ حیدر خاں باہر سے آ گیا۔
"خیر سے۔ خیر سے۔ اُس نے ریشمینے کو دیکھتے ہی خالص پختون انداز میں بہن کو
خوش آمدید کہا۔
ریشمینے، بھائی کو دیکھ کر چارپائی سے اُٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ دونوں بڑی
گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر حیدر خاں نے ریشمینے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ریشمینے

نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس کا سر چوم لیا۔
حال احوال پوچھتے ہی حیدر خاں بچوں کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں بچے کچھ جھجکے۔
پھر دوڑ کر اُس سے چمٹ گئے۔
"خان ماما ـــــ خان ماما ـــــ"
"کیسے ہو ـــــ" جھکتے ہوئے حیدر خاں نے دونوں بچوں کو لپٹا کر انہیں پیار کیا۔
"بہت شیطان ہو گئے ہیں لالہ" زرمینے قریب آ کر بولی"
"شیطان کی خالہ۔ حیدر خاں نے ہنس کر بہن سے کہا۔ ـــ" کوئی خاطر تواضع
کی ہے ان کی"
"تم آ گئے ہو کر دو نا خاطر تواضع ـــــ"
"ٹھیک ہے۔ بچو، میں تمہیں ڈھیر ساری چیزیں لے کر دوں گا بازار سے"
"پیسے ہیں" بچے بولے۔
"بہت" اور حیدر خاں نے جیب سے نوٹ نکالتے ہوئے بچوں کو دکھائے
بچے جھپٹنے لگے۔ ماں نے انہیں ڈانٹا۔ پھر حیدر خاں سے بولی" ادھر آؤ۔ میرے
پاس بیٹھو ـــــ خاص طور سے بلایا ہے۔ خیر تو ہے ـــــ"
"خیر ہی خیر ہے" حیدر خاں ہنسا۔ پھر بچوں کو چمکارتے ہوئے بہن کی طرف آیا۔
"بیٹھو" ریشمینے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے حیدر خاں سے بولی۔ گاؤ تکیہ اُٹھا کر اس
کی طرف بڑھایا۔
حیدر خاں نے کندھے سے گرم چادر اُتار کر چارپائی کے سرہانے رکھی۔ پھر
مسکراتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"میں کل واپس جا رہا تھا۔ سوچا آج تم سے مل لوں گا ـــــ" وہ کہنی گاؤ
تکیے میں ٹکاتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

” یہ بات ہے “

” ہاں “

” تو ملنے خود ہی چلے آتے “

” تمہارے خاوند سے ڈر لگتا ہے “

” چل شریر کہیں کا، تجھے نجف یاد بھی کر رہا تھا “

” ماں نے بتایا تو ہو گا کہ میں نے تمہیں کیوں زحمت دی ہے۔ آنے کی “ بہنوئی کی احوال پرسی کرنے کے بعد حیدر خاں نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے ریشمینے سے کہا

” ہاں، کچھ بتا رہی تھی، تیری شادی کے سلسلے میں ـــــ شادی کرنے کا ارادہ ہے “

” بالکل “

” پیسہ جمع کر لیا “

” خدا کا فضل ہے، پیسہ بہت ہے “

” کتنا؟ “

” جتنا درکار ہوگا، اُس سے زیادہ اکٹھا کر لوں گا “

” اچھی بات ہے، ماں نے لڑکی دیکھ لی ہے “

ماں مسکرا بولی ” لڑکی اُس نے خود ہی پسند کر لی ہے “

” واحیدر خانا ـــ “ ریشمینے کچھ حیرت اور کچھ خوشی سے ملتی جلتی آوازیں نکالتے ہوئے بولی ” کون ہے وہ؟ “

” گل اندامہ “ حیدر مستی چھلکتی نگاہوں سے بہن کو دیکھتے ہوئے بولا۔

” کون ـــ؟ “ ریشمینے بولی۔

” گل اندامہ “ ماں نے جلدی سے کہا ” بی بی جان کو جانتی ہو نا ـــ “

” ہاں ـــ پچھلی کنڈی میں رہتی ہے نا “

” ہاں پچھلے محلے میں “ ماں بولی ” اس کی بہن کی نند کی بیٹی ہے۔ دلنواز خان کی چھوٹی بہن “

” لوگ کیسے ہیں ماں؟ “

” اچھے ہیں “

” اور لڑکی ـــ دیکھی ہے تم نے “

” بہت خوبصورت ہے۔ بڑی میٹھی ہے “ وہ اپنے خالص پٹھانی انداز میں اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہوئے بولی ” محلے میں آتے جاتے کئی دفعہ ملی ہے۔ بڑی تعظیم اور ادب سے سلام کرتی ہے ـــ “

” تو تمہیں بھی پسند ہے ماں؟ “

” شکر ہے، بیٹے کا انتخاب میری پسند سے نہیں ٹکرایا “

” یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے “

ماں بیٹی باتیں کرتی رہیں۔ حیدر خاں سر تلے ہاتھ باندھے تکیے پر سر رکھے آسمان کی طرف تک رہا تھا۔ نیلے شفاف آسمان میں اسے اپنی محبت کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔

” حیدر خاں تو کل واپس جا رہا ہے “ ریشمینے باتیں کرتے ہوئے بولی۔

” ہاں “ حیدر خاں نے کروٹ اُس کی طرف بدلتے ہوئے کہا ” اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تم ماں بیٹی آج شام اُن کے ہاں چلی جاؤ ـــ “

” کل صبح جائیں گے “ ریشمینے بولی۔

” ٹھیک ہے ـــ “ حیدر خاں نے کہا۔

” رشتہ مانگنا ہے ابھی تو..... “ ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

"مانگنا نہیں لینا ہے ماں۔" حیدر بولا ___ ریشمینے اس کے انداز پر ہنس پڑی،
"کچھ زیادہ ہی سر چڑھ گیا ہے۔"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو میری شادی گل اندامے سے کروانی ہے تم نے۔"

"رشتہ تو لے جانے دو، کیا خبر، وہ رشتہ دیتے بھی ہیں یا نہیں۔"

"ناممکن۔" حیدر خان اُٹھ بیٹھا۔ چارپائی کی پٹی پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "یہ رشتہ ہر حال میں لینا ہے، گل اندامے کی ابھی کہیں ڈھنگ سے بات نہیں چلی، اور ہاں ___ اگر وہ بدلے کا رشتہ کرنے کے خواہشمند ہوئے تو بھی انکار نہ کرنا۔ اُس کے دو بڑے بھائی ہیں۔ دونوں ہی شریف ہیں ___ اور خان حشمت خان کے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔"

"ہوں۔" ماں نے سر ہلایا۔ پھر ماں چائے بنانے چلی گئی۔ ریشمینے حیران حیران نظروں سے بھائی کو تک رہی تھی۔ اُسے اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ کہ بھائی اس لڑکی کی محبت میں دیوانہ ہے۔ خوش بھی تھی۔ لیکن فکرمند بھی ___ ہولے سے بولی۔

"رشتہ لے جانا ہمارا کام ہے ___ تمہاری آمدنی ڈیڑھ دو ہزار سے کم نہیں، پھر وہ لوگ بھی کوئی امیر تو نہیں، رشتہ ملنے کا یقین ہے۔ لیکن فرض کیا انھوں نے انکار کیا ___"

"میں یہ لفظ سننے کی حد تک بھی گوارا نہیں کروں گا ___ گل اندامے کی طرف کوئی نظر بھی اٹھی تو میں وہ آنکھ ہی پھوڑ دوں گا۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا۔ اس کی خاطر دنگا فساد بھی کر سکتے ہو۔"

"ہاں ریشمینے۔ میں اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں ___"

"حیدر خاں ___"

"میری بات سن رہی ہو نا ___ میں اس لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے وہ تمہارے ٹھیکرے کی منگ ہے۔"

"منگ نہیں ___ وہ میری ہے، صرف میری۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"وہ تمہاری ہے تو کیا تم بھی اُس کے ہو ___ وہ میرا مطلب ہے، وہ بھی یہی چاہتی ہے۔"

"ہاں۔ بالکل سو فیصد ___"

"تم ملتے رہتے ہو۔"

"چند بار ملے ہیں۔"

"اور اتنے مستحکم فیصلے کر لیے۔"

"یہ فیصلے تو برسوں پہلے ہو گئے تھے ___ اب تو اسے بیاہ کر لانا ہے، ریت رواج کے مطابق ___ اسی لیے تو تمہیں آج بلایا ہے۔ یہ سب کچھ تم ہی طے کرو گی، ماں تو بہت سادہ ہے ___ اور ہاں ریشمینے۔ گل اندامہ کا کوئی مول نہیں، اگر وہ لوگ پیسے کی بات کریں تو بلا جھجک جتنا مانگیں منظور کر لینا۔ میں سارا بندوبست کر لوں گا۔"

"بہت اچھا۔"

"کل میں چلا جاؤں گا۔ تم ساری باتیں مجھے خط میں لکھ دینا۔ اتنا تو لکھ پڑھ لیتی ہو نا ___"

"سب کچھ کر لوں گی۔"

دونوں بہن بھائی چائے آنے تک باتیں کرتے رہے۔ ماں نیلی تام چینی کی چینک میں چائے اور پیالیاں ٹین کی ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ بچوں کے لیے کیک رس بھی ایک پلیٹ میں رکھے تھے۔

باتیں کرتے ہوئے سب چائے پینے لگے۔ بچوں نے ایک ہی ہلے میں پلیٹ

چٹ کر ڈالی۔ ریشمینے نے بدتمیزی پر انھیں ڈانٹنا چاہا، لیکن ماں اور بھائی اُلٹا اُسے ڈانٹنے لگے۔ بچوں کی شوخی سے وہ محظوظ ہو رہے تھے۔

گل اندامے جوار کی روٹی اور ساگ کا پیالہ پھولدار میلے اور پُرانے دسترخوان میں باندھ کر بھائیوں کو دینے کھیتوں پر گئی تھی۔ بہادر ابھی ساتھ تھا ـــــ وہ اپنی بکری کا بچہ اُٹھا کر ساتھ لے گیا تھا۔

ماں ٹٹول کر برتن دھو رہی تھی۔ مٹی کی لگن میں سلور اور تام چینی کی پلیٹیں رکھی تھیں۔ قریب ہی ٹین پانی سے بھرا پڑا تھا۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر برتن اُٹھا رہی تھی۔ اُسے نظر کم آتا تھا۔ موتیا اُترا ہوا تھا۔ کئی دفعہ آنکھیں بنوانے کی بات ہوئی تھی لیکن شہر جا کر آنکھوں کا آپریشن کروانا آسان نہیں تھا۔ پیسوں کی ضرورت تھی۔ جو اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ برتن مانجھتے ہوئے حیدر خاں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ رشتہ معقول تھا۔ گھر بار اچھا تھا۔ لڑکا کماؤ تھا۔ خاصا بڑا مکان تھا۔ جس کا ایک کمرہ پچھلے سال ہی حیدر خان نے پکّی اینٹوں کا بنوایا تھا۔ پھر ریشمینے اور اس کی ماں نے رشتہ لینے کے لیے جس چاہت کا اظہار کیا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ اہمیت کی حامل تھی۔ ان لوگوں نے تو اصرار کیا تھا کہ فوراً ہی ہاں کر دی جائے لیکن گل اندامے کی ماں نے چند دن کی مہلت مانگی تھی۔ بچّوں سے صلاح مشورہ کرنا تھا۔ دلنواز اور شہباز بھی سن کر خوش ہوئے تھے۔ حیدر خاں سے مراسم زیادہ تو نہیں تھے۔ لیکن ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ جب سے حیدر خاں شہر سے پیسہ کما کر لانے لگا تھا دلنواز اکثر اُس سے ملتا تھا ـــــ تو پوچھتا تھا۔

"شہر جا کر گاؤں یاد تو آتا ہوگا۔ ویسے پیسے اچھے ملتے ہیں۔ سوچتا ہوں میں بھی ڈرائیوری سیکھ لوں۔ تم تو کراچی تک مال لے کر جاتے ہونا؟"

سرراہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ دلنواز حیدر خاں کی حالت بدلتے دیکھ کر خود بھی پشاور جا کر ڈرائیوری سیکھنے کے متعلق کئی بار سوچ چکا تھا۔

ماں نے اس رشتے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ریشمینے سے سوچنے کی مہلت لی تھی۔ لیکن ان کا منہ بھی میٹھا کرا دیا تھا۔ منہ میٹھا کرانا رضامندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ماں بیٹی خوش خوش واپس آئی تھیں۔ ریشمینے نے گھر آتے ہی حیدر خاں کو خط لکھ دیا تھا اور ساری باتیں لکھ دی تھیں۔ اگلے خط میں ہاں کی خوشخبری لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

گل اندامے کی ماں برتن دھو دھو کر ٹین کے چھاننے میں رکھ رہی تھی کہ دروازہ زور سے کھٹکا۔

"کون ہے؟" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"میں ہوں ماں ـــــ دروازہ کھولو۔ دلنواز کی آواز تھی۔ وہ جیسے بہت جلدی میں تھا۔

"آئی" ماں اُٹھتے ہوئے بولی۔

"جلدی کھولو ماں۔ جلدی کھولو ـــــ" وہ تیز آواز میں بولا۔

"کیا ہوا ـــــ دلنوازے۔ آ رہی ہوں ـــــ" ماں میلی چادر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے دروازہ کھولنے بڑھی۔

"اوہ ماں ـــــ کھول بھی دو ـــــ" وہ دستک دیتے ہوئے جلدی سے بولا۔ لگتا تھا، چند لمحے اور دروازہ نہ کھلا تو توڑ ہی ڈالے گا۔ ماں نے دروازہ کھولا۔ تو دلنواز نے لپک کر ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے دو تین چکّر دے ڈالے۔

"ماں ـــــ مبارک ہو ماں" وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

"او بچّے! بات تو کر، ہوا کیا؟ کس بات کی مبارک باد دے رہے ہو" ماں نے

چکراتے ہوئے پوچھا۔

"ماں" دلنواز نے ماں کی گردن میں بانہیں حمائل کر دیئے، اور اُسے اپنے سہارے تقریباً گھسیٹتے ہوئے صحن کی طرف بڑھا۔

ماں نے گردن سے اُس کا مضبوط بازو نکالنا چاہا۔ "کچھ کہو بھی۔ کیا مل گیا ہے تمہیں۔ اتنے خوش کیوں ہو، میری ہڈی پسلی ہلا ڈالی ہے تم نے ——"

"یہاں بیٹھو ماں اور سنو" اُس نے ماں کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"سنو گی تو مجھ سے بھی زیادہ خوش ہوگی ماں۔ مجھ سے تو کام پر رُکا ہی نہیں گیا، بھاگا ہوا چلا آیا، تمہیں خوش خبری سنانے۔"

"اب بتاؤ بھی —— تمہاری یہ بُری عادت کبھی نہیں جائے گی۔ خواہ مخواہ دوسروں کا حوصلہ آزماتے رہتے ہو۔"

دلنواز کھلکھلا کر ہنس دیا۔

ماں کو غصّہ آنے لگا۔ تو وہ بولا "نہ، نہ ماں۔ آج غصّہ نہیں کرنا۔ بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ مبارک ہو۔"

"خیر مبارک۔" ماں جھلا کر اُٹھنے لگی "ہٹو۔ مجھے کام کرنے دو۔ برتن دھو رہی تھی میں ——"

وہ مسکرا کر ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے بولا "ماں —— اپنی گل اندامے کا رشتہ مانگا ہے۔ میرا مطلب ہے مانگنے آئیں گے۔"

"کون؟ ——"

خان حشمت خاں، ماں۔ اس گاؤں کا مالک خان حشمت خان اپنے بیٹے رحمت خان کے لیے ہماری گل اندامے کا رشتہ لینے آئیں گے۔ ماں ہماری بہن کی خوش بختی میں اب کسے شک ہے۔ اوہ خدایا۔ تُو بڑا کرم کرنے والا ہے۔ ہم لوگ تو کبھی سوچ بھی

نہیں سکتے تھے ——"

"کیا کہہ رہا ہے دلنواز ——؟" ماں جیسے کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

"ماں —— کہہ رہا ہوں۔ اپنی گل اندامے خان حشمت خان کی بہو بننے والی ہے۔"

"کہاں سے سُن آیا؟"

"مجھے رحمت خان نے خود بتایا ہے۔ وہ لوگ شاید آج ہی اس سلسلے میں ہمارے گھر آئیں گے۔ ہماری بہن کے مقدّر جاگ اُٹھے، ماں۔ ہمارا سر فخر سے ہمیشہ اونچا رہے گا —— جانتی ہو حشمت خاں کتنا بڑا آدمی ہے۔ کتنی دولت ہے اُس کے پاس اور پھر رحمت خان گبرو جوان۔ پڑھا لکھا۔ شہر سے چودہ جماعتیں پاس کر کے آیا تھا ——"

وہ خوشی سے بہک بہک کر بولتا جا رہا تھا۔

اور ماں سوچوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

وہ اپنی ترنگ میں باتیں کرتے کرتے ماں کی طرف متوجّہ ہوا تو اسے خاموش پا کر جھٹ سے بولا "چُپ کیوں ہو گئی ہو ماں، اپنی غربت کا خیال آ رہا ہے۔ تُو فکر نہ کر —— اپنی گل اندامہ ——"

"لیکن دلنواز ——" ماں کچھ کہتے کہتے رُکی۔

"کیا؟ —— اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہوا ——" وہ دونوں ہاتھ بے تابی سے ملتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟ —— وہ چونک کر ماں کو دیکھنے لگا۔

"تُو نہیں جانتا کیا؟"

"کیا ماں؟"

"حیدر خاں کا رشتہ گل اندامے کے لیے آ......"

"او چھوڑو ماں، گولی مارو اس رشتے کو —— رحمت خان کے مقابلے میں اُس

کا کیا مقام۔ خاص پڑھا نہ لکھا۔ ٹرک ڈرائیوری کرتا ہے۔ اور۔ اور ــــ"

"لیکن ــــ"

"لیکن کیا ماں، گل اندامے ہماری بیٹی ہے، ہم اس کا مستقبل جس سے چاہیں وابستہ کریں۔ ہم اُس کی بھلائی کا سوچیں گے۔ رحمت خان جیسا رشتہ آیا ہے اس کے لیے۔ یہ تو ہمارے سارے خاندان کی خوش بختی ہے۔"

ماں چپ ہو گئی۔

دلنواز اپنی خوشی کا اظہار رحمت خان کی تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر کیے جا رہا تھا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے دلنوازے" ماں کا لہجہ متفکر تھا۔

"پھر ــــ"

"پھر یہ کہ میں ریشمینے اور اُس کی ماں کا منہ میٹھا کروا چکی ہوں۔ تو جانتا ہے، یہ رضامندی کی علامت ہوتا ہے۔ ہمارا رواج ہے۔ اگر رشتہ نامنظور ہو تو آنے والوں کی خاطر تواضع نہیں کی جاتی، خاص کر میٹھا تو اُن کے سامنے رکھا ہی نہیں جاتا۔ میں نے تو رشتے سے خوش ہو کر انہیں خاص طور سے میٹھا پیش کیا تھا۔"

"ان رسموں کو چھوڑو ماں۔ ہاں تو نہیں کی تھی نا تم نے ــــ"

"ہاں تو واقعی نہیں کی تھی۔"

"بس پھر کیا ہے۔ اور ماں ہاں کر بھی دی ہوتی نا ــــ تب بھی ہم رحمت خان کے حق میں یہ ہاں واپس کر لیتے۔"

"یہ اتنی آسان بات نہ ہوتی۔ جانتا ہے اپنے رسم و رواج کو۔"

"سب جانتا ہوں، جانے دے انھیں۔ اور اٹھ تیاری کر۔ گل اندامے روٹی دے کر آتی ہی ہوگی۔ گھر میں جھاڑو دے کر چارپائیوں پر کوئی چادریں وادریں ڈال

دے۔ اتنے بڑے لوگ غریب خانے کو رونق بخش رہے ہیں ماں۔ سوچ تو سہی ماں۔ اس شادی سے ہمارا مان کتنا بڑھ جائے گا ــــ ہماری بہن خان کی ہو بنے گی۔ گاؤں کی مالک ہوگی ــــ واہ ــــ کتنی شان سے شادی ہوگی ماں ــــ کتنی شان سے ــــ"

وہ جھوم جھوم گیا۔

لیکن ماں اُس کی طرح خوشی کا اظہار نہ کر سکی۔ تذبذب میں پڑ گئی۔

تھوڑی دیر بعد شہباز بھی آ گیا۔ اُس نے تو صحن میں آتے ہی چادر ہوا میں لہراتے ہوئے ناچنا شروع کر دیا۔ ماں دونوں بھائیوں کو اتنا خوش دیکھ کر مسکرانے لگی۔

گل اندامے نئی صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھی۔ اُس کے سپنے تو ان دنوں اپنے طور ہی حسین ہو گئے تھے۔ جب سے ریشمینے اور اُس کی ماں آئی تھی ــــ وہ خود کو حیدر خان کی منسوبہ سمجھنے لگی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہی خیالوں میں بسا تھا۔ ذہن میں سمایا، رُوح میں اُترا تھا، جذبوں پر چھایا تھا۔

وہ اٹھلاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی ــــ بہادر اپیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"گل اندامے" ماں نے برآمدے سے آواز دی۔

"ہاں، ماں"

"آ گئی ہو"

"ظاہر ہے"

"بات سنو"

"آ گئی ــ سناؤ ــــ"

"ذرا جھاڑو لو۔ اور کمرہ صاف کر ڈالو۔ چارپائیوں پر چادریں ڈال دو ــ اور چینی کی پیالیاں طاق سے اتار کر دھو کر رکھ دو۔"

گل اندامے مسکرائی ــــ اُس کے خیال میں یہ اہتمام مہمانوں کے لیے ہو رہا تھا اور مہمان ریشمینے اور اُس کی ماں ہی ہو سکتے تھے۔ جو اپنی درخواست کا جواب لینے آج آرہے تھے۔

"جلدی جلدی کر لے یہ کام۔"

"اچھا ماں۔ منٹوں میں کرتی ہوں ــــ تُو فکر نہ کر ــــ"

"تیرا بھائی جانے کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لینے گیا ہے۔"

"بہت خاطر کرو گی مہمانوں کی آج ــــ"

"ہم کیا خاطر کریں گے بیٹی۔ وہ اتنے بڑے لوگ۔ مجھے تو سمجھ نہیں آرہی کہ اس جھونپڑے میں ......"

گل اندامے اٹھلا کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی "چھوڑ ماں۔ اب وہ اتنے بڑے بھی نہیں ہیں، ہماری طرح ہی ہیں۔ ذرا وہ شہر چلا گیا ہے تو ....."

"گل اندامے۔ میں حیدر خان کی بات نہیں کر رہی۔"

"تو۔ تو کس کی بات کر رہی ہو ــــ؟"

"خان حشمت خان کی ــــ"

"وہ ــــ وہ آرہے ہیں ــــ ہمارے گھر ــــ یعنی ــــ اس گھر میں؟"

"ہاں ــــ"

"کس لیے؟ ــــ پہلے تو کبھی نہیں آئے ــــ"

"آج آرہے ہیں ــــ خان اور بی بی دونوں ــــ"

"ہائے اللہ ــــ ماں ــــ ہمارا یہ گھر اور ــــ وہ ــــ"

"قسمت مہربان ہو گئی ہے ــــ ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے۔"

"لیکن کرنے کیا آئیں گے ــــ گل لالہ کے ....؟"

"گل لالہ کے لیے نہیں۔ میری گل اندامہ کے لیے۔" ماں نے بیٹی کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر پیشانی چوم لی۔

گل اندامے کچھ نہیں سمجھی، ہاں لاشعوری طور پر ماں کے ہاتھوں سے چہرہ ایک جھٹکے سے چھڑا کر قدرے پرے بیٹھ گئی ــــ حیران حیران نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"وہ رحمت خان کے لیے تجھے مانگنے آرہے ہیں بیٹی ــــ شرما نہیں ــــ تیری قسمت کا ستارہ بہت درخشاں ہے ــــ تو بختاور ہے ــــ بیٹی یہ نصیبہ ــــ"

"ماں" ہاتھ نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے گل اندامے سہمی ہرنی کی طرح ماں کو تکتے ہوئے زور سے بولی۔

"بیٹی ــــ" ماں نے اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"ماں ــــ" گل اندامے کا جسم کانپنے لگا ــــ "وہ ــــ حیدر خان ....."

"اُن کا ذکر نہ کرو ــــ شکر ہے، ہم انہیں ہاں نہیں کر بیٹھے تھے۔"

"لیکن ــــ لیکن ماں ...."

"تُو فکر نہ کر ــــ چل جلدی سے گھر ٹھیک ٹھاک کر لے۔ اُن کو میں خود جواب دے لوں گی۔ کوئی بڑی بات نہیں۔"

گل اندامے کا دل ٹوٹ گیا ــــ آنکھوں میں نیلے پیلے دھبے ناچنے لگے۔ وہ بُھربُھری مٹی کی طرح ماں کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر بیٹھ گئی ــــ

"شرما گئی نا" ماں بولی "یقین نہیں آرہا نا تجھے بھی میری طرح، پر یہ بات حقیقت ہے گل اندامے ــــ خان نے پیغام بھیجا ہے۔ وہ اور خان بی بی باقاعدہ رشتہ لینے آج آرہے ہیں۔ اُن کے ساتھ .... ہمیش گل کاکا اور زری بی بھی آرہی ہیں ــــ اتنے بڑے بڑے لوگ آرہے ہیں ہمارے گھر۔ اُٹھ ــــ صفائی تو کر لے۔ اور تو کچھ

اپنے گھر میں ہے نہیں ——"

ماں کمرے کے اندر چلی گئی —— گل اندامے مٹی کے ڈھیر کی طرح وہیں بیٹھی رہی۔ اُس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے اندر ایک دم ہی ویرانی اتر آئی تھی۔ یوں لگتا تھا، ہنستا بستا سپنوں کا محل ایک دھماکے سے راکھ اور دُھول میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ زور زور سے چیخنا چاہتی تھی —— حیدر خاں، حیدر خان پکارنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر کوئی آواز نہ لہرا سکی۔ کوئی لفظ نہ تھر اسکا۔ خوف کی لہروں نے اُس کے جذبوں کو ساکت سا کر دیا۔ وہ کچھ بول نہ سکتی تھی۔ کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی مختار آپ کب تھی۔ اس کے سرپرست تو اس کی ماں اور بھائی تھے۔ اُس کی تقدیر پر مُہر لگانے کا حق اور صرف انھیں حق تھا —— اپنی اور حیدر کی محبت کا اشارتاً بھی اعتراف کرتی، تو بھائی کی غیرت جوش میں آجاتی۔ وہ اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر حیدر کا سر قلم کر دیتے۔ بہن کا گلا کاٹ دیتے ——

گل اندامے بے جان بُت کی طرح کئی لمحے بیٹھی رہی۔

پھر ماں کے پکارنے پر اُٹھی۔ اور پھر کسی سحر زدہ انسان کی طرح ماں جو کچھ کہتی رہی، اُس کی تعمیل کرتی رہی۔

خان حشمت اللہ خاں اپنی بیگم اور خاندان کے بزرگ ہمیش گل کاکا اور زر بی بی کے ساتھ اپنی جیپ میں دلنواز کے گھر آئے۔ تو کندی (محلے) کے لوگ حیرت زدہ سے انھیں دیکھنے لگے۔ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ سر جوڑ جوڑ کر قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

گل اندامے کو سب نے دیکھا۔ اس کے حسن جہانسوز سے متاثر ہوئے۔ بلاشبہ رحمت خان کا انتخاب لاجواب تھا۔ حشمت خان اور خان بی بی نے اس خاندان کی عزت افزائی فرمائی تھی —— انھوں نے باقاعدہ درخواست کی رشتے کے لیے دامن

پھیلایا۔

یہ سب تو رسمی کارروائیاں تھیں۔ خان کا چلے آنا ہی رشتے کی سند تھی۔ انکار کا تو سوال ہی نہ تھا۔ مہلت لینے کی بات بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

خان نے دامن پھیلایا۔ تو بڑے عجز کے ساتھ گل اندامے کی ماں نے بیٹی اس دامن میں ڈال دی۔

خان نے خوشی میں گل اندامے پر نوٹ نچھاور کیے —— اور جیب سے مٹھائی کے ٹکڑے نکلوا کر دلنواز کے حوالے کیے —— خان بی بی نے رحمت خان کے نام پر موٹے سے نگینے والی سونے کی انگوٹھی گل اندامے کے ہاتھ میں ڈال دی۔

مبارک سلامت کا شور اُٹھا۔

اس شور میں گل اندامے کے اندر کی چیخ و پکار دب کر رہ گئی۔

خان نے اگلے ماہ کی سات تاریخ رخصتی کے لیے مقرر کر دی۔

حیدر خان کو ٹرک لے کر کراچی جانا تھا۔ رات کو روانگی تھی۔ ٹرک لوڈ ہو چکا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اڈے کے ہوٹل کے باہر پڑی کرسیوں پر اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا۔ دیر کے علاقہ کا کرگل خان اس کا خاصا گہرا دوست تھا۔ اور پشاور کا رہنے والا صادق علی بھی اُس سے خاصا مانوس تھا —— سب قہوہ پی رہے تھے، سگریٹ سلگا رکھے تھے۔ کرگل خان جیب سے نسوار کی چھوٹی سی ڈبی نکال کر اُس کے ڈھکنے میں لگے آئینے میں اپنی مونچھوں کے کس بل نکال رہا تھا۔ دوسری کرسیوں پر بھی لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ چائے پی رہے تھے۔ اڈے کے احاطے میں ٹرک، ویگنیں اور بسیں کھڑی تھیں۔ کچھ آ چکی تھیں، کچھ جا رہی تھیں۔ خاصا شور شرابا مچا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر گانے چل رہے تھے۔ اونچی آواز میں چلنے والے گانے فضا کو شور سے بھر رہے تھے۔ ترنم اور نغمگی کا احساس نہیں

ہو رہا تھا۔

"آج تم کراچی جا رہے ہو؟" کرگل خان نے واسکٹ کی جیب میں نسوار کی ڈبیا رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" حیدر خان بولا۔

"رات کو سفر کرنا ہے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر سو لو" صادق نے کہا۔

"مجھے انتظار ہے" وہ بولا۔

"کس کا؟"

"خط کا"

"گاؤں سے؟"

"ہاں"

"ابھی تھوڑے دن تو ہوئے آیا تھا تمہارے گاؤں سے خط"

"ایک اور آنا ہے۔ آجکل میں آنا چاہیئے"

"کل آیا تو کیا فائدہ ——"

"اسی لیے تو انتظار میں بیٹھا ہوں"

"یار میں کراچی کے اڈے پر بھجوا دوں گا خط ——"

"کل آیا تو ایسا ہی کرنا ہوگا خان —— یہ خط بڑا ضروری ہے۔ خدا کرے آج ہی آجائے"

"کس کا ہے؟" —— صادق نے مذاق کیا۔

وہ سگریٹ کا کش لے کر دھواں اُس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کرسی میں نیم دراز ہو کر بولا "میری بہن کا"

"اوہ" صادق سنبھل گیا۔

"لیکن بہن کے خط میں اس کی بات لکھی ہوگی" وہ مخمور آنکھوں سے دوستوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کی؟" کرگل خان نے پوچھا۔

"ہاں اُس کی — جس کے ساتھ میری شادی کی بات چیت چل رہی ہے" حیدر خان مسحور و مخمور لہجے میں بولا۔

"اچھا اچھا —— اُس کی، جس کے خواب جاگتے میں بھی تمہاری آنکھوں میں اُترے رہتے ہیں"

"ہاں ——"

"خدا کرے، وہ جلد ہماری بھابی بن جائے"

"یہ خبر بہن کے اسی خط سے ملے گی کہ وہ کب تک تمہاری بھابی بن رہی ہے"

"حیدر خان" وہ صادق کی بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ زمان خان نے پچھلی طرف سے اُس کی طرف آتے ہوئے پکارا

"کیا ہے؟" —— اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر کرسی میں ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا۔

"تمہارا خط ہے" اُس نے وہیں سے خط دکھایا۔

"خط!" حیدر خان نے ایک جست لگائی۔ زمان خان کی طرف کرسیاں پھلانگتے ہوئے لپکا۔ اس کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا۔

"ارے —— ایسی بے تابی —— بیوی کا خط ہے ——" زمان خان نے ہنس کر کہا۔

حیدر خان نے لفافہ وفورِ شوق سے بے تاب ہوتے ہوئے کھولا —— زمان خان واپس چلا گیا —— صادق اور کرگل خان تجسس سے دور ہی سے اُسے تکنے لگے۔

لیکن ـــــ

اُن کی توقع کے مطابق حیدر خان نہ تو اُچھلا کُودا نا انھیں خوشخبری سناتے دوڑا، نہ ہی وہیں سے پُرجوش نعرہ مارا ـــــ وہ تو خط پڑھتے ہی لہرا سا گیا۔ پہلے لوہے کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ پھر گرنے کے انداز میں برابر پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ کئی لمحے گزر گئے۔

"کیا بات ہے حیدر؟ ـــــ کرگل نے وہیں سے پوچھا۔

"کوئی بُری خبر ہے شاید!" صادق نے کہا۔

"چلو پوچھتے ہیں اس سے۔"

دونوں اُٹھ کر اس کے پاس آئے۔ صادق سامنے آن کر کھڑا ہو گیا۔ کرگل کرسی کی پشت پکڑ کر اس پر جُھک گیا۔

حیدر خان کا رنگ بالکل بدل گیا تھا۔ ہونٹ تک پیلے پڑ گئے ـــــ بے جان سے جسم کو وہ شاید ہلا بھی نہ سکتا تھا۔

"کیا ہوا؟" دونوں دوستوں نے تشویش ظاہر کی۔ انھوں نے بار بار پوچھا۔

حیدر خان کی آنکھیں کرب و اذیت سے جیسے پھٹنے لگیں۔ اس نے گردن کرسی کی پشت پر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ کرگل نے اس کا کندھا ہلایا۔

کیا ہوا یار۔ بتاؤ تو سہی ـــــ"

"کوئی بُری خبر ہے؟"

"بہن کا خط ہے یا کسی اور کا ـــــ؟"

"بتاؤ تو سہی ـــــ"

دونوں اُس پر جُھک کر محبت سے پوچھنے لگے۔

"ناممکن ـــــ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا ـــــ" حیدر خان زور سے بولا۔

لگتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس ماحول سے دور جا چکا ہے۔ گرد و پیش کا اُسے قطعاً ہوش نہیں تھا۔

"حیدر خانا ـــــ" کرگل نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

"ہاں۔" حیدر خان نے حیران نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"کیا ہوا دوست ـــــ؟" کرگل نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھے رکھے پوچھا۔

"یہ کہو، کیا نہیں ہوا ـــــ میں لُٹ گیا کرگل۔ میں لُٹ گیا ـــــ" حیدر نے اس کے ہاتھ پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھوڑی اُن پر ٹکاتے ہوئے انتہائی بے بسی سے کہا۔

صادق اور کرگل اصل بات جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے۔

خط حیدر خان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔

صادق نے خط اٹھاتے ہوئے کہا: "میں پڑھ لوں؟"

"پڑھ لو یار ـــــ پڑھ لو ـــــ میری بدنصیبی کی داستان پڑھ لو ـــــ"

صادق نے مختصر سے خط پر نگاہیں دوڑائیں۔ پھر خط کرگل کی طرف بڑھاتے ہوئے، متفکرانہ حیدر کو دیکھنے لگا۔ اُسے تسلی دینے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ کوئی بات منہ سے نکل ہی نہ رہی تھی۔

کرگل بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں اُسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئے۔ تینوں نے چھوٹا سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔

حیدر خان کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے رات ٹرک لے جانے کی ڈیوٹی کرگل کے سپرد کر دی۔ اور خود گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔

"لیکن۔" صادق نے فکرمندی سے کہا "وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

"یہ میں نے سوچ لیا ہے۔"

"ہمیں نہیں بتاؤ گے؟"

"میں گل اندامے کا ہاتھ اُس کے بھائیوں سے مانگوں گا۔ انھوں نے انکار کیا
میری بندوق کی ساری گولیاں ان کے سینوں میں اُتر جائیں گی——"

صادق نے پریشان ہو کر اُسے دیکھا۔ کرگل بولا "ہوشمندی سے کام لو دوست
خون خرابے سے کیا فائدہ۔ اس طرح گل اندامے تمہیں مل تھوڑا جائے گی —— اور
جب کہ گاؤں کا سب سے بڑا خان اپنے بیٹے کی منگنی اس سے کر کے شادی کی تاریخ
بھی مقرر کر چکا ہے"۔

حیدر خان نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ صادق اور کرگل ہی باتیں کرتے
رہے۔ وہ حیدر خان کو اس طرح مشتعل گاؤں جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس
حالت میں جانے سے اُس کے ہاتھوں دو تین خون ہو جانا یقینی تھے۔

حیدر خان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ باتیں کرتے رہے۔ لیکن
اس کے سینے میں جو آگ بھڑک اُٹھی تھی وہ بجھنے والی کب تھی —— اُس کے ہاتھوں سے
گل اندامے ہی چھینی نہیں جا رہی تھی۔ اسے دھوکا بھی دیا گیا تھا۔ اس کی ماں اور بہن
کی بے عزتی بھی ہوئی تھی۔ منہ ان کا میٹھا کروایا گیا تھا اور ہاتھ خان رحمت خان کے
ہاتھ میں سونپا جا رہا تھا۔ ایک غیرت مند پٹھان کے لیے یہ باتیں ناقابل برداشت
تھیں۔ محبت لٹنے کے ساتھ وہ بے عزتی کا چرکہ نہیں کھا سکتا تھا۔

دونوں نے بہت سمجھایا۔ تو وہ سُرخ انگارا آنکھوں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے
غرّایا —— "گل اندامے کے بغیر میں جینے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا —— وہ میری ہے
جو ہاتھ اُس کی طرف بڑھے گا۔ میں وہ ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔ جو نگاہ اس پر پڑے گی وہ
آنکھ ......"

"تحمّل میرے یار تحمّل"۔ صادق نے اس کا کندھا تھپکا۔

"اس طرح قاتل بھی بنو گے اور گل اندامے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے"۔ کرگل

نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تو —— تو پھر میں کیا کروں میرے یار۔ تم ہی مشورہ دو۔ گل اندامے کی شادی
اس خان زادے سے کبھی نہیں ہونے دوں گا میں"۔

"یہ بات کی نا تم نے۔ اس شادی کو روک لو"۔

"کیسے؟ میرا دماغ تو کچھ کام ہی نہیں کر رہا"۔

حیدر کی بات کا جواب دینے کے بجائے کرگل نے الٹا اس سے سوال کیا "کیا
گل اندامے بھی تمہیں اسی شدت سے چاہتی ہے؟"

"ہاں —— مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ رحمت خان سے شادی کرنے
کے بجائے اپنے آپ کو ختم کر لینے کو بہتر جانے گی"۔

"ہوں ——" کرگل سوچنے لگا۔ کافی دیر سوچتا رہا —— پھر فیصلہ کن انداز میں
حیدر کو دیکھتے ہوئے بولا "تم ہمت کرو تو...."

"تو کیا"

"شادی ہونے ہی نہ دو ——"

"لیکن کیسے؟ ——" صادق نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔

"ایسے کہ ——" کرگل نے پُرجوش لہجے میں کہا "شادی سے پہلے ہی گل اندامے کو
اغوا کر کے یہاں لے آؤ —— آتے ہی نکاح کر لو بس ——"

حیدر خان نے چونک کر اُسے دیکھا —— اس کی جگہ صادق بولا "یہ اتنا ہی
آسان ہے کیا؟"

"ہم کس لیے ہیں —— اس کی مدد کر سکتے ہیں —— اس کے سوا اور کوئی
راہ نہیں —— خان سے براہِ راست ٹکر لینا بالکل غلط بات ہے۔ گل اندامے کے
بھائیوں کو قتل کر کے بھی مسئلہ حل نہیں ہو گا"۔

"لیکن اغوا کی صورت میں وہ لوگ انہیں معاف کر دیں گے؟"

"گل اندامے اور حیدر ایک بار شادی کے بندھن میں بندھ گئے تو بات ختم۔ باقی لوگ جائیں جہنم میں ــــ یار پاکستان اتنا بڑا ملک ہے۔ کیا دو بندے اس میں چھپ نہیں سکتے ــــ؟ کہاں کہاں ڈھونڈیں گے انھیں ــــ اور پھر ــــ حیدر خان کا ارادہ ملک سے باہر جانے کا بھی تو بن رہا ہے۔ کوشش کر کے ملک سے باہر چلے جائیں گے تو سارے خطرات ختم ــــ"

"بات تو تم نے ٹھیک کہی ہے۔" حیدر خان اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔

"گل اندامے ہماری بھابی بن جائے۔ بس ہمیں تو اس سے سروکار ہے۔"

"تم میری مدد کرو گے؟"

"دل و جان سے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

تینوں سر جوڑ کر سوچنے لگے۔ منصوبے بنے، اُن پر عمل درآمد کی ترکیبیں سوچی گئیں کہ گل نے ٹرک لے جانا تھا۔ اُس نے اپنی ڈیوٹی کسی اور کو سونپ دی۔ صادق بھی کام پہ نہیں گیا۔

"میں کہاں ہوں۔" گل اندامے کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، جھپکیں، ارد گرد دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

حیدر خان جلدی سے اس پر جھک گیا۔ "گل اندامے تم میرے پاس ہو گل اندامے آنکھیں کھولو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو ــــ"

لیکن وہ غنودگی کے عالم میں ڈوب گئی تھی۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ حیدر خان پلنگ کے سرہانے کرسی پر بیٹھا رہا۔ وقت گزرتا گیا۔ اس نے پھر آنکھیں جھپکیں، کھولیں،

ارد گرد دیکھا۔ اب وہ پہلے کی نسبت ہوش میں تھی۔ لیکن اس کمرے کو پہچان نہ پا رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ روشن تھا۔ کھڑکیوں پر ..... پھولدار پردے لٹک رہے تھے۔ سامنے الماری تھی۔ دائیں ہاتھ شیشے والی سنگھار میز پڑی تھی۔ چوبی تکیے والا پلنگ تھا اور فرش سُرخ قالین سے ڈھکا تھا۔ ہوش میں ہونے کے باوجود گل اندامے کو خواب کا گمان ہو رہا تھا۔

"گل اندامے۔" حیدر خان نے محبت بھرے لہجے میں اس پر جھکتے ہوئے پکارا۔

وہ حیران حیران اُسے تکتے ہوئے ایک دم بستر پہ اُٹھ بیٹھی ــــ جلدی سے بولی۔ "تم ــــ حیدر ــــ میں میں کہاں ہوں۔ حیدر ــــ میں ــــ"

"تم میرے پاس ہو گل اندامے۔ میری باہوں کے حصار میں محفوظ ہونے کے لیے ہمیشہ کے لیے یہاں آ چکی ہو ــــ"

"حیدر ــــ" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیدر کو دیکھنے لگی۔ حیدر نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ کرسی سے اُٹھ کر پلنگ کی پٹی پر آ بیٹھا اور بازو گل اندامے کی طرف بڑھایا۔

گل اندامے اچھل کر پرے ہٹ گئی۔

"گل اندامے۔" حیدر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈر کیوں رہی ہو۔ تم میرے پاس ہو۔ میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"اوہ۔" گل اندامے کا سر چکرانے لگا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ اور اس کے ذہن میں لپک جھپک کئی منظر لہرا گئے ــــ

وہ دریا کی طرف چلی آئی تھی۔ بہادر اس کے ساتھ تھا۔ بھینس اور بکریاں گھاس چر رہی تھیں ــــ حیدر اُسے وہیں ملا تھا۔ وہ اُس سے باتیں کرنے لگی تھی۔ رو رو کر ہونے والی واردات کا قصّہ اُسے سنایا تھا۔ حیدر بڑے جوش میں تھا ــــ مرنے

مارنے پر تُلا نظر آتا تھا۔ پھر اُس نے اپنے ساتھ بھاگ جانے کی بات کی تھی۔ گل اندام نے انکار کیا تھا۔ حیدر اصرار کرتا رہا تھا ـــــ پھر ـــــ پھر کیا ہوا تھا ـــــ اُسے خبر نہ تھی۔

اور اب وہ اس اجنبی جگہ پہ تھی ـــــ اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ حیدر نے اسے بیہوش کر کے اغوا کر لیا تھا۔ اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا ـــــ چند لمحوں کے لیے وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو گئی۔

حیدر خان نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا ـــــ پکارا۔ بلایا۔ تھوڑی دیر بعد گل اندام ہوش میں آ گئی۔

حیدر خان نے چائے تھرماس سے پیالی میں انڈیلی اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لو پی لو۔ حواس بجا ہو جائیں گے۔"

گل اندام نے پیالی نہیں پکڑی۔ صرف حیدر کو تکنے لگی۔

"گل اندام۔ ہوش میں آؤ میری جان ـــــ تم میرے پاس ہو ـــــ میری حفاظت میں ہو۔ یوں کیا دیکھ رہی ہو۔"

"تم ـــــ تم نے مجھے اغوا کیا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا ـــــ "پہلے چائے پی لو۔ پوری طرح ہوش میں آ جاؤ۔ پھر سوال جواب کر لینا۔"

"مجھے بیہوش کیا تھا۔"

"چائے پی لو۔"

"میری بات کا جواب دو حیدر ـــــ"

اب گل اندام پوری طرح حواس میں تھی۔ سارا معاملہ اُس کی سمجھ میں آ چکا تھا لیکن وہ حیدر خان کے اقدام پر خوش نہیں تھی ـــــ وہ بار بار حیدر کو یوں دیکھ رہی

تھی جیسے وہ کوئی اجنبی اور غیر مانوس انسان ہو ـــــ وہ حیدر خاں نہیں لگ رہا تھا جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ روح کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی ـــــ اپنا تن من جس کی امانت سمجھتی تھی ـــــ اور رحمت خان سے منگنی ہو جانے کے باوجود اس امانت کی حفاظت کا تہیہ کر چکی تھی۔

"ایسی غیر غیر نظروں سے کیوں تک رہی ہو مجھے۔ میں حیدر ہوں ـــــ تمہارا اپنا حیدر ـــــ میرے لیے اور کوئی راہ نہ تھی گل اندام۔ تم میری ہو۔ میری امانت میں تمہارے گھر والوں نے خیانت کرنے کی کوشش کی تھی۔ تسلی دے کر ارادہ بدل لیا۔ رحمت خان کی دولت کے سامنے جھک گئے۔ میں یہ سب کیسے برداشت کرتا۔ کیسے تماشائی بن کر دیکھتا۔"

"تم نے مجھے اغوا کیا ہے؟"

"تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ صبح میرے دوست مولوی صاحب کو لے کر آ جائیں گے پھر ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکے گی۔"

گل اندام صرف اُسے تکے گئی۔

"گل اندام ـــــ کیا بات ہے۔ میری جرأت تمہیں ناگوار گزری ـــــ؟"

"ہاں۔"

"گل اندام؟"

"تم نے بہت بُرا کیا حیدر خان ـــــ"

"گل اندام!؟"

"ذرا سوچو، حیدر خان۔ میرے گھر والوں پر وہ رات کس قیامت کی اُتری ہوگی۔ میری ماں کا کیا حال ہوگا۔ میرے بھائیوں کی غیرت پر کس طرح تازیانے برسیں گے ـــــ

لوگ سمجھیں گے، میں بھاگ گئی ہوں۔ رسوائی کا کلنک خاندان کے ماتھے پر لگا کر بھائیوں کی عزت پر بٹا لگا کر۔۔۔۔“

”گل اندامے جوش میں نہیں آؤ۔ اطمینان سے بات کرو۔ سوچو ـــــ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں نے یہ قدم اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے ہی اُٹھایا تھا۔ کیا تمہارے جذبات بھی میرے جیسے نہیں کیا۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ـــــ؟“

”کبھی تھی۔“

”اب۔ اب گل اندامے ـــــ؟“

”اب میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ بزدلوں کی طرح عزتوں اور غیرتوں پر چھاپہ مارنے والے قابلِ تحسین نہیں ہوتے حیدر خان ـــــ تم میری محبت میں جل جل کر راکھ ہو جاتے تو قابلِ تعظیم ہوتے۔ لیکن تم نے ـــــ تم نے ـــــ جوشیلے جذبوں کی بنا پر اندھے ہو کر مجھے اغوا کیا ـــــ اتنا بھی نہ سوچا کہ ایک شریف خاندان پر کیا بیتے گی ـــــ ماں مر نہ جائے گی۔ بھائی غصّے سے دیوانے نہ ہو جائیں گے ـــــ لوگ ان پر تھوکیں گے کہ جوان بہن بھاگ گئی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ سوچو تو کیا تم نے یہ ٹھیک اقدام کیا ہے؟“

”لیکن گل اندامے ـــــ تمہیں مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔“

”دُکھ مجھے بھی تھا۔ لیکن محبت کو ایسے حالات میں قربان کر دینے ہی میں عزت ہوتی ہے۔“

”تم رحمت خان سے شادی کر لیتیں ـــــ؟“

”ہاں۔ یہ میرے خاندان، میری ماں اور میرے بھائیوں کی عزت کا معاملہ تھا۔“

”لیکن تم ـــــ تم نے ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا کہ ـــــ تم میری ہو ـــــ میرے لیے جیو گی، میرے لیے مرو گی۔ تمہارا دل تمہارا جسم سب کچھ میرا ہے ـــــ“

”ہاں میں نے ہمیشہ یہی کہا۔ اور جو کچھ کہا سچ کہا۔“

”گل اندامے ـــــ“

”اس سچ کو میں سچ کر کے دکھا دیتی۔“

”میں کچھ نہیں سمجھ رہا گل اندامے ـــــ“

”حیدر خان۔ سب کچھ دیکھا تو ہوتا۔ انتظار تو کرتے ـــــ گل اندامے کو آزما تو لیتے ـــــ“

”تم ـــــ“

”حیدر خان، گل اندامے کی ڈولی جس عزت و وقار سے اٹھتی۔ اسی عزت و وقار سے اس کا جنازہ بھی اُٹھتا۔“

”کیا ـــــ کیا کہہ رہی ہو گل اندامے ـــــ؟“

”یہی سوچا تھا میں نے۔ تمہاری امانت تھی میں، حیدر خان ـــــ مر جانا قبول تھا۔ لیکن اس امانت کو سنبھالے رکھنا تھا ـــــ لیکن ـــــ لیکن تم نے ـــــ یہ حرکت کر کے ـــــ سب کی عزت خاک میں ملا دی ـــــ کیا تم میرے گھر والوں کے رنج و غم اور غیظ و غضب کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں خیال تک نہیں آیا کہ ایسا کرنے سے میرے خاندان کی کتنی بدنامی ہوگی۔ کون جان پائے گا کہ تم مجھے اغوا کر کے لائے ہو۔ افواہ تو یہی پھیلے گی کہ دلنواز خان اور شہباز خان کی بہن اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔“

”گل اندامے ـــــ“

”میری جگہ تمہاری بہن کو کوئی اغوا کر لیتا تو تم پر کیا بیتتی۔ کیا تم برداشت کر لیتے۔ ذلت و رسوائی کو گلے لگا لیتے ـــــ بولو۔ بتاؤ کیا کرتے ـــــ؟“

حیدر خان نے سر جھکا لیا۔ گل اندامے کی کس بات کا جواب دینے کے قابل نہ

رہا تھا وہ ____

"مجھے واپس چھوڑ آؤ ____" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ چلائی۔

"واپس ____ گل اندامے واپسی کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں ____ واپسی موت ہے۔"

"میں زندہ تو اب بھی نہیں رہی ____ پچھتاوے کی زندگی موت سے بھی زیادہ اذیت دہ ہوتی ہے۔ ہم دونوں شادی کر بھی لیں تو کبھی خوش نہیں رہیں گے حیدر خان ____ انتقام کی آگ ہمیشہ ہمارا تعاقب کرتی رہے گی ____ اور ہم اس سے بچنے کے لیے چھپتے پھریں گے۔ دوڑتے رہیں گے۔ ہراساں، پریشان، بدحال، سکون کا ایک لمحہ بھی ہمیں میسّر نہیں آئے گا۔ دھڑکے اور وسوسے زندگی کے لمحوں کی خوشگواری کو نگلتے رہیں گے ____"

وہ بولتی گئی۔

حیدر خان سر جھکائے سنتا گیا۔

صبح بیدار ہو گئی ____ اس کے دوست مولوی کو لے کر آ گئے ____ حیدر خان کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کرگل اور صادق کے سمجھانے کے باوجود بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ اُس نے اُن سے کچھ وقت مانگا۔ مہلت چاہی۔

دن گزر گیا۔

پھر

رات بھی بیت گئی۔

حیدر خان کا اصرار اور گل اندامے کی تکرار کسی اختتامی نقطے پر پہنچے بغیر جاری رہی۔ گل اندامے واپس جانے پر مُصر تھی۔ حیدر خان مہلک مضمرات سے آگاہ تھا۔ وہ واپس گئے تو موت کے منہ ہی میں جائیں گے۔ انہیں کوئی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ حیدر خان کا موقف تھا۔

اور گل اندامے چاہتی تھی واپس جائے اور اپنے بھاگ جانے کے داغ مٹا دے۔ خواہ یہ داغ اُسے اپنے خون ہی سے کیوں نہ مٹانا پڑے ____ وہ ایک بار اپنے بھائیوں، ماں اور عزیز و اقارب کو باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ بے غیرت نہیں۔ وہ بھاگی نہیں تھی۔ وہ تو اپنا آپ اپنی محبت پر بے دریغ قربان کر دینے کو تیار تھی۔

کرگل خان اور صادق نے بھی گل اندامے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جو حیدر خان کی نہ سُن رہی تھی، ان کی باتوں پر کیا کان دھرتی۔ ایک ہی فیصلہ تھا، ایک ہی ضد تھی، ایک ہی پکار تھی۔

"مجھے گاؤں واپس بھیج دو ____"

دلنواز، شہباز اور رحمت خان کے آدمی بھوکے کتّوں کی طرح حیدر خان اور گل اندامے کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ کئی بار پشاور آ کر ٹرکوں اور بسوں کے اڈوں سے ان کا سراغ لگانے کی کوششیں کر چکے تھے۔ کرگل اور صادق پل پل کی خبریں شہر کے اندرون ایک دوست کے محفوظ مکان میں پناہ لینے والے حیدر خان کو پہنچا رہے تھے۔ گاؤں میں واقعی گل اندامے کے بھاگ جانے کی خبر پھیل چکی تھی۔ بہادرے نے گل اندامے اور حیدر خان کے چٹان کے پیچھے ملنے کی بات گھر والوں کو بتا دی تھی۔ بھائی آتش زیر پا انھیں تلاش کر رہے تھے۔

سبکی خان حشمت خان کی بھی ہوئی تھی۔ رحمت خان تو باؤلا ہو رہا تھا۔ اُس کے آدمی اور وہ خود ان دونوں کو تلاش کر رہا تھا۔ پستولوں کی لبلبی پر ہاتھ تھے۔ کسی آن، کسی لمحے یہ پستولیں.... دھواں دھار گولیاں برسا سکتی تھیں۔

ایسی سنگین صورت حال تھی۔ گل اندامے کا واپس جانے کا اصرار بے معنی تھا۔

لیکن وہ شعلۂ جوّالا بنی تھی۔ حیدر خان اس کی بات ماننے سے انکاری تھا۔ وقت گز رہا تھا۔ تلخی بڑھ رہی تھی ـــــ دونوں بحث و تکرار کرتے ہوئے ایک دوسرے کے جانی دشمن نظر آتے تھے۔

اسی دن اسی بحث و تکرار نے دونوں کو اتنا مشتعل کر دیا کہ دونوں ہی بھری ہوئی پستول اٹھانے جھپٹے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ پستول گل اندامے کے ہاتھ لگی اور حیدر خان کے چھیننے سے پہلے ہی اُس نے اس پستول کی لبلبی دبا دی۔ گولیاں تڑاخ سے نکلیں اور حیدر خان کا سینہ چھلنی کر گئیں۔ وہ تیورا کر گرا۔ تو گل اندامے نے ڈر کر پستول پھینک دی۔ گھبرا کر حیدر خان کی طرف بڑھی۔ اس کا سر گود میں رکھ کر چیخی "نہیں حیدر خان نہیں، میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی ـــــ میں تمہاری ہوں، تم میرے ہو"

وہ واویلا کرتی رہی۔ حیدر خان کے لبوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی کھلی آنکھیں گل اندامے کے چہرے پر تھیں۔ اور اُس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ گولیوں کی تڑ تڑ سے اہلِ محلّہ اس گھر کی طرف دوڑے۔ دروازہ پیٹ ڈالا۔ کوئی پولیس کو خبر کرنے دوڑا ـــــ کوئی لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے چیخا۔

بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اس گھر میں تو مدتوں سے شریف اور بے ضرر لوگ بستے تھے۔ یہ گولیاں کیوں چلیں ـــــ ہر کوئی یہی سوال کر رہا تھا۔ حیدر خان اور گل اندامے کے متعلق اہلِ محلّہ کو کچھ علم نہ تھا۔

اور شاید یہی لاعلمی گل اندامے کے بھاگ نکلنے کی وجہ بنی۔ دروازہ کھلنے پر ہجوم اندر کی طرف ٹوٹ پڑا اور وہ چادر کی بکل مارے گھر سے باہر نکل گئی۔

جانے کیسے اور کن کن صعوبتوں سے نبرد آزما ہو کر وہ گاؤں پہنچی۔ وہ نڈر اور بے خوف تھی۔ گھر پہنچ کر وہ صرف ایک بار اپنی ماں اور بھائیوں کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ جانتی تھی ـــــ اس کی اُسے

مطلقاً پروا نہ تھی۔ حیدر دُنیا میں نہیں رہا تھا۔ تو اسے بھی مرنے کا کیا غم تھا۔

"ماں" وہ کھلے دروازے سے دوڑتی صحن میں آئی اور ماں سے لپٹ گئی ـــــ

"ماں۔ ماں ـــــ"

"کون۔ گل اندامے تُو ـــــ ماں نے اُسے سینے میں دبوچ لیا۔ اس کا دل بے اختیار سا ہو گیا۔

"ہاں ماں۔ تیری بدنصیب بیٹی" وہ روتے ہوئے بولی۔ ماں اُسے بھینچے گئی۔ وہ بے حال ہو کر روتی رہی۔

"لیکن ـــــ" چند لمحے جذباتیت سے مغلوب رہنے کے بعد ماں نے اُسے سختی سے پرے دھکیل دیا۔ "تو کہاں مر گئی تھی۔ ہمارے چہروں پر کالک مل کر اب کیا لینے آئی ہے۔ کیا اُس نے تجھے دُھتکار دیا۔ جس کے ساتھ بھاگی تھی"

"میں بھاگی نہیں تھی ماں ـــــ میں بھاگی نہیں تھی۔ مجھے حیدر خان نے اغوا کیا تھا۔ میں اُس کے چنگل سے آزاد ہو کر آئی ہوں ماں، میں بھاگی نہیں تھی ـــــ"

وہ رو رو کر ماں کو بتا رہی تھی۔ بہادر کوٹھری سے نکل آیا۔ گل اندامے کو دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو اُٹھا۔

"گل بی بی آگئی۔ گل بی بی آگئی" وہ چلاتے ہوئے باہر بھاگا۔ بھائیوں کو یہ خوشخبری سنانا مقصود تھی۔ بھاگتے ہوئے بھی وہ چلائے گیا ـــــ "گل بی بی آگئی ـــــ گل بی بی آگئی"

جس نے سُنا حیرت سے اُسے دیکھا۔ دو ایک محلّے والوں نے تو اُسے روک کر اس بات کی تصدیق بھی کی۔

مشتعل بھائی اب پیچ و تاب کھا رہے تھے ـــــ دُکھیاری ماں سر پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ رحمت خان غصّے میں پھنکار رہا تھا۔ گل اندامے تھر تھر کانپ رہی تھی، روئے جا

رہی تھی۔ اور حشمت خان اسے بازو کا سہارا دیئے کھڑا اُس کی روداد سن رہا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی "خان میں بھاگی نہیں تھی۔ حیدر خاں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میں اس کے چنگل سے آزاد ہو کر آئی ہوں ــــ میری بات کا یقین کرو۔ میں بھاگی نہیں تھی بھاگی نہیں ــــ تھی" وہ بار بار دیوانوں کی طرح یہی باتیں کیے جا رہی تھی۔

خان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور اُسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے خود بھی پاس بیٹھ گیا۔

"یہ جھوٹ بولتی ہے خان ــــ" دلنواز غصّے سے بھرا ہوا تھا ــــ "یہ حیدر خان سے ملتی رہتی تھی ــــ حیدر نے اس کے لیے رشتہ بھی مانگا تھا ــــ بہادرے نے ہمیں بتایا ہے ــــ کہ یہ اس سے ملا کرتی تھی۔"

شہناز نے بھی یہی بات کہی۔ تو حشمت خان نے انھیں پُر سکون ہونے کی تلقین کی "بیٹھ جاؤ ــــ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔ غصّہ حرام ہوتا ہے۔ سکون سے اس کا بیان بھی سُنو ــــ یہ نہ ہو گل اندامے بے قصور ہو اور تم ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگ لو۔"

"گل اندامے ــــ" خان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

شفقت کے لمس سے اس کا دل تڑپ اٹھا۔

"گل اندامے!"

"جی خان" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"حیدر نے تمہیں کیوں اغوا کیا؟ ــــ"

گل اندامے کے جواب سے پہلے شہباز نے کچھ کہنا چاہا ــــ تو خان نے ہاتھ کے اشارے سے روکا ــــ "اسے بولنے دو ــــ"

"ہاں گل اندامے ــــ" وہ اس کے جُھکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "اس نے

تمہیں کیوں اغوا کیا؟"

"وہ ــــ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا" گل اندامے نے بلا جھجک کہا۔

"اس نے رشتہ بھی بھیجا تھا خان ــــ" ماں درمیان میں بولی ــــ "میں نے اس کے گھر والوں کا منہ بھی میٹھا کروا دیا تھا ــــ"

"پھر رشتہ کیا کیوں نہیں؟" خان نے پوچھا

"چپ رہو ماں" دانت پیستے ہوئے دلنواز چیخا۔

"کہنے دو انھیں۔ ہاں بہن۔ رشتہ کیوں نہیں کیا تھا۔ جب ان لوگوں کا منہ میٹھا کروا چکی تھیں" خان نے پوچھا۔ دلنواز اور شہباز نے ماں کو خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ لیکن وہ کہہ ہی اٹھی "آپ نے اپنے رحمت خان کا رشتہ جو بھجوا دیا تھا ــــ آپ کو انکار کیسے کرتے ہم خان ــــ" ماں سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے رو دی ــــ

خان چند لمحے بالکل ساکت سا ہو گیا۔ رحمت خان بھی خاموش ہو گیا ــــ ماں، حیدر خاں کی ماں اور بہنوں کے رشتہ لانے کا احوال خان کو سُناتی رہی۔

خان نے صرف ایک بار گل اندامے کا چہرہ دیکھا۔ پھر اس سے پوچھا "گل اندامے، کیا تم بھی حیدر خان کو پسند کرتی تھیں؟"

اس نے سر جھکا دیا۔ انکار نہیں کیا۔ خان حشمت خان نے ایک گہری سانس لی۔ پھر بولا ــــ "ہم گاؤں کے لوگوں کو جانے کب عقل آئے گی ــــ کب تک ہم بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہیں گے ــــ کب تک انا اور وقار کا مسئلہ بنا کر معصوم اور بے قصوروں کو سولی پر لٹکاتے رہیں گے۔"

"خان ــــ" دلنواز، حشمت خان کا مفہوم سمجھے بنا بولا ــــ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ خان بولا "تمہیں یقین کرنا پڑے گا دلنواز کہ گل اندامے بے قصور ہے۔ وہ بھاگی ہوتی تو یوں واپس نہ آتی۔ اُسے یقیناً حیدر خان نے اغوا کیا ہے۔ لیکن قصوروار وہ بھی نہیں،

تم ہو۔ تم دونوں اور تمہاری ماں۔ جنھوں نے حیدر خان کے گھر والوں کو تسلّی دے کر رشتے سے انکار کر دیا۔ محض اس لیے کہ گاؤں کے سب سے بڑے خان نے یہ رشتہ مانگا تھا ــــ کاش تم ہم لوگوں کو صورت حال سے پہلے ہی باخبر کر دیتے۔ تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ رحمت خان اصرار بھی کرتا تب بھی میں گل اندامے کے ہاتھ میں انگوٹھی نہ ڈالتا حیدر خان کے ساتھ یقیناً زیادتی ہوئی ہے۔ اُس کے حق پر ڈاکا ڈالا گیا ہے ــــ"

"خان ــــ" دلنواز اور شہباز دونوں نے حیرانگی سے حشمت خان کو دیکھا۔

"بیٹی ــــ" خان نے گل اندامے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت سے کہا "ہم سے انجانے میں بھول ہو گئی بیٹی۔ تمہاری اور حیدر خان کی خوشیوں کے درمیان ہمارا بیٹا غلطی سے آگیا تھا۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

"خان جی ــــ" گل اندامے گھگیا گئی۔ ماں زور زور سے رونے لگی اور دلنواز اور شہباز دودھ کے اُبال کی طرح بیٹھ گئے۔ رحمت خان نے سر جھکا لیا۔

لوگوں کی حیرانی تو اُس وقت عروج کو پہنچ گئی۔ جب خان نے گل اندامے کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے سنگین لہجے اور مستحکم آواز میں کہا "گل اندامے، تمہارا اس طرح آنا ہی تمہاری بے گناہی ثابت کر رہا ہے۔ لیکن ہم حیدر خان کو گناہگار نہیں کہیں گے۔ سب کچھ ہماری لاعلمی اور تمہارے گھر والوں کی غلطی سے ہوا۔ ہم اس کا خمیازہ تم دونوں کو بھگتنے نہیں دیں گے ــــ تم حیدر خان کی امانت ہو۔ تمہیں حاصل کرنے کا اُسے حق ہے اور ہم یہ حق اُسے ضرور دیں گے۔ تم......"

"خان ــــ" گل اندامے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر اس انداز سے چیخی کہ دل سینوں کے اندر دہل گئے۔

سب نے گھبرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ رنگت سپید لٹھے کی طرح ہو گئی تھی۔ آنکھیں بند ہو رہی

تھیں۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ تیورا کر گرتے ہوئے اس کے لبوں سے مدھم سی آواز نکلی۔

"یہ ــــ یہ پہلے کہتے ــــ خان ــــ یہ پہلے کہہ ــــ تے۔ اب۔ اب۔"

"اب کیا گل اندامے ــــ اب کیا ہوا ــــ" خان نے اُسے چارپائی پر لٹاتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

سب چارپائی کے گرد جمع ہو گئے۔

"اب کیا گل اندامے۔ اب کیا ــــ ہوا ــــ؟" سبھی پوچھ رہے تھے۔ گھبرا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔ ماں اس پر گری جا رہی تھی۔ بھائی حواس باختہ سے نظر آ رہے تھے۔

اب اس کے آگے وہ کیا کہتی۔ وہ تو ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ چند منٹوں میں بالکل ہی ڈوب گئی۔

اس ادھورے جواب کی تفصیل تو گھر والوں اور گاؤں کے لوگوں کو دوسرے دن پتہ چلی۔ جب کہ گل خان اور صادق، حیدر خان کی میت لے کر گاؤں پہنچے۔

پھر ــــ پورے گاؤں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ خان حشمت خان کو اپنی لاعلمی میں کی ہوئی غلطی کا بھی شدت سے احساس تھا۔ رحمت خان بھی پشیمان تھا۔ گل اندامے کی ماں اور بھائی تو پچھتاوے کی آگ میں جھلسے جا رہے تھے۔

خان حشمت خان نے حیدر خان اور گل اندامے کی قبروں کے لیے اپنے ذاتی قبرستان میں جگہ دی۔

دونوں قبریں ساتھ ساتھ بنا کر اپنی پشیمانی کا مداوا کرنا چاہتا تھا وہ شاید ــــ

دونوں قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔

اور

وہ ــــ جو
زندگی میں قربتوں کو دائمی نہ بنا سکے تھے۔

اب

ابد تک ایک دوسرے کے قریب سکون کی نیند سوتے رہیں گے۔

یُوں بھی ہوتا ہے

"کیا؟" اُس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کُھل گئی تھیں اور حیرانی و پریشانی کے ملے جُلے احساس سے آواز پھٹ گئی تھی۔ چیخنے اور گھٹنے کے انداز میں اُس نے کیا کہا تو استفہامی لہجہ زوردار تھپیڑ کا سا تاثر پیدا کر گیا۔ سعیدہ جو آج دوسری بار اس کے ہاں ہنسی خوشی پورا دن گزارنے آئی تھی بھونچکا رہ گئی۔

ناصرہ جو بڑی متانت سے سنجیدہ موضوع پر اس سے بات کر رہی تھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"اے تُو پاگل تو نہیں ہو گئی ــــ ناصرہ ــــ تُو نے وہی کہا ہے نا جو ــــ جو میں نے سنا ہے؟"

"ہاں!"

"دماغ خراب ہے تیرا!"

"دماغ خراب نہیں سعیدہ ــــ یہ مجبوری ہے۔"

"ایسی مجبوری کہ تُو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہی ہے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر۔"

"یہ میری ہی تجویز ہے اور میں ہی بخوشی یہ کام کر رہی ہوں۔"

"بخوشی ــــ"

"چلو بخوشی نہ سہی۔ لیکن یہ کام مجھ کو کرنا ہے۔"

"اور میں تمہیں یہ کام کبھی نہیں کرنے دوں گی ـــــ تمہارا دماغ درست کردوں گی۔"

"بچّوں کی سی باتیں نہ کرو سعیدہ۔"

"اور تم بھی ان احمقانہ باتوں کو چھوڑو۔ ہوش میں رہو اور عقل کی باتیں کرو۔"

ناصرہ اُس کی باتوں پر پھر مسکرا دی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ کھا جانے والی نظروں سے ناصرہ کو دیکھ رہی تھی۔

"تیری عمر چالیس کے قریب ہو رہی ہے۔ میں سمجھی تھی۔ دیس دیس گھوم کر تجھے دنیا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تُو تو بڑی بُردبار، بڑی سنجیدہ اور بڑی سیانی ہو چکی ہو گی ـــــ لیکن ـــــ" اس نے سر نفی کے انداز میں ہلایا۔

ناصرہ نے ایک گہری سانس لی۔

"میرے سامنے تو یہ بات زبان پر لے آئی ہے۔ کسی اور کے سامنے نہ کرنا۔"

"کیوں؟ یہ بات کرنا جرم ہے نہ گناہ ـــــ پھر کیوں نہ کروں کسی کے سامنے۔"

"ناصرہ۔ لوگوں کی نظریں تیری بے پناہ دولت پر پہلے ہی لگی ہیں۔ یہ بات تیرے مُنہ سے نکلی تو ایک چھوڑ دس آجائیں گے رشتے لے کر۔"

"مجھے تو صرف ایک ہی کو منتخب کرنا ہے۔" ناصرہ نے مذاق کے انداز میں کہا تو سعیدہ چڑ سی گئی۔

وہ دونوں بہت پُرانی اور بہت اچھی دوست تھیں۔ دونوں نے ایک ہی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ پھر ایک ہی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ دونوں میں بہت پیار تھا۔ دکھ سکھ کی ساتھی تھیں۔ گھروں میں بھی آنا جانا ہو گیا۔ سعیدہ بیوہ ماں کی یتیم بیٹی تھی۔ ناصرہ بھی گو امیر کبیر گھرانے سے تعلق نہ رکھتی تھی لیکن شروع ہی سے سخی دل تھی، اپنے جیب خرچ میں سے زیادہ پیسے وہ سعیدہ پر اس طرح خرچ کیا

کرتی تھی کہ اُسے مالی معاونت کا احساس بھی نہ ہو اور مدد بھی ہو جائے۔ سعیدہ کی امّی اُسے بہت پیار کرتی تھیں۔ یہ دریا دل بچّی انھیں سعیدہ ہی کی طرح عزیز تھی۔

"تجھے خدا خوب رنگ لگائے گا بیٹی" وہ اپنے انداز میں ناصرہ کو دعائیں دیا کرتیں۔

"تیرا دل بہت بڑا اور تیری سوچ بڑی اونچی ہوتی ہے۔"

"غالباً آپ کی دعائیں ہی میرے لیے بہت ہیں" وہ مسکرا کر جواب دیا کرتی۔

دونوں تعلیمی مدارج طے کر رہی تھیں۔ تھرڈ ائیر میں تھیں کہ سعیدہ کا رشتہ اچھے گھرانے میں طے ہو گیا۔ چٹ منگنی، پٹ بیاہ والی بات ہوئی۔ تعلیم ادھوری چھوڑی وہ دلہن بنی اور پیا گھر جا پہنچی۔

ناصرہ کو اس کی شادی کی بہت خوشی تھی۔ لیکن ساتھ چھوٹنے کا غم بھی تھا۔ وہ اپنی کلاس کی کسی اور لڑکی سے دوستی کے بندھن اتنے مضبوط اور استوار نہ کر سکی جتنے سعیدہ کے ساتھ تھے۔

شادی کے بعد سعیدہ اور ناصرہ ملتی رہیں۔ سعیدہ میکے آتی تو اُس کے ہاں بھی ہو آتی۔ کبھی ناصرہ اس کے ہاں چلی جاتی لیکن یہ سلسلہ بھی قائم نہ رہا۔ رشید کی تبدیلی لاہور سے پنڈی ہو گئی۔ سعیدہ اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ بی۔اے کے بعد ناصرہ کی شادی بھی اعظم کے ساتھ ہو گئی۔ سعیدہ تو اس شادی میں بھی شریک نہ ہو سکی کیونکہ اس کے ہاں اسی ہفتے دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ ناصرہ سے وہ اس کی شادی ہو جانے کے دو ماہ بعد ملی تھی۔

دونوں اپنے اپنے گھروں میں خوش باش تھیں۔

اس کے بعد دونوں کی ملاقات پھر کبھی نہ ہو سکی تھی۔ ملازمتوں کے سلسلے میں کبھی ایک شہر کبھی دوسرے شہر جانا پڑا۔ پھر ناصرہ اور اعظم باہر چلے گئے ـــــ یوں دونوں اپنے اپنے حالات میں کھو کر رہ گئیں۔

اور اب پورے ۲۲ برس بعد دونوں ملی تھیں۔

ناصرہ کو پاکستان آئے دو تین ہفتے ہو چکے تھے ـــــ وہ خوبصورت اور کشادہ کوٹھی میں اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پچھلے ہفتے اچانک ہی بُرٹی کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سعیدہ سے ملاقات ہو گئی۔ سعیدہ نے اسے دیکھا اور اس نے سعیدہ کو۔ بائیس برس کا طویل عرصہ درمیان میں حائل رہا تھا لیکن پہچان اور شناخت کے لیے نظر ہی کافی تھی۔ دونوں بے اختیارانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف بڑھیں اور والہانہ انداز میں لپٹ گئیں۔

"تم..... ناصرہ ـــــ"

"ہائے سعیدہ تم!"

دونوں کے منہ سے بیک وقت یہ جملے نکلے۔ اسٹور میں اِدھر اُدھر گھومتے اور کاؤنٹرز پر کھڑے سیلز مین اور..... گاہک، دونوں کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ لیکن کئی لمحے تو دونوں کو گرد و پیش کا خیال ہی نہ رہا تھا۔

"کیسی ہو؟"

"تم کیسی ہو؟"

"ہائے سعیدہ، تم اتنی موٹی ہو رہی ہو۔ لگتا ہے بہت خوش ہو ـــــ"

"اللہ کا شکر ہے ـــــ تم اپنی کہو ـــــ ویسی کی ویسی ہو ـــــ رنگت اور نکھر آئی ہے اور یہ بالوں کی لٹ سیدھی ہو گئی ہے بس ـــــ"

دونوں نے بغل گیر ہونے کے بعد ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ وہ آمنے سامنے کھڑی بے پناہ خوشی کے اظہار کرتے ہوئے ایک دوسری کی سُنے بغیر اپنی اپنی کہے جا رہی تھیں۔

ناصرہ کی بڑی بیٹی سنبلہ ساتھ آئی ہوئی تھی۔ امّی اور ان کی دوست کی طرف لوگوں

کو زیادہ ہی متوجہ ہوتے دیکھا تو قریب آ کر بولی "مما پلیز ـــــ آپ اسٹور میں کھڑی ہیں اور لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ کون ہے؟" سنبلہ کے منہ سے مّما کا لفظ سن کر بھی سعیدہ مارے خوشی اور تجسس کے بولی اور پھر اپنا تھل تھل کرتا وجود یوں جیسے سنبلہ پر حملہ آور ہوئی "یہ تیری بیٹی ہے نا، ناصرہ تیری بیٹی ہے نا؟"

اس نے جھٹاپٹ سنبلہ کو بھی اپنی باہوں میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے اسے بھینچ کر پیار کر لیا۔

سنبلہ شرم سے سُرخ ہو گئی۔ لوگ اب تو مڑ مڑ کر ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔

"باہر چلتے ہیں سعیدہ ـــــ" ناصرہ جلدی سے بولی۔

"ہاں مّما ـــــ یہاں بہت لوگ ہیں۔" سنبلہ بولی۔

"تو کیا ہوا ـــــ اتنی مدت بعد تو ملی ہے تیری مّما۔ تمہیں کیا پتہ، ہم دونوں کتنی اچھی دوست تھیں۔"

"تھیں یا ہیں؟" ناصرہ نے ہنس کر ہاتھ پھیلایا۔ تو سعیدہ نے زور سے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی "ہیں بھئی ہیں۔" دونوں ہنس پڑیں۔ سنبلہ نے منہ بنایا۔

"آؤ اُدھر چل کر باتیں کریں۔" ناصرہ نے اسٹور کے بیرونی برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔ سعیدہ غیر متوازن سی چال چلتے ہوئے ناصرہ کے ساتھ ہو لی۔ سنبلہ ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"کچھ شاپنگ تو نہیں کرنا تھی ابھی؟" سعیدہ نے پوچھا۔

"ہائے ہائے، شاپنگ کو مارو گولی۔ ہوتی رہے گی۔ تم اب ملی ہو۔ تو جی بھر کے تمہیں دیکھ تو لوں۔ سناؤ کیا حال چال ہے، کیسے گزر رہی ہے۔ میاں کہاں ہیں اور بچے کتنے ہیں تمہارے؟"

"تم نے تو ایک ساتھ ہی اتنے سوال داغ دیئے۔

"ہائے ناصرہ کیا بتاؤں تمہیں دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔"

"مجھے شاید تم سے بھی زیادہ ——— دو تین ہفتے آئے ہو گئے۔ کوئی دل کی کہنے سننے والا ملا ہی نہیں تھا۔"

"اب ہم دونوں ملے ہیں تو ڈھیروں باتیں ہوں گی۔"

"تم کہاں ہوتی ہو؟"

"خوش قسمتی سے ان دنوں لاہور ہی میں ہیں ہم۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

"اُسی گھر میں!"

"خالہ جان والے گھر میں؟"

"ہاں اماں وہ گھر مجھے دے گئی تھیں ———"

"وہ؟"

"فوت ہو گئیں ——— گیارہ برس ہو گئے۔ اور تمہاری امی؟"

"امی تین سال ہوئے گزر گئیں۔ ابو کا تو شاید تمہیں پتہ ہو۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ کوئی سترہ برس پہلے۔"

"بھائی اور بھابیاں؟"

"سب اپنی اپنی جگہ خوش باش۔ تم سناؤ ——— کتنے بچے ہیں؟"

"تین۔"

"بیٹے؟"

"دو بیٹے ایک بیٹی۔"

"خوب۔"

"تمہارے؟"

"تین بیٹیاں ایک بیٹا ——— تمہارے بچے بھی تو جوان ہوں گے؟"

"تینوں کی شادیاں کر دی ہیں۔"

"سچی!"

"ہاں۔"

"بڑی خوش نصیب ہو۔"

"واقعی اس لحاظ سے ہوں۔ بڑا بیٹا آرمی میں کیپٹن ہے، چھوٹا ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ بیٹی نے بی اے کیا تھا پچھلے سال۔ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی اچھا رشتہ مل گیا تھا، شادی کر دی۔"

"بہت خوش نصیب ہو۔"

"تم نے ابھی ․․․․"

"یہ میری بڑی بیٹی ہے سنبلہ۔ اس سے چھوٹی نملہ ہے، اس سے چھوٹا بیٹا ہے، ناظم ——— وہ انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس سے چھوٹی رملہ ہے۔ ہم چاروں ماں بیٹیاں آجکل یہاں آئی ہوئی ہیں۔"

"اور تمہارے میاں؟"

"وہ ہالینڈ ہی میں ہیں۔"

"سُنا ہے، وہاں تم لوگوں کا بڑا بزنس ہے۔"

"ہاں" ناصرہ نے ایک گہری سانس لی۔

دونوں نے کھڑے کھڑے سرسری طور پر ایک دوسرے کو اپنے اپنے متعلق بتایا بائیس برسوں کا پھیلاؤ منٹوں میں تو سمیٹا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے سعیدہ بولی "کب آؤ گی میرے گھر؟ پتہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔"

پتہ تو ہے لیکن شہر اتنا بدل گیا ہے، بہر حال میں ڈھونڈ لوں گی۔"

"ہمارا محلہ تو نہیں بدل گیا۔ وہیں ہے اسی جگہ۔" سعیدہ ہنسی۔

"میرا مطلب نہیں سمجھیں تم۔ دیکھو نا ـــــ اس مارکیٹ کا نام و نشان بھی نہیں تھا شاید جب میں ہالینڈ گئی تھی۔ پرانی بلڈنگیں اب مال روڈ پر ہی دکھائی دیتی ہیں جگہ جگہ یہ شاندار پلازے۔ مارکیٹیں دکانیں بن چکی ہیں اور مکان تعمیر ہو چکے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ بی بنّو۔ عرصہ بھی تو دیکھو کتنا باہر گزار آئی ہو۔ اب کیا ہمیشہ کے لیے آئی ہو یا پھر؟"

"یہ سب باتیں آرام سے بیٹھ کر کریں گے۔ دیر ہو رہی ہے، بچیاں راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"پھر کب انتظار کروں ـــــ غائب ہی نہ ہو جانا۔ مجھے بھی اپنے گھر کا پتہ دے دو۔ تم نہ آئیں تو میں چلی آؤں گی۔"

ناصرہ نے پرس کھولا۔ نوٹ بک نکالی اور اپنے گھر کا پتہ لکھ دیا۔ وہ گلبرگ میں رہتی تھی۔ مین بلیوارڈ میں۔ اس کا گھر ڈھونڈنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔ بڑی نشانی تو چائنیز ریسٹورنٹ کی تھی۔

"بس بس پتہ چل گیا مجھے۔ اس ریسٹورنٹ میں تو میں اور رشید اکثر آتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک۔"

"میں تو فارغ ہوتی ہوں۔ کل ہی آجاؤں گی۔ گھر پر مل سکو گی؟"

"کل؟"

"ہاں۔"

"آجانا ـــــ ضرور۔ میں انتظار کروں گی ـــ دیکھو سعیدہ، ایسا کرو کہ صبح صبح آ جانا۔ سارا دن اکٹھے گزاریں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔ رشید کا دفتر ادھر ہی ہے ـــــ شیر پاؤ برج کے نیچے مڑتے ہوئے وہ مجھے ڈراپ کرتے جائیں گے۔"

"بہت اچھا۔ بہت اچھا ـــــ ضرور آنا۔ بھول نہیں جانا۔"

"لو بھلا بھول سکتی ہوں۔ ناصرہ مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ اللہ، یقین نہیں آ رہا کہ ہم تم ملے ہیں۔"

ناصرہ مسکرانے لگی۔ سعیدہ نے سنبلہ کی طرف دیکھا اور بولی "ہماری بٹیا بور ہو رہی ہے۔"

"نہیں آنٹی۔" سنبلہ جلدی سے بولی ـــ "اندر اسٹور میں لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ یہاں جتنی دیر رکنا ہے، رک لیں۔"

"اب کل تمہارے گھر ہی آؤں گی۔ مجھے تھوڑی سی چیزیں لینا ہیں وہ لے لوں۔"

"چلیں ہم؟"

"جاؤ۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" دونوں پھر تپاک سے بغلگیر ہو گئیں۔

سعیدہ بار بار ہاتھ ہلاتے مڑ مڑ کر انہیں دیکھتے ایک بڑے اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔

سنبلہ اور ناصرہ دونوں سڑک کراس کر کے اپنی گاڑی کی طرف آگئیں۔

"ممّا آپ اپنی اسی دوست کی باتیں کیا کرتی تھیں نا کہ بہت باتونی ہیں بہت مزاقیہ ہیں۔"

"ہاں۔ میری بڑی پیاری سہیلی ہے۔ بہنوں سے بھی بڑھ کر۔"

سنبلہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہے آپ کو کمپنی دیا کریں گی۔"

ناصرہ دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شاپنگ بیگ اس نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا

"بالکل ـــ ویسے بھی کام آئے گی۔ یہ تو پاکستان ہی میں رہی ہے۔ اس کے م
بہت سے لوگوں سے ہوں گے۔ ویسے بھی بڑی سوشل ہے۔ ہمارے کام آئے گی۔"

سنبلہ نے سرسری نگاہ ماں پر ڈالی ـــ پھر بولی "مما، ملک چھوڑ کر جانے
والوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"ہاں بیٹی ـــ"

دوسرے ممالک میں بس کر بھی اپنی مٹی سے ان کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔"

"یہی بات ہے سنبلہ ـــ جڑیں اپنی ہی زمین میں رہتی ہیں نا۔ تو ٹوٹ نہیں
پاتے۔ دوسرے معاشرے میں بھی تو فٹ نہیں ہو سکتے نا ـــ اس لیے مسائل پیدا ہوتے
ہیں۔ ہمارا کیس ہی دیکھو ـــ"

"تو کیا مما صرف دولت کمانے کے لیے ہی وطن چھوڑتے ہیں لوگ؟"

جس وقت دولت کمانے اور بہتر معیار زندگی کا جنون سر میں سماتا ہے، اس وقت
ان مسائل سے آگہی نہیں ہوتی یا یوں کہہ لو کہ آدمی ان کے متعلق سوچتا ہی نہیں۔"

"سوچ بیس بائیس برس بعد آتی ہے۔" سنبلہ نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے
ہوئے ماں سے کہا۔ ماں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ
اس وقت شکست خوردہ سی نظر آ رہی تھی۔

"مما آپ کو احساس ہوتا تھا نا کہ آپ نے ملک چھوڑ کر غلطی کی تھی؟" سنبلہ ڈرائیو
کرتے ہوئے بولی۔

"بہت ہوتا تھا۔ لیکن اب سعیدہ کو دیکھ کر تو زیادہ ہی ہو رہا ہے۔ ہم نے
سوائے بے پناہ دولت کے اور کیا پایا ہے وہاں بس کر ـــ اپنوں سے کٹ کر، جنے
ماحول سے بچھڑے لیکن وہ نہ بن سکے جو اس ماحول کا تقاضا تھا۔ ہماری ضرورتیں پو

پرابلم تو اپنے وطن ہی سے وابستہ تھے نا ـــ سعیدہ کو دیکھو ـــ تینوں بچوں سے فارغ
ہو چکی ہے۔ ہماری طرح اُس کے پاس بھلے دولت نہ ہو لیکن خوش باش ہے۔ میاں
بیوی سکون کی زندگی تو گزار رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں۔ میں۔" اس نے ایک گہری
سانس بھری ـــ سنبلہ قدرے بے چین ہوئی۔ پھر نارمل ہو کر گاڑی چلانے لگی۔ ماں
کی توجہ ان گھمبیر مسائل سے ہٹانے کے لیے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔

ناصرہ نے سیٹ کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ سنبلہ کی باتیں سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے وہ
سوچوں میں ڈوب گئی۔ برسوں پہلے کے واقعات متحرک فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر
اُترنے لگے۔

بی اے کرتے ہی اُس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ دو تین رشتے
ہاتھ میں تھے۔ لیکن امّی اور ابّا اعظم کو پسند کرتے تھے۔ اعظم سے رشتے داری تو نہ تھی
لیکن اس کے والدین سے ملنا جلنا تھا۔ دیکھے بھالے لوگ تھے۔ اسی لیے اُس کے حق
میں فیصلہ کیا تھا حالانکہ بڑے بھیّا نے اعتراض بھی کیا تھا۔

"جمال ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ خوبرو نوجوان ہے۔ تعلیم بھی اعظم سے زیادہ ہے
اور نوکری بھی اچھی ہے۔ پتہ نہیں، آپ لوگوں کو اعظم ہی کیوں من بھایا ہے۔ جمال کے
بارے میں پوچھ پڑتال کی جا سکتی ہے۔"

ابّا نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا تھا "ٹھیک ہے، اعظم کی تنخواہ جمال سے کم ہے
لیکن یہ لوگ دیکھے بھالے ہیں۔ ان کی شرافت مسلّم ہے۔ اعظم خود بھی بہت ٹھہرا ہوا
سُلجھا ہوا لڑکا ہے، جمال کی طرح خوبصورت نہ سہی لیکن بدصورت بھی نہیں۔ ناصرہ کے
لیے اعظم کا رشتہ ہی ٹھیک ہے۔"

بھیّا چپ ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے، ابّا کے فیصلے اور اُن کی عقل پر انھوں نے
دل ہی دل میں ماتم بھی کیا ہو ـــ لیکن بزرگوں کے سامنے تب زبان چلانے کا دستور

نہیں تھا۔ اس لیے بڑے بھیّا کچھ کہنا چاہتے بھی تھے تو کہہ نہ سکے۔

”جانچ پڑتال اپنی تسلی کے لیے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ باقی یہ قسمت کے پھیر ہو
ہیں۔ اور پھر روپیہ پیسہ تو قسمت میں ہو تو مل ہی جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دل کہاں
رشتہ کرنے کو مان رہا ہے۔“

”جیسے آپ کی مرضی آباجی —“ بھیّا نے سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے
یہ بات کہہ دی تھی۔ اباجی نے رشتے کی بات طے کر دی۔ اور شادی کی تیاریاں ہونے
لگیں۔ امّی جہیز بنانے میں مصروف ہوگئیں۔ ناصرہ بھی خوشی خوشی امی کا ہاتھ بٹانے لگی
وہ ایک ہی بھی تھی نا۔ اس لیے جہیز امّی نے حیثیت سے بڑھ کر ہی دیا۔

ناصرہ، اعظم کے گھر میں دلہن بن کر اُتری تو جیسے اِس چھوٹے سے گھر میں بہار
کا نزول ہوگیا۔ ماں بیٹا چاند سی دلہن دیکھ کر نہال ہوگئے۔ جہیز سے گھر بھر گیا۔ گلی محلے
میں اعظم اور اُس کی ماں کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ ناصرہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اعظم
نے اُسے ٹوٹ کر چاہا۔ محبتوں کی حسین پھوار نے ناصرہ کا تن من بھگو دیا۔

دن پَر لگا کر اڑتے چلے گئے۔ چاہتوں کی رُت بدلی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے
دیوانے بن گئے۔

”ناصرہ“ اعظم سرشار سے لہجے میں کہتا۔

”جی“ وہ مخمور انداز میں جواب دیتی۔

”اگر تم نہ ملتیں — تو —“

”کیسے نہ ملتی۔ ہمارا بندھن تو آسمان پہ بندھ چکا تھا۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہے۔ جو تم جیسی شریکِ حیات مل گئی۔ زندگی کا سفر کٹھن ہے
لیکن ہم دونوں ساتھ ساتھ سفر کی منزلیں طے کریں گے تو ساری کٹھنائیاں مٹ
جائیں گی۔“

”راہگزر پھولوں سے ڈھکی ملے گی اعظم۔ ہم ہنستے مسکراتے مہکتے ہوئے راستوں سے
گزر جائیں گے۔“

”تم ہمیشہ میرا ساتھ دو گی نا؟“

”یہ ساتھ ہمیشگی کے لیے بندھا ہے تم سے اعظم۔ میری دنیا میرا جہان میری
خوشیاں میرے غم۔ سب تمہی ہو۔ تم ہی ہو۔“

”ناصرہ — میری جان، میری روح، میری زندگی۔“

”ہمیشہ ایسا ہی سمجھو گے نا؟“

”جب تک سانس کی ڈوری بندھی ہے۔ میرے احساسات اور جذبات ایسے
ہی رہیں گے ناصرہ۔“

دونوں مسحور و مخمور ہو جاتے۔

اعظم واقعی انتہائی شریف اور سلجھا ہوا آدمی تھا — مالی لحاظ سے وہ بہت بلند
نہیں تھا لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ جدّ و جہد کرنا جانتا تھا۔ ایک خوبصورت
پُرآسائش زندگی کے تصوّرات اُس کے ذہن میں بھی تھے۔ اور جب سے ناصرہ ملی تھی
یہ تصوّرات کچھ زیادہ ہی حسین و رنگین ہوگئے تھے۔ انہیں پانے کے لیے وہ سنجیدگی
سے سوچ بچار کرنے لگا تھا۔ اس بارے میں وہ ناصرہ سے بھی صلاح مشورے
کرتا رہتا۔

”ناصرہ“

”ہوں“

”میری تنخواہ کم پڑتی ہے نا۔ سوچتا ہوں یہ نوکری چھوڑ دوں۔“

”نوکری چھوڑ کر کیا کرو گے؟“

”کوئی اور تلاش کروں گا۔“

”پہلے تلاش کر لو پھر چھوڑنا۔ یہ نہ ہو اتنی تنخواہ سے بھی جائیں۔“

”ناصرہ، تم [illegible]“

"مثلاً؟"

"ایک محل نما گھر بنانا چاہتا ہوں۔ اُس میں آسودگی اور آسائش کی ساری چیزیں سارے لوازمات اکٹھے کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے، اِس گھر میں تم شہزادیوں جیسی آن بان کے ساتھ رہو۔"

وہ اُس کی بات پر کھل کھلا کر ہنس پڑتی ——— پھر کہتی "اعظم ——— میں تمہارے پیار کی حسین دُنیا کی شہزادی ہی تو ہوں جسے من کی دولت مل جائے اُسے اور کیا چاہیے اعظم ———"

"نہیں ناصرہ۔ دنیا میں رہنے کے لیے اور چیزوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تو ہم دو ہیں۔ دو سے تین ہوں گے۔ چار پانچ چھ ہوں گے تو ———"

"بس بس ——— چھ سے سات اور سات سے آٹھ ——— یوں لائن لگانے کا مت سوچو۔"

"لیکن یہ ہے تو حقیقت ———"

"جو ابھی دُور ہے۔"

"ہمیں اس کا سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیئے۔"

"اچھا بابا ——— جو جی چاہے کرو۔"

"یہ ہوئی نا بات۔"

اعظم، ناصرہ سے حوصلہ افزائی پا کر تگ و دو میں لگ جاتا۔ لیکن اُسے اچھی نوکری نہ ملی۔ ایک شام وہ گھر آیا تو ناصرہ سے کہا "میرا ایک دوست ویزے لے کر آیا ہے۔ میں ایک ویزا خرید نہ لوں ———"

"باہر جانے کے لیے؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"ہاں۔ باہر جا کر ہی قسمت آزمائی کروں۔ جو بھی باہر گیا ہے دن پھر گئے ہیں اُس کے۔ جتنی محنت یہاں کر رہا ہوں۔ باہر جا کر کروں تو اس سے کہیں زیادہ پیسہ ملے گا۔"

"لیکن ———"

"کیا؟"

"میں تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔"

"یہ کیسے سوچا تم نے۔ میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں کیا؟ جہاں میں جاؤں گا تم بھی جاؤ گی۔"

ناصرہ نے مطمئن ہو کر اعظم سے کہا "اگر تم باہر جانے میں بہتری سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ آزما دیکھتے ہیں قسمت کو۔"

"تو پھر میں لے لوں ویزا ———؟"

"میں نے کہا نا۔ بہتری سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن یہ ذہن نشین کر لو۔ جہاں بھی جاؤ گے میں ساتھ جاؤں گی۔"

اعظم مسکرا کر بولا ——— "تم تو میری روح ہو۔ روح کے بغیر جسم کی کیا حیثیت؟"

ناصرہ خوش ہو گئی۔

اعظم سنجیدگی سے باہر جانے کی سوچنے لگا ——— ویزا ملنا مشکل نہ تھا ——— پیسے باہر جا کر کما کر لوٹائے جا سکتے تھے۔

اعظم کا آبائی پیشہ ہیرے تراشنے کا تھا۔ اس فن کو اُس کے آباؤ اجداد نے بڑے عروج پر پہنچایا تھا۔ اس کے دادا ہیرا تراشنے کے ماہر تھے۔ اس کے باپ نے بھی کافی عرصے یہ کام جاری رکھا تھا۔ اور اعظم کی تربیت بھی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اعظم اب بھی نگینے اور موتی تراشنے کی فیکٹری میں کام کرتا تھا لیکن محنتانہ بہت کم تھا۔ اعظم کے اس دوست نے اسے باہر جا کر اس فن میں ٹریننگ لینے اور جلا بخشنے کی صلاح دی تھی۔ باہر جا کر وہ کہیں بھی نوکری کر کے اپنے اس فن میں مہارت حاصل کر سکتا تھا۔

اس نے تھوڑی سی جمع پونجی جو پاس تھی، وہ تیاری پر صرف کی۔ ویزے کی آدھی رقم دے کر آدھی اُدھار کی ——— ویزا کویت کا تھا۔ اعظم کو یہ جگہ مناسب لگی۔ یہاں وہ

اپنی فنکارانہ صلاحیتیں بروئے کار لا سکتا تھا۔ اس نے پلان بنا لیا۔ کچھ عرصہ نوکری کر
روپیہ کمانا تھا۔ پھر ٹریننگ کے لیے اُسے دنیا کے جس ملک میں بھی جانا پڑتا، اُس نے
آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ ناصرہ بھی راضی بہ رضا تھی۔

"کچھ عرصہ تنگی ترشی سے نباہ کرنا پڑا تو کر لو گی نا ـــــ" اُس نے ناصرہ سے کہا۔

"تمہارے ساتھ ہر راہ گزر سے گزر جاؤں گی ـــــ"

اعظم کویت چلا گیا۔ ناصرہ کو تین چار ماہ اُس سے الگ ہو کر جینا پڑا۔ جدائی کی
کیفیت سے دوچار ہو کر ہی دونوں کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کیا معنی
حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن یہ تکلیف انھوں نے ایک سہانے خواب کو پانے کے لیے کاٹی تھی۔ اعظم
کو کویت میں ایک بڑے جوہری کے ہاں ملازمت مل گئی۔ خوش بختی ساتھ دینے پر تلی تھی۔ را
خود بخود بنتے گئے۔ اعظم نے دن رات محنت کی اور اس کا پھل بھی ملا۔ تنخواہ دگنی ملنے
لگی۔ گھر بھی مل گیا۔ اب وہ اور ناصرہ زندگی کی شادابیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
فراغت اور خوشحالی تھی۔ اعظم اب بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھا۔ نئی جہتیں
کرنے میں لگا تھا۔ سنبلہ کویت ہی میں پیدا ہوئی۔ دونوں بہت ہی خوش تھے۔

"ہماری بچی بہت ہی بخت آور ہے۔"

"ہماری خوش بختی کی علامت ہے۔"

سنبلہ کے پیدا ہوتے ہی اعظم کی تنخواہ میں گرانقدر اضافہ ہوا تھا۔ اور اُس کے
مالک نے خود ہی اُسے جاپان بھیجنے کی پیشکش کی تھی۔ کٹنگ کی ٹریننگ لینے کے علاوہ
پرل کلچر کرنے کے متعلق بھی اُسے معلومات حاصل کرنا تھیں۔

جب عزم و ہمت جوان اور قسمت کی دیوی مہربان ہو تو منزلیں خود بخود سامنے
آ جاتی ہیں اور ترقی کی راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ چار پانچ سالوں میں اعظم اپنے فن میں ماہر

ہو چکا تھا۔

سنبلہ کے بعد نملہ اور نملہ دو سال کی تھی کہ ناظم پیدا ہوا۔ ناصرہ کو سب کچھ مل گیا
تھا۔ اولاد بھی اور دولت بھی۔ لیکن اعظم ابھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھنا
چاہتا تھا۔ تلاش جاری تھی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس منزل کو پانے کی جستجو میں تھا۔ جو اُس کے
ذہن میں نشان زدہ تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ اعظم نے مڈل ایسٹ کے ملکوں کو خیرباد کہا۔ اور یورپی ممالک
میں قسمت آزمائی کی۔ جرمنی میں کچھ عرصہ گزارا۔ اٹلی میں رہا۔ ناروے میں کچھ دن رہا۔ پھر
ہالینڈ چلا آیا۔ یہاں کچھ عرصہ اس نے نوکری کی۔ اُس کے ساتھ اپنا ذاتی کاروبار شروع
کیا ـــــ ہیرے کی تراش خراش کے لیے یہ جگہ سودمند تھی۔ قسمت یاور تھی ـــــ اُس
کا کام پھیلتا چلا گیا ـــــ یہیں اُس نے قدم جما لیے۔ ویسے بھی اب ایک جگہ قیام ضروری
تھا۔ سنبلہ اور نملہ کی پڑھائی شروع تھی۔ ناظم بھی چار سال کا ہو چکا تھا۔ اور رملہ بھی فیملی
میں اضافے کا باعث بنی تھی۔

ناصرہ اب چار بچوں کی ذمے دار ماں تھی۔ وہ ان بچوں میں بٹ چکی تھی۔ عورت کوکھ
میں بٹتی ہے، تقسیم ہوتی ہے اور جب بٹ جاتی ہے، تقسیم ہو جاتی ہے تو اس کا اپنا
آپ رہتا ہی کہاں ہے۔ اپنی شناخت کھو کر وہ اُن سے پہچانی جاتی ہے۔ جن میں بٹتی
اور تقسیم ہوتی ہے ـــــ

اعظم بے انتہا دولت کما رہا تھا۔ اُس کے سہانے خواب ایک ایک کر کے پورے
ہو رہے تھے۔ بیوی اور بچے اس کی زندگی کا حسین حاصل تھے۔ بے پناہ دولت نے
اس کے کردار کو کسی بُرے رُخ کی طرف نہیں موڑا تھا۔ وہ اب بھی اتنا ہی شریف، اتنا
ہی سُلجھا ہوا انسان تھا جتنا ہمیشہ سے تھا۔

جس دن اعظم نے وہ خوبصورت محل نما سجا سجایا گھر خرید لیا تھا اور اُس کی چابیاں ناصرہ

کودی تھیں، وہ اُس کی زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔

"یہ گھر تمہارا ہے، تمہارے نام خریدا ہے میں نے۔ میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہے۔ ناصرہ میں آج بہت خوش ہوں۔"

"خدا ہماری خوشیاں ہمیشہ برقرار رکھے۔"

"آمین۔"

اپنے نئے گھر میں آکر ناصرہ، اعظم اور بچے سب بہت خوش تھے۔

"اعظم۔" ایک دن ناصرہ نے اپنے خوبصورت بیڈ پر اُس کے پہلو میں لیٹے لیٹے کہا۔

"ہوں۔"

"ایک بات کہوں مانو گے؟"

"ضرور۔"

"میری خواہش ہے کہ ہم ایک گھر لاہور میں بھی اپنے لیے خرید لیں۔"

"لاہور میں ——؟"

"ہاں۔ کسی اچھے سے علاقے میں۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس لیے کہ جب کبھی بھی پاکستان کا چکر لگے۔ ہم اپنے گھر میں جاکر رہیں۔"

"تیسرے چوتھے سال پاکستان جانا ہوتا ہے —— اس کے لیے گھر خریدنا....؟"

"تم نہیں جانتے۔ اپنا گھر وہاں بھی ہونا چاہیے —— ہم یہاں رہیں۔ جب بھی ہماری جڑیں تو وہاں کی مٹی میں ہیں نا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم پھل پھول تو یہاں رہے ہیں۔ جڑیں وہاں ہیں تو رہیں۔"

"تم نہیں جانتے کہا ہے نا میں نے۔ ہماری بیٹیاں ہیں۔ ہمیں ایک نہ ایک دن اپنے وطن جانا ہی ہے۔ یہ بڑی ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے، اس معاشرے میں پنپ نہیں

سکتیں —— ان کی شادیاں کرنا ہیں۔"

اعظم ہنس پڑا —— "حد ہو گئی۔ ابھی سے تمہیں ان کی شادی کی فکر پڑ گئی۔ ابھی تو ان کا بچپنا بھی نہیں گیا۔"

"آج چھوٹی ہیں کل بڑی ہو جائیں گی۔ ان کے مستقبل کا ابھی سے سوچنا ہے۔"

"وہ تو سوچ رہے ہیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو اپنا مشرقی ماحول ہی دیا ہے۔ پاکستانی طریق سے پال رہی ہوں انہیں —— وہ اپنی زبان بولتی ہیں —— اپنے....."

"اس کے باوجود بھی یہاں کا ماحول اُن پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ جس معاشرے میں وہ رہ رہی ہیں۔ ان سب..... باتوں کے باوجود اس کا اثر بھی قبول کریں گی۔"

"یہ تو ہے۔"

"یہ معمولی بات نہیں اعظم۔ اس سے ہمارے لیے کئی مسائل پیدا ہوں گے۔"

"سب سے نمٹ لیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

"نمٹنے ہی کا تو بندوبست کرنا چاہتی ہوں۔"

"یعنی؟"

"لاہور میں ایک کوٹھی خرید لو۔"

"خرید لو —— خالی رکھنے کے لیے۔"

"بھئی، وہاں چوکیدار رکھ لیں گے۔"

"پھر ——؟"

"پھر یہ کہ ہم ہر سال وہاں جایا کریں گے۔ چھٹیاں بچے وہاں گزارا کریں گے۔ اس طرح وہ اس ماحول کے زیادہ قریب رہیں گے۔ اجنبی نہیں ہوگا پاکستانی ماحول بچوں کے لیے۔"

"بالکل ٹھیک ——"

"تو پھر لکھ دو دن بڑے بھیا کو ——— گلبرگ میں ہمارے لیے کوٹھی خرید لیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"میری مرضی نہیں اعظم ——— یہ ہماری ضرورت ہے۔"

"اچھی بات ہے۔"

ناصرہ نے دوسرے دن ہی بڑے بھیا کو اپنی پسند کی کوٹھی خریدنے کا لکھ دیا۔

بھیا نے ایک شاندار اور خوبصورت کوٹھی ان کے لیے خرید لی۔ ضروری سامان بھی ڈلوا دیا۔ روپے پیسے کی کمی تھی نہیں، اس لیے ہر چیز بڑھیا اور قیمتی خریدی گئی۔ سب کچھ کر کے انھوں نے کوٹھی کے لیے ایک ایماندار چوکیدار کا بندوبست بھی کر دیا۔

ناصرہ نے سکھ اور سکون کا سانس لیا۔ اپنے طور اُس نے ایک بہت بڑے مسئلے کو حل کر لیا تھا۔ لیکن اس منصوبے کے مطابق ہر سال پاکستان نہ جایا جا سکا۔ کچھ اعظم کی بے پناہ مصروفیات اور کچھ بچوں کی تعلیمی ضرورت ——— پہلے کی طرح تیسرے چوتھے سال ہی جانا ہو سکا۔ وہ بھی چار چھ ہفتے کے لیے۔ بچے بھی پاکستان سے زیادہ انگلینڈ فرانس اور امریکہ جا کر چھٹیاں گزارنا پسند کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ ناصرہ اور اعظم کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ دھن برس رہا تھا۔ کاروبار پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔ اتنا پھل رہا تھا کہ اعظم اکیلا سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

ناصرہ کو جہاں بے پناہ خوشی مل رہی تھی، وہاں پریشانی بھی ہو رہی تھی۔ اعظم کی ذمے داریوں اور کام کے پھیلاؤ سے وہ کسی وقت خوفزدہ سی ہو جاتی۔ اکثر اعظم سے کہتی

"اعظم۔ بہت بار ڈال لیے ہیں تم نے اپنے اوپر۔ فیکٹری کی مشینوں کی طرح ایک مشین بنتے جا رہے ہو۔ آرام بھی کیا کرو۔ صحت زیادہ کام سے متاثر ہو گی۔ اتنا پیسہ کا کیا کریں گے ہم۔ بہت ہے۔ بہت زیادہ۔

اعظم اس کی باتوں پر ہنس دیتا۔ "تو کیا چلتی گاڑی کو جام کر دوں۔ پگلی کام بڑھتا ہی جائے گا۔ یہ خدا کی دین ہے اور میری محنت۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن تم خود بھی تو ریسٹ لیا کرو۔ تمہارے دو منیجر ہیں۔"

"کام منیجروں پر نہیں چھوڑا جا سکتا ناصرہ۔ اور رہا ریسٹ۔ تو میرا ریسٹ یہی ہے۔ جب بھی بڑا آرڈر کسی بھی ملک سے آتا ہے تم نہیں جانتیں خوشی کی لہریں میری رگ رگ میں ہلکورے لینے لگتی ہیں ——— ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ میری صحت کیا پہلے سے اچھی نہیں؟"

"خدا نظرِ بد سے بچائے۔"

"ناصرہ تم ہی تو کہتی ہو کہ ہماری بچیاں ہیں۔ اُن کے مستقبل کا سوچنا ہے۔ اُن کی شادیاں پاکستان جا کر کرنا ہے اور وہاں کے رسم و رواج کے مطابق دھوم دھڑکا کرنے اور لمبا چوڑا جہیز دینے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔"

"وہ تو ہے۔"

"یہ تگ و دو انہی کے لیے تو کر رہا ہوں۔ میں نے ہر ایک بچی کا اکاؤنٹ کھول رکھا ہے۔ اور اُن کے حصے کا پرافٹ اُن کے اکاؤنٹ میں باقاعدگی سے جمع کراتا ہوں۔"

"پھر بھی۔" ناصرہ اُسے عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہتی۔ "اپنا خیال رکھا کرو ——"

"جب تک تم ہو میرا خیال رکھنے والی۔" اعظم پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہتا۔ "میں بالکل فٹ ہوں۔"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر سرشار ہو جاتے۔

اعظم کی امّی اچانک ہی بیمار ہوئیں اور فوت ہو گئیں۔ اعظم کو اطلاع ملی تو ظاہر ہے ماں کے بچھڑ جانے کا دکھ ہوا ——— وہ جو دو تین بار پاکستان آیا تھا تو محض ماں کی خاطر۔ انھیں اپنے ساتھ لے جانے کی بھی بہت دفعہ کوشش کی تھی لیکن امّی اپنی زمین سے

چھُٹ کر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں۔ اب وہ مر کر اپنی زمین ہی میں سما گئی تھیں۔ دکھ ناصرہ کو بھی بہت ہوا۔

"پاکستان جانے کی تیاری کرو اعظم ــــ" ناصرہ نے اطلاع ملنے کے دو تین دن بعد کہا۔

"اب کیا فائدہ جانے کا ــــ امی تو ہیں نہیں۔"

"اعظم۔ ہمارا جانا ضروری ہے۔ ماں کے ہم لوگ قریب نہ ہونے کی وجہ سے تیمارداری نہیں کر سکے۔ ان کا آخری دیدار بھی نہیں ہو سکا، اُن کی میّت کو کندھا بھی نہیں دیا جا سکا۔ اب وہاں جا کر اُن کے ماتم میں شریک تو ہونا چاہیئے۔"

"دکھ اور صدمہ جتنا مجھے ہوا ہے۔ وہاں کسی کو نہیں ہوا ہوگا۔ رسمی اور تکلّفاتی دکھ کا اظہار کس لیے ــــ"

"جانا ضروری ہے۔"

"تم چلی جاؤ۔ میں تو ایک دن کی فرصت بھی نہیں نکال سکتا۔"

"بُری بات ہے۔"

"ماں زندہ ہوتی۔ بیماری کی اطّلاع ملتی تو میں شاید سارے کام چھوڑ کر اُن کے قدموں میں جا بیٹھتا لیکن اب فضول ہے ــــ ہاں، تم بے شک کچھ دنوں کے لیے چلی جاؤ۔ لوگوں سے رابطہ رہے گا۔"

زیادہ بحث و تکرار فضول تھی۔ ناصرہ نے رختِ سفر باندھا اور پاکستان چلی آئی۔ یہاں ساس کی تعزیت کے لیے آنا ضروری تھا۔ اور بھی بہت سے کام تھے۔ نئی کوٹھی بھی دیکھنا تھی اور اس کا مناسب انتظام بھی کرنا تھا۔ اس کے علاوہ بیٹیوں کے متعلق بھی لوگوں کو بتانا تھا اور اُن کے رشتوں کے لیے بھی کچھ ابتدائی کارروائیاں کرنا تھیں۔

اُن کی دولت کے چرچے تو یہاں ہوتے تھے۔ رشتے دار عزیز و اقارب اکثر اُسی

حوالے سے ان کی باتیں کیا کرتے تھے لیکن اس دولت نے ناصرہ کے لیے جو مسائل کھڑے کیے تھے وہ یہ لوگ کم ہی جانتے تھے۔ نبیلہ اب بیس سال کی ہو رہی تھی۔ رملہ بھی اب چودہ سال کی جوان لڑکی تھی۔ انھیں پڑھا لکھا کر پال پوس کر جوان تو کیا تھا۔ اب اُن کی شادیاں کرنے کا سوچتی تھی۔

اس نے بڑے بھیا اور بھابی سے رشتوں کی بات کی۔

"کوشش کریں گے۔" بھیا نے کہا۔

بھابی بولیں۔ "ان کو بھی ساتھ لیتی آتیں تو ایک آدھ رشتہ نظر میں تھا۔ بنا لڑکی دیکھے لوگ رشتے کی ہامی کہاں بھرتے ہیں؟"

ناصرہ نے کہا "اگلے سال میں انہیں ساتھ لے کر آؤں گی۔ آپ کوشش تو کیجیئے گا بس پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لڑکے ہوں۔ دولت خدا نے ہمیں بہت دے رکھی ہے۔"

"دولت کے بل بوتے پر ہی رشتے ہوں گے۔" بھابی نے حقیقت بیان کی۔

"ہاں، میں جانتی ہوں بھابی ــــ میری بیٹیاں حسین نہیں ہیں۔ بس قبول صورت ہیں۔ لیکن تعلیم یافتہ بھی تو ہیں، تعلیم شخصیت کو کندن بنا دیتی ہے۔"

بھابی جہاں دیدہ عورت تھیں، بولیں۔ "ہمارے معاشرے میں ایسی چشم بینا ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ پر خیر لڑکیاں بدشکل تو نہیں، خاصی اسمارٹ ہیں۔ اور دولت مند بھی۔ رشتے مل جائیں گے۔ لیکن ناصرہ، میری بات مانو اگر یہاں رشتے کرنے ہیں، تو لڑکیوں کو لے کر یہاں کچھ عرصہ قیام کرو۔ لوگ باہر خاص کر یورپی ممالک میں پلنے والی لڑکیوں کو بھی اسی معیار پر پرکھتے ہیں۔"

ناصرہ بولی "کیا مطلب؟"

"بھئی ہمارے ذہنوں میں مغرب کی آزادی کی جو صورت نقش ہے۔ لوگ ان لڑکیوں کو بھی اسی معیار پر پرکھتے ہیں۔"

" لیکن میں نے اپنی بیٹیوں کو خالص پاکستانی انداز میں پالا پوسا ہے۔"

" اسی لیے تو میں کہتی ہوں۔ انھیں لے کر یہاں آجاؤ۔ لوگ انھیں دیکھیں، اُن کا بود و باش سے اندازہ کریں۔ ان کے طور و طریق سے متاثر ہوں۔"

ناصرہ بھی ہنسی ہنستے ہوئے بولی "تو گویا تین بیٹیوں کے لیے مجھے دو چار سال کے لیے یہاں رہنا ہوگا؟"

" تم خود سمجھ دار ہو۔ رشتے یہاں کرنے ہیں تو تمہیں یہاں قیام کرنا ہی پڑے گا۔ لڑکیاں بھی یہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو جذب کریں۔ مانا کہ تم نے انھیں اپنے ماحول کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھایا ہے۔ پھر بھی وہاں کا معاشرہ اور ماحول اُن کے ذہن پر ضرور اثر انداز ہوا ہوگا۔ ان کے تصورات انہی سانچوں میں ڈھلے ہوں گے۔"

ناصرہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا "یہ تو ہے۔"

" پھر سوچو نا" بھابی بولی ــــ " ان بچیوں کے افکار اور سوچ کو مکمل طور پر پاکستانی سانچوں میں ڈھالنے کی ضرورت تو ہے نا۔ وہ صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ بچیاں یہاں آکر رہیں۔ یہاں کے طور طریقوں کو اپنائیں۔ اس ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کریں۔ لوگوں سے ملیں اور اُنھی کی طرح بنیں ــــ تب اُن کے رشتے بھی یہاں ہو سکتے ہیں۔ اور شادیاں بھی کامیاب اسی صورت میں ہو سکتی ہیں ــــ یہ میری مخلصانہ رائے ہے۔"

" ٹھیک ہے" ناصرہ پریشان ہو گئی۔ بھیا نے پریشانی بھانپتے ہوئے تسلی دی۔ بولے " ناصرہ تمہارے لیے بچیوں کی شادی مسئلہ تو ہے لیکن فکر نہ کرو۔ یہ حل ہو جائے گا۔ ویسے تمہاری بھابی نے بھی تمہیں ٹھیک مشورہ دیا ہے۔"

" لیکن بھیا۔ ایک مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اعظم کا تو کاروبار جس طرح پھیل چکا ہے۔ وہ پاکستان آکر رہ نہیں سکتے۔"

" اُسے وہیں رہنے دو۔ تم بچیوں کو لے کر آجاؤ" بھابی بولیں۔

ناصرہ نے ہنس کر بھابی کو دیکھا اور بولی "میں مستقلاً یہاں آجاؤں اور اعظم وہاں اکیلا رہے؟"

" تم آتی جاتی رہنا۔"

" میری گھر گرہستی ہی وہاں ہے بھابی۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

" آرام اور سکون سے سوچو ــــ پھر فیصلہ کرنا ــــ بہر حال، ایک نہیں تین بیٹیاں ہیں تمہاری۔ اور میرا تجربہ اور مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ اگر ان کا مستقبل سنوارنا ہے تو تمہیں یہاں آکر رہنا پڑے گا۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑے تو سوچنا چاہیے کہ کھونے اور پانے میں کس کا پلڑا بھاری ہے۔"

ناصرہ چپ ہو گئی۔

اُس کے سامنے واقعی بہت سنگین مسئلہ کھڑا تھا۔

بھابی نے اُس کی پریشانی کو محسوس کیا تو ہمدردی سے بولیں " ناصرہ وہاں بھی تو پاکستانی لوگ ہوں گے۔ وہیں کوشش کر کے رشتے کرلو تو تمہارے اور بچیوں کے لیے کیا یہ بہتری نہیں ہوگی؟"

ناصرہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ــــ " ہالینڈ میں پاکستانی لوگ ہیں تو لیکن بہت کم۔ اور وہ بھی مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مجھے تو کہیں بھی اپنی بچیوں کا میچ نظر نہیں آیا۔"

" ہوں۔ پھر تو میری بات مانو۔ آجاؤ یہاں۔ تمہاری کوٹھی ہے اسے آباد کرو۔" بھابی بولیں۔ پھر ہنس کر کہا۔ یہاں رہو اپنی بے پناہ دولت کا مظاہرہ کرو۔ وہ تو جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا والی بات ہوئی۔"

ناصرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بھابی کو دیکھا۔

اور پھر سوچوں میں ڈوب گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ناصرہ نے اعظم سے بھی کیا۔ لیکن اعظم بولا "تمہاری بھابی کے نامعقول مشورے پر عمل نہیں ہو سکتا بیگم! کیا تم مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ ـــــ ظاہر ہے میں کاروبار سمیٹ کر نہیں سکتا مجھے یہیں رہنا ہے۔"

"یہی تو سوچ مجھے پریشان کرتی ہے۔"

"اس سوچ کا کیڑا ابھی دماغ سے نکال دو۔ رشتے بھی ہو ہی جائیں گے۔ بچیاں پڑھ رہی ہیں۔ فارغ ہو جائیں تو دیکھیں گے۔"

"سنبلہ بیس برس کی ہو چکی ہے۔"

"یہ عمر اُس کے ہنسنے کھیلنے کی ہے، پڑھنے لکھنے کی ہے۔"

"اپنے معاشرے کو نظر میں رکھ کر سوچو ـــــ بیس بائیس برس میں شادی ہو جانی چاہیئے۔"

"ہو جائے گی۔"

"کیسے؟ کب؟"

"اوہ ناصرہ۔ خدا کے لیے۔ میرے دماغ پر ان باتوں کا بوجھ نہیں ڈالو۔ خدا اچھا کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن ناصرہ ماں تھی۔ سمجھ دار ماں۔ حالات کا جائزہ لینا جانتی تھی۔ بچیوں کی ذمّے داریوں سے نبرد آزما کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔ لیکن مستقلاً رہنا تو ایک طرف اگلے سال وہ چھٹیوں میں پاکستان نہ آسکی۔ اُسے لندن لے گیا۔ وہ بچیوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لیے لندن چلی گئی۔ ایک کے لیے اعظم بھی ساتھ گیا۔

یہاں ناصرہ کے کچھ میل ملاپ کے لوگ تھے۔ وہ ان سے ملی، اپنی پرابلم

بھی گزارش ادا اچھے سے رشتے سنبلہ اور نملہ کے لیے بتانے کی اُن سے استدعا کی۔ لندن میں پاکستانی اور ہندوستانی لوگ بہت تھے وہاں لوگوں کو دوسرے غیر ملکوں میں بسنے والے لوگوں کی طرح اب زیادہ دقت نہ تھی۔ رشتے ناتے اکثر آپس ہی میں طے ہو جاتے تھے۔ ناصرہ پُرامید تھی۔ اس کی ایک دوست مسز نجمہ علی یہاں سوشل ورکر تھی۔ نجمہ نے دو تین رشتے ناصرہ کو بتائے۔ لڑکوں کے والدین سے بھی ملایا اور لڑکوں سے بھی سنبلہ نملہ اور اُس کی ملاقات کروائی۔ لیکن ناصرہ کو کچھ دل نہیں لگے یہ رشتے۔ سنبلہ کو تو تینوں لڑکوں میں سے ایک بھی پسند نہیں آیا۔ نملہ نے تیسرے لڑکے میں کچھ دلچسپی دکھائی لیکن اس لڑکے کے ماں باپ کی باتوں سے لالچ کی بُو ناصرہ نے سونگھ لی تھی اس لیے رشتہ مسترد کر دیا۔

نجمہ نے کہا "بھئی یہاں ہم لوگ اپنی پرابلمز کو دیکھتے ہوئے رشتے ناتے کر لیتے ہیں، تھوڑی بہت کمی ہو تو نظر انداز کرنا ہی پڑتی ہے۔ برس ہا برس دیارِ غیر میں رہنے والوں کے لیے اپنے وطن جا کر بھی اس مسئلے کو حل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بچے اس ماحول میں پل بڑھ کر دوسرے ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتے ـــــ یہاں کے ماحول میں پروردہ لڑکے اگر پاکستانی لڑکیوں سے شادی کر کے انھیں یہاں لے آتے ہیں تب بھی میاں بیوی کی صحیح ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو پاتی۔ عام شادیاں ناکام ہی ہوتی ہیں۔ یہاں کی پلی اور تربیت یافتہ لڑکی کا تو پاکستانی لڑکے سے شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔ وہ لڑکے ایسی لڑکیوں کو کسی دباؤ یا لالچ میں قبول تو کر لیتے ہیں لیکن نباہ نہیں کر سکتے۔ تربیت ماحول اور معاشروں کا فرق نباہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔"

نجمہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے تجربے کا نچوڑ تھا۔ یہ سچ بھی تھا۔ لیکن ناصرہ کو بچیوں کی طرف سے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ بھلے بالکل پاکستانی انداز میں نہ سہی۔ پھر بھی اُس نے گھر میں بچیوں کو جو ماحول دیا تھا وہ ان کی تربیت مشرقی انداز ہی میں کرتا رہا تھا ـــــ

لڑکیاں شخصی آزادی کی قائل تو تھیں لیکن ماں باپ کے فیصلوں پر سر جھکا دینے کی
قائل تھیں۔

لندن میں کوئی موزوں رشتہ نہیں ملا۔ نجمہ نے وعدہ کر لیا "کوشش کروں گی
تمہاری بچیوں کے لیے کوئی موزوں بر تلاش کروں۔ جب بھی کوئی ملا، تمہیں اطلاع
کر دوں گی۔"

وعدہ لے کر ناصرہ واپس آگئی۔

اُس کی پریشانی اب اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لندن میں جہاں کافی ہم وطن ہیں
اُس کا مسئلہ حل نہ ہو سکا تھا۔ تو یہاں ہالینڈ میں جہاں گنی چنی پاکستانی فیملیز تھیں
مسئلہ کیسے حل ہو سکتا تھا۔

ناصرہ سمجھ نہ پاتی تھی کہ کیا کرے۔ سنبلہ کی اکیسویں سالگرہ منائی جا چکی تھی۔
بیس برس کی ہو گئی تھی۔ ان دونوں بچیوں کے رشتے تو اب ہو جانے چاہییے تھے
بھابی کی تجویز اب ایک زندہ حقیقت کی طرح اُس کے ذہن میں ہلچل مچائے
اُسے پاکستان جانا چاہیئے۔ چند سال وہیں مستقلاً قیام کرنا چاہیے۔ یہ مسئلہ
طور حل ہو سکتا ہے —— اس کی ساری سوچ، سارے غور و فکر کا یہی نچوڑ
لیکن۔

اعظم کا کیا ہو گا اسے اکیلا رہنا پڑے گا، وہ تو ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔
اتنا پھیل چکا تھا کہ اُسے سمیٹ کر واپس وطن آنے کا سوچا نہیں جا سکتا تھا۔
کیا وہ اکیلا رہ لے گا؟

بچیوں کے مفاد کی خاطر قیدِ تنہائی برداشت کر لے گا۔

ایک شام جب وہ دونوں اپنے بیڈ روم کی بیرونی خوبصورت بالکنی میں بیٹھے
حدِ نگاہ تک پھیلے سرسبز اور پھولوں سے لدے میدانوں کو دیکھ رہے تھے۔ میدانوں

جھکے نیلے صاف و شفاف آسمان کو تک رہے تھے اور چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے
موسم کے حُسن کی باتیں کر رہے تھے۔ ناصرہ نے اچانک ہی رشتوں کی بات چھیڑ دی۔

"تمہارے دماغ میں یہی بات سمائی ہے۔" اعظم نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"تمہیں تو ذرّہ بھر فکر نہیں ——"

"فکر کرنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔"

"حل کے لیے سوچنا تو چاہیے۔"

"تو کہو کیا سوچا ہے ——"

"یہی کہ میں بچیوں کو پاکستان لے جاؤں۔ وہاں چند سال مستقلاً قیام کروں۔ لڑکیاں
اس ماحول سے مانوس ہو جائیں تاکہ اُن کی ازدواجی زندگیاں بہتر گزریں۔"

"تم مستقلاً وہاں رہنا چاہتی ہو ——؟"

"چند سال رہنا پڑے گا —— بچیوں کی شادیاں اس طرح نہیں ہو سکتیں —— جب
تک ہم لوگ وہاں نہیں رہیں گے۔ کوئی رشتہ نہیں ملے گا ——"

"چند سال وہاں رہو گی؟"

"ہاں۔ کم از کم چار پانچ سال۔ اس عرصے میں مجھے قوی اُمید ہے کہ تینوں بیٹیوں سے
فراغت پا لوں گی۔"

"اور میں کہاں رہوں گا ——؟"

"ظاہر ہے تم پاکستان نہیں جا سکتے۔ یہیں رہنا پڑے گا۔"

"اکیلے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔"

"پہلے اس کا حل سوچو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم اچھی طرح سے جانتی
ہو کہ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی کا محور تمہیں مانا ہے، سال ہا سال میں تم سے الگ رہ کر زندگی

نہیں گزار سکتا۔"

وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوئی۔ پھر آہستگی سے بولی ——— "پھر تم بھی تو ر
کہ کیا کیا جائے۔"

"میں بہت سوچ چکا۔"

"پھر ———؟"

"مجھے کوئی حل نہیں ملا ———"

"لیکن اس طرح مسئلہ تو نہیں ٹل سکتا۔ حل تلاش کرنا ہی ہے۔"

"جو بھی چاہو کرو۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ میں برس ہا برس اکیلا نہیں رہ سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں ناصرہ ——— میں اتنا مذہبی آدمی بھی نہیں ہوں کہ تارک الدنیا ہو جاؤں ——— اتنا بوڑھا بھی نہیں کہ دنیاوی زندگی کو تیاگ دوں ——— سمجھیں ——— اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ میں شرافت کی سیدھی راہ سے بھٹکنا بھی نہیں چاہتا۔"

ناصرہ کئی دن سوچتی رہی ——— حل اُس نے سوچ تو لیا ——— لیکن دماغ کا سوچ دل پر گرفت نہ کر پاتی تھی۔ خود ہی سوچتی۔ خود ہی گھبرا جاتی۔ حوصلہ نہ پڑتا۔ ہمت نہ ہوتی۔

لیکن ساری مشکلوں کا صرف یہی حل تھا

اُس دن اُس نے یہ حل اعظم کے سامنے رکھ ہی دیا۔

اعظم نے حیرت سے چیختے ہوئے کہا۔ "ناصرہ ——— تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ——— سمجھ بھی رہی ہو۔ کہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ چند لمحوں کے لیے مضطرب ہوئی لیکن ڈگمگائی نہیں۔ پوری ہمت اور عزم سے کہا۔ "ہاں اعظم۔ میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے اور تمہیں یہ فیصلہ منظور کرنا ہوگا۔"

"پاگل ہو گئی ہو ———"

"نہیں۔ میری سوچ مثبت ہے۔"

"میری شادی کر کے ......"

"اس کے سوا اور کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی اعظم ——— میرا پاکستان میں بچیوں کے مستقبل کے لیے رہنا ضروری ہے ——— اور تم کاروبار کے جھنجھٹ میں اس طرح پھنسے ہو کہ پاکستان جا کر میرے ساتھ رہ نہیں سکتے۔ یہاں بھی اکیلے رہنا ممکن نہیں۔ کیا حرج ہے، تم دوسری شادی کر لو۔ بیوی تمہاری ضرورت ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ———"

"لیکن ......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔"

"تم اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہو۔"

"نہیں اعظم ——— یہ ضرورت کا تقاضا ہے۔ باقی رہی کلہاڑی مارنے والی بات تو تمہاری اور بچوں کی خاطر یہ قربانی مجھے دینا ہی پڑے گی۔"

"تم مجھے شیئر کر لوگی کسی دوسری عورت کے ساتھ ———؟"

ناصرہ نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے سر ہولے سے ہلایا

"نہیں ناصرہ۔ میں ایسا نہیں کر سکتا ———"

"سوچو ———"

"یہ ظلم ہے۔"

"نہیں۔ یہ میں نے ہی فیصلہ کیا ہے۔"

"انگاروں میں جلنے کا۔"

"اعظم ——— کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا ہی پڑتا ہے۔ دوسروں کو سایہ اور ٹھنڈک دینے والا پیڑ کڑی دھوپ میں خود جلتا رہتا ہے۔"

"اوہ خدایا" اعظم نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اُٹھ کر کمرے سے چلا گیا
کئی ہفتے دونوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔
لیکن ناصرہ نے فیصلہ کرلیا تھا اور اس پر قائم تھی ——— اُسے یقین تھا کہ وہ اعظم کو بھی تیار کرلے گی۔ بچیوں کو اس نے پہلے اعتماد میں لے لیا تھا۔ بچیوں کی تو نہیں ہوتی تھی۔ روپیہ پیسہ ان کے ذاتی اکاؤنٹ میں کافی تھا ——— باپ کی محبت اور شفقت جتنی اُن کی تربیت اور ذہنی نشوونما کے لیے ضروری تھی پا چکی تھیں۔ ویسے بھی اتنا چاہنے والا باپ بدل تھوڑا ہی سکتا تھا۔ دوسری بیوی کے آجانے سے انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ شادی کے بعد اُن کی اپنی دنیائیں آباد ہو۔ ناتھیں۔ نہ اگر پڑتا تو صرف ناصرہ کو ——— لیکن وہ تو دھوپ میں جل کر دوسروں کو سایہ اور ٹھنڈک دینے والا پیڑ بننے کو ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرچکی تھی۔
ہفتوں کے بعد خاموشی ٹوٹی۔ تو بحث وتکرار کا سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ اعظم کسی طور یہ بات نہیں مان رہا تھا اور ناصرہ اس کے منہ سے ہاں کہلوانے پر تلی ہوئی تھی۔
دونوں میں اس بات پر تلخی بھی ہوئی۔ جھگڑا بھی ہوا۔ لیکن بچوں کا مفاد بھی دیکھنا تھا۔ اعظم کو جھکنا ہی پڑا۔
ناصرہ نے بالآخر اُسے منا ہی لیا۔ وہ خاموش ہوگیا تھا۔
ناصرہ پاکستان آنے کی تیاریاں کرنے لگی۔ وہاں جاتے ہی اُس کو سب سے پہلے اعظم کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کرنا تھا۔ یہ بات اُس نے اعظم سے کہہ دی تھی کہ وہ اپنی پسند کی کوئی مناسب لڑکی دیکھے گی۔
تینوں بیٹیاں اور ناصرہ جب اعظم سے جدا ہوئیں تو بڑا رقت انگیز سماں تھا۔ اعظم نے بچیوں کی پیشانیاں چومتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ماں نے اپنی ذات تمہارے مفاد پر قربان کردی ہے، اتنی عظیم، اتنی مخلص، اتنی قربانی دینے والی کوئی ماں، کوئی بیوی

نہیں ہوگی دنیا میں۔"
ناصرہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اعظم نے اُسے بازوؤں میں بھر کر کہا۔ "ناصرہ ——— میں ہمیشہ تمہارا رہا ہوں۔ ہمیشہ تمہارا رہوں گا، یہ دوسری عورت تمہاری جگہ کبھی نہ لے سکے گی۔"
"یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔" ناصرہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
ناصرہ اور بچیاں پاکستان آگئیں۔ نیا گھر آراستہ پیراستہ تھا۔ لیکن ہالینڈ کی رہائش گاہ جیسا تو نہیں تھا۔ بچیوں کو یہاں ایڈجسٹ ہونے میں ابھی وقت لگنا ہی تھا۔
ناصرہ بھابی کی پیش کردہ تجویز پر ہی عمل پیرا ہوئی تھی، اس لیے جب بھابی اُس سے ملنے آئیں تو اس نے مسکرا کر کہا ——— "لیجیے جناب ہم تو کشتیاں جلا آئے ہیں۔ اب کیجئے ان سب کا بندوبست۔" اس نے تینوں بیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔
"کشتیاں جلا کیوں آئے ہو جناب۔ یہ کہو کہ ساحل پہ آن لگے ہو ———" بھابی نے مسکرا کر کہا۔ "انشاءاللہ جس کام کے لیے آئی ہو۔ وہ ہوجائے گا۔
ناصرہ اور وہ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ پھر ناصرہ نے بھابی سے کہا۔ "پہلے تو اعظم کے لیے کوئی لڑکی بتائیں۔"
"اعظم کے لیے ———؟" بھابی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تو ناصرہ نے سارا پلان اُن کے سامنے رکھ دیا۔
بھابی سُن کر بھی متعجب تھیں۔
"اور کوئی چارہ نہیں تھا بھابی ———"
"لیکن ......"
"بھابی ——— جب سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کرلیا جائے تو لیکن کی گنجائش نہیں رہتی۔ میں نے تینوں بیٹیوں کی شادیاں کرنا ہیں۔ رملہ ابھی سولہ سال کی ہے، ظاہر

ہے اس کی شادی میں چار پانچ سال لگ جائیں گے۔ یہ چار پانچ سال میں نے یہاں گزارنے ہیں۔ اعظم اکیلا کیسے رہ سکتا ہے وہاں۔ بھابی وہ شریف آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اپنی راہ سے بھٹک کر اِدھر اُدھر منہ مارتا پھرے۔"

"ہوں ـــــ"

"وہ وہاں کے آزاد معاشرے میں رہ رہا ہے۔ عورت حاصل کرنا وہاں کوئی مسئلہ نہیں، وہ بجائے اس کے کہ وہاں بے راہ روی کا شکار ہو جائے یا کوئی غیر ملکی عورت بیاہ کر گھر لے آئے یہ اچھا نہیں ہوگا کہ میں اپنی مرضی کی کوئی عورت اُس کے لیے منتخب کر دوں ـــــ اعظم کی دولت پر عیش کرنا ہی ہے تو کوئی غیر ملکی کیوں ـــــ اپنی ہم وطن کیوں نہ کرے۔" وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ بھابی قائل ہونے کے باوجود حیرانی سے اُسے تکے جا رہی تھیں۔

"ہے کوئی آپ کی نظر میں رشتہ ـــــ اتنی کم عمر بھی نہ ہو۔ اعظم چھیالیس سال کا ہو چکا ہے۔"

"عورت بھی کم از کم ۳۵-۳۶ سال کی ہونا چاہیئے۔"

دونوں باتیں کرتی رہیں۔ بھابی کی نظر میں دو ایک لیکچرر تھیں۔ جن کی عمریں شادی کے انتظار میں گزری جا رہی تھیں۔ اس صورت حال میں کسی ایک کا انتخاب اچھا تھا۔

ناصرہ، ریحانہ امجد سے بھی ملی اور عاصمہ ملک سے بھی۔ دونوں کی عمریں تیس سے تجاوز کر رہی تھیں۔ ریحانہ، عاصمہ سے زیادہ اسمارٹ تھی۔ لیکن ناصرہ نے عاصمہ کو پسند کیا۔ یہ ریحانہ کے مقابلے میں اُسے سیدھی سادی لگی۔

لیکن یہاں بات طے نہ ہو سکی۔ عاصمہ کے والدین نے کچھ ایسی شرائط بھی رکھیں جو ناصرہ کے لیے قابل قبول نہ تھیں ـــــ ویسے بھی اُسے اپنی دوست سعیدہ کی ۳۵ سالہ کزن جو ایک اچھی صورت و سیرت کی عورت تھی پسند آئی تھی۔ اُسے ناصرہ نے سعیدہ

کے ہاں دیکھا تھا۔ سعیدہ نے اُسے بتایا تھا کہ عذرا کی طلاق اس وجہ سے ہوگئی تھی کہ اُس کے بچے نہیں ہو سکتے تھے۔

ناصرہ کو اپنے حالات میں یہ عورت فٹ ہوتی نظر آئی تھی۔ اعظم کی دوسری شادی کے متعلق جب بھی وہ سوچتی تھی۔ یہ بات پریشان کرتی تھی کہ دوسری بیوی سے اولاد ہونے کی صورت میں وہ بٹ جائے گا۔

عذرا سے ناصرہ کافی دیر باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ اُسے سلجھی ہوئی اچھے مزاج کی عورت لگی تھی۔ ناصرہ نے اسے اعظم کی زوجیت میں دے دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے سعیدہ سے پوچھا تھا۔ "عذرا کی دوبارہ شادی کیوں نہیں کی ـــــ" تو اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا تھا ـــــ "ایسی مطلقہ جس کی اولاد بھی نہ ہو سکتی ہو ـــــ کون شادی کرے گا ـــــ"

"ویسے کوئی دستِ طلب دراز کرے تو عذرا قبول کر لے گی؟"

"کیوں نہیں، بے چاری کا باپ ہے نہ ماں ـــــ بھائیوں کے سر پڑی ہے۔ ہاتھ میں کوئی ڈگری بھی نہیں کہ نوکری کر لے۔ بے چاری کی ایف اے ہی میں شادی ہوگئی تھی۔ سات سال بعد طلاق ہوگئی۔"

ناصرہ نے سعیدہ سے بھی عذرا کے بارے میں پوری تسلی کی۔ بلاشبہ عذرا ایک صاحب کردار عورت تھی۔

ناصرہ نے اُسے پسند کر لیا۔

اور آج جب سعیدہ اُس سے ملنے آئی تو اُس نے اظہارِ مدعا کر دیا۔

سعیدہ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی ـــــ اس کا حیرت و استعجاب درست تھا۔ وہ تو باور ہی نہ کر رہی تھی کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ ناصرہ ہی نے کہا ہے۔

لیکن

ناصرہ نے اُسے ساری باتیں بتادیں۔ اُسے دلائل سے قائل کرلیا۔

اور پھر ناصرہ اور سعیدہ کی مشترکہ کاوشوں سے عذرا اور اعظم کا نکاح ہوگیا۔ نکاح فون پر ہی ہوا۔ اعظم پاکستان نہیں آیا۔ عدیم الفرصتی بہانہ تھی۔ وہ تو ایثار و خلوص کی دیوی ناصرہ کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

چند ماہ بعد ویزا آگیا اور عذرا ہالینڈ چلی گئی۔

ناصرہ کاروبارِ حیات نمٹانے میں لگ گئی۔

کبھی کبھی پہلو میں درد سا اُٹھتا ضرور ——— سوچوں سے گھبراہٹ بھی ہوتی۔ اعظم اور عذرا کی متوقع ازدواجی زندگی کے متعلق سوچتی بھی۔ لیکن جو مرحلہ اُس نے سر کرنے کے لیے دکھ کے پہاڑ تلے سر دیا تھا۔ وہ بھی ضروری تھا۔ وہ بچیوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے تگ و دو کرنے لگی۔

ناصرہ کسی وقت تو بے طرح گھبرا جاتی۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر بھی وہ اپنا مقصد نہ پاسکی تو ——— کیا ہوگا؟

پورے ڈیڑھ سال بعد وہ سنبلہ کے لیے اپنی مرضی کا رشتہ حاصل کرپائی۔ نوید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے کا خواہشمند تھا۔ ناصرہ کے لیے یہ خواہش پوری کرنا مشکل نہیں تھا۔ دونوں طرف سے پسندیدگی کا اظہار ہوگیا۔ سنبلہ خود بھی امریکہ جانے کی خواہشمند تھی۔ شادی ہوگئی۔

عذرا اور اعظم بھی ہالینڈ سے آگئے۔ اعظم نے جس محبت اور گرمجوشی کا اظہار ناصرہ سے کیا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔ وہ اب بھی اعظم کے لیے وہی تھی۔ جو ہمیشہ تھی۔ عذرا کے ہوتے ہوئے بھی اعظم تنہائی کے کرب سے آشنا ہوا تھا۔

دو سال بعد نملا کا معاملہ بھی نپٹ گیا۔ ثمین متوسط گھرانے کا خوبرو اسمارٹ نوجوان تھا۔ کوئی اچھی جاب نہیں تھی۔ ان دنوں۔ لیکن ایم بی اے کیا ہوا تھا۔ اچھی جاب کی تلاش تھی، ملنے کا یقین بھی تھا۔ جدوجہد کرنے اور ہمت نہ ہارنے والا نوجوان تھا۔

اعظم اور عذرا اس شادی میں شریک ہوئے۔ اعظم نے ثمین کو ہالینڈ آنے کی دعوت دی اور اپنی ہی فیکٹری میں بہت اچھی جاب کی آفر کی۔

اسے اور کیا چاہیے تھا۔ نملا بھی خوش ہوگئی۔

ناصرہ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ وہ بخیر و خوبی دو بڑے فریضوں سے سبکدوش ہوگئی تھی۔

اس دفعہ اعظم بھی چند دن ہی یہاں ٹھہرا۔ وہاں کام بہت تھا۔ ناصرہ بھی جانتی تھی۔ اس لیے ہنستے مسکراتے اسے رخصت کیا۔ ہاں اس دفعہ اس نے کچھ خلش سی ضرور محسوس کی۔ اعظم اس دفعہ پچھلی دفعہ کی طرح تنہائیوں کا مارا نہیں تھا۔ عذرا پر ہر کام کے لیے انحصار کر رہا تھا۔ عذرا جو اس ماحول میں جاکر تر و تازہ صحت مند اور پہلے سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دینے لگی تھی۔

ناصرہ اندر سے کچھ بجھ تو گئی۔ لیکن اس کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں اسے اب رملہ کا معاملہ نپٹانا تھا۔ خلافِ توقع رملہ کی بات نملہ کی شادی کے چھ ماہ بعد ہی طے پاگئی۔ بھائی نے اپنے بھتیجے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ اونچا لمبا اسمارٹ سا وقاص آرمی میں کیپٹن تھا۔ گھرانا اچھا اور دیکھا بھالا تھا۔ ناصرہ بھی جلدی اس فرض سے سبکدوش ہوجانا چاہتی تھی۔ اب اُسے اپنا گھر اور اعظم بہت یاد آتے تھے۔ وہ واپس جاکر اپنا مقام پانا چاہتی تھی جس سے بچیوں کی خاطر الگ ہوئی تھی۔

رملا کی شادی بھی بڑے اہتمام اور شان سے ہوئی۔ اس شادی میں اعظم شریک نہیں ہوسکا۔ وہ اپنے کام ہی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا تھا ——— فون پر اُس نے ناصرہ اور رملہ سے دو تین دفعہ بات کی۔ رملہ کو دکھ تو تھا۔ لیکن اعظم نے وعدہ کیا "تم دونوں کو ہالینڈ آنے کے ٹکٹ میں واپس آتے ہی بھجوا دوں گا ——— میں نہیں آسکا تم دونوں آکر مل جانا۔"

رملہ خوش ہوگئی۔

ناصرہ اب فارغ ہو چکی تھی۔ چار سوا چار سال کی تپسیا کی تھی۔ خدا نے بڑا
سے سرخرو کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اب وہ واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھی
اگلے ماہ وہ واپس ہالینڈ پہنچ گئی۔ عذرا اور اعظم نے اس کا خوشگوار انداز
استقبال کیا۔

انداز خوشگوار ہی تھا۔

لیکن اس میں کہیں جھول ضرور تھا۔ کیونکہ اس کی خوشگواری ناصرہ کے من کو سکو
اور طمانیت کی پھوار میں نہ بھگو سکی۔ اعظم کے رویے میں پہلی سی گرمجوشی اور شدت
جو نہیں تھی۔

ناصرہ کا دل دکھا ضرور ـــ لیکن اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو تھا ہی۔

وہ برداشت کر گئی۔ اسے برداشت کرنا ہی تھا ـــ اس لیے کہ وہ ایک ایسا پیڑ
بن چکی تھی جو دوسروں کو سایہ ـــ اور ٹھنڈک فراہم کرنے کے لیے خود کڑی دھوپ
میں جلتا رہتا ہے۔

سنگ دل

وہ لان میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ان بچوں میں ساتھ والی
کوٹھیوں سے آئے ہوئے دس دس بارہ بارہ سال کے بچے بھی تھے اور نوکر گھروں میں
رہنے والے خانساماؤں اور مالیوں کے چار چار پانچ پانچ سال کے لڑکے لڑکیاں بھی ـــ یہ
سب حنا کے اچھے دوست اور ساتھی تھے۔ کالج سے آ کر وہ ان سب کو اکٹھا کر لیتی۔
کبھی لکن میٹی کھیلتی ـــ کبھی کرکٹ اور کبھی فٹ بال۔ سب بچے بھی اس سے مانوس
ہو چکے تھے۔ کبھی اسے کالج کا کام کرنا ہوتا یا کوئی اور مصروفیت ہوتی اور وہ ان کو کھیلنے
کے لیے نہ بلا سکتی ـــ تو سب خود ہی آ جاتے ـــ اکٹھے ہلا بول دیتے۔

”بجیا آؤ نا ـــ“

”آپی آج کھیلیں گی نہیں ـــ“

”حنا باجی آج کیا ہو گیا چلیں نا، کھیلیں“

بچوں کے اصرار اور پیار کے سامنے وہ سارے کام پس پشت ڈال کر اٹھ کھڑی ہوتی۔
”چلو آؤ پہلے کھیل لیں ـــ پھر ہوم ورک کریں گے ـــ ٹھیک نا؟“
”ٹھیک“ سب خوشی سے نعرہ لگاتے ـــ اور وہ بچوں کے جلوس میں کمرے سے
نکل کر لان میں آ جاتی۔

جہاں خوب اچھل کود ہوتی ـــ بھاگ دوڑ ہوتی ـــ کرکٹ کھیلا جاتا ـــ
فٹ بال کی گیم ہوتی ـــ اور ایسے میں نرم ملائم ہری ہری گھاس خوب روندی

جاتی ــــ کئی پودے ٹوٹتے ــــ کئی پھولوں کی کیاریوں کا ناس مارا جاتا۔

مالی بابا بے چارہ پریشان ہو جاتا۔ حنا سامنے نہ ہوتی تو سب بچوں کو ڈانٹتا کر کے کان کھینچتا۔ کسی کو مالکن سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ حنا سے بھی دبے دبے لہجے میں شکایت کرتا۔

"دیکھو چھوٹی بی بی ــــ ان بچوں نے کیاریوں کا ستیاناس مار دیا۔ کتنی بار پودے لا چکا ہوں ــــ پھولوں کا موسم آرہا ہے۔ ان سے کہیں، کھیلتے وقت ان کیاریوں کا دھیان رکھا کریں ــــ گھاس بھی ساری رگید دیتے ہیں ــــ"

"مالی بابا" حنا کہتی "ٹھیک ہے میں انہیں سمجھا دوں گی ــــ لیکن آخر بچے ہیں۔ کسی وقت دھیان نہیں رہتا ہوگا ــــ جو ان کیاریوں میں گھس جاتے ہوں گے ــــ پھر مالی بابا یہ بچے بھی تو پھول ہی ہیں ــــ کتنے پیارے پیارے معصوم معصوم ہیں۔ انہیں جھڑکنے یا ڈانٹنے کو تو جی ہی نہیں کرتا نا ــــ"

اور مالی بابا بڑبڑاتا "اسی وجہ سے تو اتنے سر چڑھے ہیں ــــ میں مالکن سے شکایت کر دوں گا۔"

مالکن سے مالی کیا شکایت کرتا ــــ بیگم حماد تو خود ہی اپنی اس لڑکا نما لڑکی سے نالاں تھیں۔ پیار سے سمجھاتی تھیں۔ ڈانٹتی تھیں ــــ بُرا بھلا کہتی تھیں۔ لیکن حنا اِس کان سے سنتی اس کان سے اُڑا دیتی۔ بھابی اس کی طرف داری کو جو آجاتی تھی۔ بہت پیار تھا حسنہ کو اپنی چھوٹی معصوم اور پیاری پیاری نند سے ــــ

"حسنہ" امی پریشان ہو جاتیں۔

"جی"

"تم اسے منع کرنے کے بجائے اس کی طرف داری کرنے لگتی ہو۔ اس لیے تو وہ باز نہیں آتی ــــ"

"کیا کرتی ہے وہ امی ــــ یہی نا کہ بچوں کے ساتھ کھیلتی ہے۔"

"وہ اب بچی تو نہیں۔ یہ بچپنا زیب دیتا ہے اُسے؟"

"سب چلتا ہے امی ــــ یہی تو اس کے ہنسنے بولنے کے دن ہیں ــــ نہ ٹوکا کریں اسے ــــ شادی ہو جائے گی تو خود ہی سنبھل جائے گی۔"

"اس لڑکے کی شادی بھی تو سوچ سمجھ کر کرنا پڑے گی ــــ"

حسنہ ساس کی بات پر ہنس پڑتی ــــ تھی حنا واقعی لڑکا ہی۔ خاص کر جب وہ بچوں سے کھیل رہی ہوتی اس وقت لڑکا ہی لگتی۔ شلوار نیفے میں اُڑس کر گھٹنوں سے اوپر کی ہوتی ــــ قمیص کا اگلا گھیرا پچھلے گھیرے کے ساتھ کمر میں باندھا ہوتا ــــ دوپٹہ تو اوڑھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتی ــــ پاؤں سے ننگی ہوتی ــــ درختوں پر بندریا کی طرح چڑھ جاتی ــــ آئے دن ہاتھ پاؤں زخمی کیے جاتے۔

حنا ــــ حماد احمد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ دو لڑکے بڑے تھے۔ انجم اسٹیٹس میں تھا۔ شادی بھی وہیں ایک کینیڈین سے کر لی تھی ــــ ظفر اپنی بیوی حسنہ اور بچی پومی کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ ہی رہتا تھا ــــ بیٹوں کے بعد تین بیٹیاں تھیں ــــ دو کی شادی کر چکے تھے ــــ عصمی کویت میں اپنے انجنیئر میاں کے ساتھ قیام پذیر تھی اور عظمہ کا شوہر ڈاکٹر تھا۔ ان دنوں وہ کسی سبجیکٹ میں اسپیشلائز کر رہا تھا ــــ دونوں ان دنوں یو کے میں تھے۔

حنا چھوٹی تھی ــــ اس لیے لاڈلی تھی ــــ لاڈ پیار نے ہی اسے ذہنی بلوغت نہیں دی تھی ــــ سمجھدار تھی بہت لیکن چھوٹے ہونے کے ناتے ابھی تک اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھتی تھی ــــ قسمت کی بات تھی ــــ جو حسنہ اچھے اخلاق کی تھی ــــ بھابیوں والی ہیرا پھیری اُسے آتی ہی نہ تھی۔ گھر والوں نے بھی اسے ہمیشہ بہو کے بجائے بیٹی ہی سمجھا ــــ یوں گھر کی فضا بہت خوشگوار تھی۔ تلخی ترشی نہیں ہوتی تھی ــــ محبتوں کی پھوار ہمیشہ ہی

دھیمے دھیمے برستی رہتی تھی ۔۔۔ حسنہ اور حنا میں بڑی دوستی تھی۔ پیار تھا خلوص تھا
تبھی تو جب امی کبھی مالی بابا اور کبھی دوسرے نوکر کی شکایت پر حنا کو ڈانٹنے لگتیں تو
حسنہ درمیان میں آجاتی۔

اس دن بھی مالی بابا نے تنگ آکر مالکن سے شکایت کی تھی ۔۔۔ "بڑی بی بی!
سمجھائیے نا چھوٹی بی بی کو۔ بچوں نے اچھل کود میں وہ تمام پودے روند ڈالے جو ظفر میاں
لائے تھے ۔۔۔ اتنے قیمتی پودے تھے۔ دو تین کو تو ختم ہی کر دیا ۔۔۔"

امی اس کے کھلنڈرے پن سے نالاں تو تھیں ہی ۔۔۔ کل حنا نے ان بچوں کے
مل کر فرج پر بھی دھاوا بولا تھا۔ گولڈن سیب تو سارے ہی چٹ کر گئے تھے کسٹرڈ
کے دو پیالے بھی کھا گئے تھے ۔۔۔ غصہ اس وقت تو نہ اتار سکی تھیں۔ اب مالی کی شکایت
پر حنا کو طلب کیا۔

"کیا ہوا امی ۔۔۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"کیا نہیں ہوا ۔۔۔" امی زور سے دھاڑیں تو حنا سہم گئی۔

"امی ۔۔۔"

"تو نے باز آنا ہے کہ نہیں ۔۔۔"

"کس بات سے امی ۔۔۔"

"یہ جو بچوں کا لشکر اکٹھا کر لیتی ہے ۔۔۔ خبردار جو اب یہ بچے یہاں آئے ۔۔۔"

"امی ۔۔۔"

"بہت دیکھ لیا تیرا منہ ۔۔۔ سمجھنے میں آتی ہی نہیں۔ تیری عمر ہے اس طرح اچھلنے
کودنے کی ۔۔۔ انیس برس کی ہو رہی ہے تو۔"

"ہاں ہو تو رہی ہوں ۔۔۔"

"سنجیدہ رہنا سیکھو ۔۔۔ بس کل سے کوئی نہیں آئے گا یہاں، سمجھیں ۔۔۔"

حنا کے جواب دینے سے پہلے ہی حسنہ آگئی ۔۔۔ حنا کو جلدی سے بازوؤں میں
بھر کر پیار کرتے ہوئے امی سے ملائمت سے بولی ۔۔۔ "امی جی ۔۔۔ آپ ہر وقت کیوں
اس بے چاری کے پیچھے پڑی رہتی ہیں ۔۔۔ نہ کہا کریں کچھ بھی اسے۔"

"حسنہ تیرا لاڈ اسے اور خراب کر رہا ہے۔"

"لاڈ خراب نہیں کرتا امی ۔۔۔ حنا کو آپ بالکل ہی نا سمجھ بچی نہ سمجھیں۔"

حنا حسنہ کے سینے میں منہ چھپا کر جھوٹ موٹ رونے لگی ۔۔۔

"دیکھیں نا" حسنہ نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ "رونے لگی بے چاری ۔۔۔
ایک ہی تو بیٹی رہ گئی ہے آپ کے پاس ۔ وہ مہمان ہی ہے امی ۔۔۔ چلی جائے گی یہ بھی
تو پھر اس کے اسی کھلنڈرے پن کو آپ بے طرح یاد کیا کریں گی ۔۔۔"

حسنہ حنا کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے چپ کرانے لگی۔ امی
لاجواب سی ہو کر وہاں سے چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی حنا نے سر اٹھایا اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے حسنہ کے بازوؤں کو
پکڑ کر اسے دو تین چکر دے ڈالے۔

"جیو بھابی جیو ۔۔۔" وہ اس کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا ۔۔۔ پاکھنڈی رونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی ۔۔۔"

"بالکل۔"

"چالاک بہت ہے تو ۔۔۔"

"امی کی ڈانٹ سے بچنے اور آپ کا پیار پانے کے لیے یہ ضروری ہے بھابی ۔۔۔"

"پگلی ۔۔۔ پیار تو میں تجھے ایسے بھی بہت کرتی ہوں ۔۔۔ تو ہنستی کھیلتی ہے نا
تو مجھے بڑی تسکین ملتی ہے۔" شاید ایسے ہی ہنسنے کھیلنے اور اچھل کود کرنے کی میری بھی بڑی
خواہش ہوا کرتی تھی ۔۔۔ جب تک شادی نہ ہو ۔۔۔ ماں باپ کے گھر میں بے فکری سے

آزادی سے ہنسنے بولنے کا حق ہوتا ہے ہر لڑکی کو ـــــ تم اس حق کو خوب وصول کر رہی ہو ـــــ اچھا کر رہی ہو ـــــ"

"اوہ بھابی سوئیٹ بھابی ـــــ"

میری ممی جب زندہ تھیں، میں بھی ایسی ہی تھی۔ وہ فوت ہوگئیں ـــ دوسری نے آکر سب حق چھین لیے ـــــ"

"بھابی مت اُداس ہوئیے ـــــ"

حسنہ نے گیلی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے اسے دیکھا اور بولی "میں نے کہا اس طرح ہنستی بولتی ہو، کھلنڈری ہو، آزادی اور بے فکری سے اچھلتی کودتی پھرتی ہو تو میری انا کو تسکین ملتی ہے۔ میں خوش ہوتی ہوں ـــــ شادی کے بعد تو خود بخود سنجیدہ ہو جاتا ہے آدمی ـــــ"

"سچ بھابی ہاں ـــــ"

"تو پھر ـــــ"

"کیا ـــــ؟"

"میرے سنجیدہ ہونے کا وقت کب آرہا ہے ـــــ" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی بھابی نے اس کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "فکر نہ کرو آرہا ہے ـــــ"

"لیکن بھابی"

"ہوں ـــــ"

"میں سنجیدہ پھر بھی نہ ہوسکی تو ـــــ"

"خدا کرے تجھے ایسا ہی بر ملے ـــــ تیری یہ ہنستی مسکراتی معصوم سی دنیا یونہی آباد رہے ـــــ"

"آمین ـــــ" حنا نے ہنستے ہوئے کہا، تو حسنہ بھی ہنس پڑی۔

حنا کے لیے رشتے آرہے تھے۔ لیکن معیار پر ابھی کوئی پورا نہیں اُترتا تھا۔ کسی کی نوکری اچھی تھی تو گھر بار ٹھیک نہ تھا۔ کوئی صاحبِ جائیداد تھا۔ تو تعلیم واجبی سی تھی۔ کوئی کردار کا ٹھیک نہیں تھا۔ تو کوئی شکل وصورت میں دبتا تھا ـــــ حماد احمد کے پہلے دونوں داماد اچھے گھرانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھے ـــــ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت بھی رکھتے تھے۔ مخلص اور ہمدرد بھی تھے۔ حنا کے لیے بھی انہیں ایسے ہی لڑکے کی تلاش تھی۔ ویسے چھوٹی ہونے کے ناتے انہیں ابھی کچھ جلدی بھی نہ تھی۔

رشتے کی بات چلتی بھی تو حماد احمد کہہ دیتے "بھئی ابھی حنا کا بچپنا نہیں گیا۔ بالکل ناسمجھ سی بچی ہے شادی بھی کریں گے اس کی ـــــ ابھی اسے آزادی اور بے فکری سے جینے دو۔"

ناصرہ بیگم چڑ جاتیں۔ نالاں انداز میں کہتیں "اس کا بچپنا تو کبھی جائے گا ہی نہیں۔ تم لوگوں نے اسے زیادہ ہی سر چڑھا رکھا ہے۔"

حماد ہنس کر کہتے "بھلی لوگ ایک ہی تو بچی رہ گئی ہے اپنے پاس، ہنسنے کھیلنے دیا کرو اسے ہر وقت ڈنڈا مار انداز میں اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ کیا لیتی ہے تمہارا ـــ چھوٹے چھوٹے ساتھی چن رکھے ہیں نا اس نے۔ اسے ان کے ساتھ ہی خوشی ملتی ہے تو تمہارا کیا بگڑتا ہے بھاگوان ـــــ"

"میں کہتی ہوں رشتے آنے کی اک عمر ہوتی ہے۔ وہ خیر سے انیس برس کی ہو چکی ہے۔ عصمی کی تو شادی اٹھارہ سال کی عمر میں کر دی تھی ـــــ"

"اچھا بھئی کوئی معقول سا رشتہ آیا تو سنجیدگی سے سوچیں گے۔"

یہ معقول سا رشتہ حماد احمد کے ایک دوست کے توسط سے آیا۔ ان دنوں حنا نے بی اے کے امتحان سے فراغت حاصل کی تھی۔ اور وہ اپنے چھوٹے بڑے ساتھیوں سے مل کر وقت گزاری کے بڑے بڑے پلان بنا رہی تھی۔ ان میں باقاعدگی سے کرکٹ

کھیلنا۔ چھٹی کے دن پکنک منانا۔ درختوں پر چڑھنا۔ چڑیاں پکڑنا۔ بارش ہو رہی ہو تو بڑے برآمدے میں لُڈّو اور کیرم کھیلنا شامل تھا۔

اس دن حنا اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیرم کھیل رہی تھی۔ کچھ بچوں کو اس نے لُڈّو کھیلنے کے لیے دی تھی۔ کچھ کو تاش اور کچھ دوسرے کھیل کھیل رہے تھے۔ حنا کے ساتھ اس کے نسبتاً بڑے ساتھی تھے۔ اکرم نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سمیہ دسویں کی طالبہ تھی اور ظہیر فرسٹ ایئر میں تھا۔ کھیل کے درمیان اکرم نے چیٹنگ کی۔ حنا نے اس کی چوری پکڑ لی۔ بس ہنگامہ ہو گیا۔ خوب شور مچا باقی بچے بھی اپنے اپنے کھیل چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔

حنا کا ساتھی ظہیر تھا۔ دونوں ہی اکرم اور سمیہ سے جھگڑ رہے تھے۔ آوازیں اتنی اونچی ہو گئی تھیں کہ حسنہ بھابی کو دوڑ کر کمرے سے برآمدے میں آنا پڑا۔

"کیا ہوا کیا ہوا" حسنہ بچوں کے جمگھٹے میں جگہ بناتے ادھر آئی۔

"بھابی ـــــ" حنا نے زور سے پکارا۔ بھابی نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا "اتنا شور مچا رکھا ہے۔ مچھلی بازار بنایا ہوا ہے گھر کو ـــــ حنا پلیز ـــــ" حنا نے حیرانی سے بھابی کو دیکھا۔ بھابی تو اس شور شرابے سے ہمیشہ محظوظ ہوتی تھیں۔ آج انہیں کیا ہوا ـــــ

وہ کچھ پوچھنے ہی کو تھی ـــــ کہ حسنہ بولی "مہمان آئے ہوئے ہیں گھر میں ـــــ کیا کہتے ہوں گے ـــــ"

"بچوں کا شور ہے بھابی ـــــ یہی کہتے ہوں گے نا کہ گھر میں بہت سے بچے ہیں ـــــ لڑ جھگڑ رہے ہیں ـــــ"

"یہ لگتا ہے کچھ خاص الخاص قسم کے مہمان ہیں ـــــ" حسنہ نے حنا کے کان میں مسکراتے ہوئے سرگوشی کی ـــــ

"خاص الخاص ـــــ؟" حنا نے کہا اس کے ساتھی دلچسپی سے بھابی کو دیکھنے لگے۔

"میرا خیال ہے۔ ابو کے دوست تمہارے لیے رشتہ لے کر آئے ہیں ـــــ" حسنہ نے حنا کو بتایا۔ "بہت اچھا رشتہ ہے"

"اوہ ـــــ سچی ـــــ" حنا نے بچوں کی طرح خوش ہو کر تالی بجائی۔ سب بچوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ تالیوں کا شور گونج اٹھا

"بھئی اب آپ سب لوگ چھٹی کرو ـــــ" حنا نے خود ہی بچوں سے کہہ دیا "ساری چیزیں اٹھا کر میرے کمرے میں رکھ آؤ ـــــ لُڈّو کی ٹکیاں اور کیرم کی گوٹیں گن کر رکھنا ـــــ ویسے بھی برآمدے میں اب خاصی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ بارش بھی تیز ہونے کو ہے ـــــ اس لیے سب کو چھٹی ـــــ"

بچوں نے بڑی سعادت مندی سے اس کا کہا مانا ـــــ چیزیں اٹھا کر لے گئے ـــــ وہ خود حسنہ کے ساتھ کچن میں چلی آئی ـــــ جہاں چائے کے لیے خاص اہتمام ہو رہا تھا ـــــ

"کون کون آیا ہے؟" حنا نے ٹرالی پر رکھے ڈرائی فروٹ کی ٹرے میں سے چند پستے بادام اٹھاتے ہوئے پوچھا ـــــ

"ابو کے دوست ہیں اور اُن کے ساتھ لڑکے کے والد ـــــ" حسنہ نے جواب دیا۔

"لڑکے کے والد ـــــ؟" حنا نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"لڑکے کے والد" حسنہ بولی "اس کی ماں نہیں ہے صرف باپ ہے ـــــ"

"اوہو ـــــ"

"ہاں ہے کون ذات شریف؟"

"انجینئر ہے لڑکا ـــــ کہتے ہیں۔ بہت اچھا ہے ـــــ شکل و صورت کا بھی اور اخلاق کا بھی ـــــ"

"ہوں ـــــ" حنا ہنس پڑی ـــــ

باپ تو ہینڈسم ہے ____ جوانی میں بہت خوبصورت ہوگا ____ شائستہ بھی بہت لگتا ہے ____"

"ماں کا پتّا پہلے ہی کاٹ ڈالا ____" حنا بسکٹ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"تیرے لیے ایسا ہی رشتہ چاہیے ____ تین بھائی ہی ہیں۔ بڑا جدّہ میں ہوتا ہے، وہ بھی انجینئر ہے اور سب سے چھوٹا فرسٹ ایئر میں۔ ساس نہ نند ____ موج کرے گی تُو ____"

حنا نے حسنہ کو شوخی سے دیکھا اور بولی" بڑا افسوس ہے بھابی ____"

"کیوں؟"

"آپ موج نہیں کر سکیں۔"

"مطلب ____؟"

"آپ کی ساس بھی ہے اور ایک چھوڑ تین تین نندیں بھی ____"

"شریر" حسنہ نے چائے کے برتن ٹرالی میں سجاتے ہوئے کہا" ایسی خوش قسمتی ہر لڑکی کے حصّے میں نہیں آتی کہ ساس ماں کی طرح ہو اور نندیں بہنوں جیسی ____"

اور شاید یہ بھی خوش بختی ہے کہ ہر بہو میری اس پیاری پیاری بھابی جیسی بھی نہیں ہوتی۔ جو ساس کو ماں اور نندوں کو بہنیں سمجھے۔"

"چل بہت فلسفہ نہ جھاڑ ____" حسنہ نے پیار سے اسے دیکھا" جاکر بال وال ٹھیک کرلے۔ ہونے والے سسر جی کو سلام کرنے جانا ہے ڈرائنگ روم میں ____"

"ہائے بھابی ____ ایسے ہی سسر جی بنا دیا ____" حنا آنکھوں کو شوخی سے نچاتے ہوئے بولی" پہلے ان کو تو دیکھ لیں۔"

بھابی نے بھی اسی انداز میں شوخی سے کہا" اُن کو بھی کل دیکھنے جا رہے ہیں ہم۔"

"میں بھی ____؟"

"ہٹ پگلی کہیں کی ____"

دونوں ہنسنے لگیں۔

دوسری شام حسنہ ناصرہ بیگم اور حماد احمد کے ساتھ شریف الدین کے ہاں گئے۔ شریف الدین واقعی شریف آدمی تھے ____ خاندانی لوگ تھے، صاحبِ جائیداد بھی تھے۔ کافی بڑی کوٹھی تھی، جس میں آرائش و زیبائش کی بہت سی چیزیں تھیں۔ چونکہ گھر میں عورت کوئی نہیں تھی۔ اس لیے رکھ رکھاؤ میں کچھ بے ترتیبی سی تھی۔ شریف الدین نے یہ بات پہلے ہی ان پر واضح کر دی تھی، وہ خود اک ریٹائرڈ جج تھے۔ زیادہ وقت اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے پاس جدّہ ہی میں گزارتے تھے۔ دین کی لگن تھی اور خدا نے یہ موقع دے دیا تھا۔ کہ وہ حج کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ جی بھر کر عمرے کریں۔ ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے ____ فیاض کے رشتے کی بات طے کرنا تھی۔ وہ اک مقامی فرم میں بڑی معقول تنخواہ پا رہا تھا ____ اس کا ارادہ بھی امریکہ جاکر ایم ایس کرنے کا تھا۔ لیکن شریف الدین چاہتے تھے کہ ان کی شادی کر دیں۔ گھر عورت کے بنا سونا ہوتا ہے ____ اور پھر چھوٹا بیٹا ایاز بھی ابھی میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں تھا۔ اس کی تعلیم کے مکمل ہونے تک فیاض کو یہیں رہنا تھا ____ گھر میں ایک دیرینہ ملازم جوڑا تھا ____ غلام محمد اور برکتے ہی دونوں ان دنوں گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

مہمانوں کی آؤ بھگت غلام محمد اور برکتے نے اپنے طریقے سلیقے سے کی ____ فیاض کو حماد احمد اور ناصرہ بیگم نے پسند کیا۔ حسنہ کو بھی اچھا لگا۔ بڑا ہینڈسم نوجوان تھا ____ لیکن کچھ سنجیدہ سا تھا ____ اس کی عمر بھی اُنتیس تیس برس سے کم نہ تھی۔

گھر آکر اس رشتے کی باتیں ہوئیں۔ حماد احمد نے تو وہیں اوکے کر دیا تھا ____ لوگ انہیں بہت ہی بھلے لگے تھے۔ پھر ان میں ساری خوبیاں بھی تھیں۔ ناپسند کیوں کرتے۔ ہاں حسنہ نے دبی دبی آواز اٹھائی ____ ناصرہ سے کہا" امی لڑکا بہت سنجیدہ لگتا ہے۔"

"ہاں بہت باتونی نہیں ——"

"شاید پہلی دفعہ ملا۔ اس لیے شرما رہا تھا ——"

"نہیں —— یہ بات تو نہیں —— تمہارے ابّو سے ٹھیک ٹھاک باتیں کر رہا تھا۔"

"عمر بھی ——"

"اُنتیس سال ہے۔ شریف الدین صاحب نے بتا دی تھی ——"

حسنہ بولی "بہت فرق ہے عمروں میں۔"

"ہے تو —— لیکن بیٹی باقی باتیں بھی تو دیکھنا ہیں۔ ایسا گھر بار ملنا مشکل ہی ہے۔ گھر میں ساس ہے نہ نند۔ ایک دیور ہوگا بس تم حنا کو جانتی نہیں ہو کیا۔ ساس نندوں میں یہ لڑکی گزر کر سکتی ہے۔ اچھا ہے اکیلا گھر ہوگا —— جیسے بھی رہے گی۔ کوئی اعتراض کرنے والا تو نہیں ہوگا۔ مجھے تو اس کے کھلنڈرے پن سے خوف ہی آتا تھا۔ دعا کرتی تھی اکیلا گھر ہی ملے اسے ——"

ناصرہ اس رشتے کو حنا کی خوش بختی تعبیر کر رہی تھی۔ لیکن حسنہ فیاض کی سنجیدگی سے کچھ خوفزدہ سی تھی۔ مزاجوں میں ہم آہنگی نہ ہو۔ تو جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ حنا کا تو ابھی بچپنا نہیں گیا تھا۔ اس ٹھہرے ہوئے مزاج کے آدمی سے نباہ کر سکے گی ——؟

لیکن ناصرہ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی —— ساری خوبیاں تھیں اس رشتے میں۔ لڑکے کی عمر حنا سے کچھ زیادہ تھی۔ تو یہ بات بھی حنا کے لیے اچھی تھی۔ اس شوخ و شنگ لڑکی کے لیے بردبار اور متحمل مزاج کا آدمی ہی ہونا چاہیے تھا —— حسنہ ان دلائل کی روشنی میں رشتے کو دیکھتی تو تسلّی ہو جاتی —— لیکن دل ہی دل اک ہول سا محسوس کرتی تھی۔

ہر جوان لڑکی کی طرح حنا بھی خوش تھی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ بہت اچھا بر ملا ہے۔ اس نے حسنہ سے فیاض کے متعلق خود ہی پوچھ لیا تھا —— حسنہ نے دانستہ عمروں کے تفاوت اور مزاج کی بات نہیں کی تھی ——

بات پکّی ہو گئی —— حسنہ کئی دفعہ فیاض سے ملی۔ وہ بہت ٹھہری اور سلجھی ہوئی طبیعت کا آدمی تھا —— سنجیدہ، بردبار اور متحمل مزاج رکھتا تھا —— حنا اس کے بالکل برعکس اور متضاد طبیعت کی مالک تھی —— حسنہ کا بس چلتا تو وہ اس تضاد کی بنا پر یہ رشتہ کبھی نہ ہونے دیتی ——

لیکن ——

وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

ویسے بھی رشتے ناتے قسمت کے کھیل ہیں۔ یہ بندھن تو آسمانوں میں بندھتے ہیں۔ قسمت کا کچھ پتا نہیں ہوتا —— اِدھر کروٹ بدلے تو وارے نیارے ہو جائیں —— اُدھر کروٹ لے تو سب کچھ تہس نہس ہو جائے۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ امّی اور حسنہ بے طرح مصروف ہو گئیں۔ کچھ کام حنا کے ذمّے بھی لگے۔ لیکن سارے کاموں کو نپٹانے کے باوجود حنا اب بھی اپنے ساتھیوں سے کھیلنے کا وقت نکال لیتی —— وہ خود ہی شام کو اکٹھے ہو جاتے۔ اور حنا حسبِ عادت کام دام چھوڑ کے ساتھ اٹھ دوڑتی۔ امّی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"حنا —— اب تو یہ اُچھل کود چھوڑ دے —— ان بچّوں سے کہہ دے خود ہی کھیلا کریں ——"

"امّی" حنا منہ بنا کر جواب دیتی "امّی —— تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ تو یہ بچّے خود ہی کھیلا کریں گے۔ میرے پیچھے وہاں تو نہیں آجائیں گے —— چند دن اور اگر میں ان سے گھل مل کر خوش ہو لوں۔ تو آپ کا کیا جاتا ہے ——"

"میرا تو کچھ نہیں جاتا حنا —— جائے گا تیرا ہی۔"

"کیا مطلب امّی ——؟"

بیٹی —— تیری شادی ہو رہی ہے۔ اک بھرے پُرے گھر کی ساری ذمّے داریاں تجھے

اٹھانا ہیں۔ تو اس گھر میں جا رہی ہے۔ جہاں کوئی عورت نہیں ـــــ تیرا کھلنڈرا پن تجھے سنجیدگی سے ساری ذمّے داریاں نمٹانے دے گا ــــ؟"

"دے گا ــــ"

"اچھا بھئی تو جان اور تیرا کام ــــ جب تک ڈولی میں نہیں بیٹھ جاتی تب تک اُچھل کود کرتی رہ ــــ لڑکا بنی رہ ــــ"

حنا ہنس پڑی ــــ امّی کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولتے ہوئے بولی "امّی آپ کو فکر ہے نا ــــ کہ میں سسرال جا کر بھی ایسی بچپنے کی حرکتیں کروں گی ــــ"

"ہے تو فکر والی بات"

"نہیں امی ــــ میں ایسی بے وقوف تو نہیں ہوں ــــ"

"لیکن تیری عادتیں جو پختہ ہو چکی ہیں۔ انہیں بدلنا آسان نہیں"

وہ ہنس کر بولی۔ بدل لوں گی ــــ اور نہ بدل سکی ــــ تو ان سب کو اپنے ڈھنگ پہ لے آؤں گی۔ آپ فکر نہ کریں، میں اتنی بھولی بھالی اور سادی بھی نہیں ہوں ــــ"

"خدا تجھے شاد و آباد رکھے" ماں نے دعا دیتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

اک دن حسنہ نے بھی حنا سے کچھ اسی رنگ میں باتیں کیں ــــ حنا نے اپنے ساتھیوں سے مل کر کچھ کچّے مالٹے اور کینو توڑے تھے۔ وہ سب بڑے مزے لے لے کر کھٹے کھٹے کینوؤں کی پھانکیں لال مرچ ملے نمک سے لگا لگا کر کھا رہے تھے ــــ چھلکے لان ہی میں اِدھر اُدھر اچھال رہے تھے۔ اکرم، سمبہ، ظہیر اور وہ خود تو چٹخارے لے رہے تھے۔ ہاں ننھے منّے بچّے کھٹاس اور مرچوں سے ناک منہ میں جلن محسوس کرتے ہوئے شوں شوں کر رہے تھے۔

"کھاؤ کھاؤ" حنا انہیں زبردستی کھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"بس باجی"

"بے وقوف کہیں کے کچھ نہیں ہوتا ــــ کھاؤ"

"مرچیں لگتی ہیں ــــ"

"تو مرچوں کے بغیر کھاؤ ــــ"

بچّے حکم کے بندے تھے۔ اپیا باجی، بجیا کا کہا کب ٹال سکتے تھے۔ نمک مرچ لگائے بنا کھانے لگے۔ حنا چوکڑی مارے ان سب کے درمیان گھاس پر بیٹھی تھی۔

"چھوٹی بی بی ــــ" اندر سے آتی ہوتی ہوئی ملازمہ نے پکارا۔

"کیا ہے؟"

"بھابی آپ کو بلا رہی ہیں۔ درزی کپڑے لایا ہے ــــ"

"اچھا آتی ہوں ــــ"

حنا اُٹھ کھڑی ہوئی ــــ کچھ بچے بھی اُٹھے۔ حنا بولی "تم کھاؤ ابھی ــــ اور ہاں پھر یہ چھلکے وکے سب جمع کر کے ادھر پھینکنا ہیں۔ گند یہیں پڑا نہ رہے ــــ مالی بابا جان سے لے گا ــــ سمجھے"

"اچھا بجیا ــــ صاف کر دیں گے ہم"

"بہت اچھے ــــ" حنا ایک مٹھی میں نمک مرچ اور دوسری میں آدھا کینو لیے اندر چلی گئی ــــ وہ مزے سے نمک مرچ لگا کر کینو کھاتے ہوئے بھابی کے پاس آ گئی۔

بھابی رنگا رنگ کپڑے قالین پر پھیلائے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی ــــ حنا اندر آئی۔ تو اس کا حلیہ دیکھ کر حسنہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ حنا کو اب یہ کھیل کود چھوڑ دینا چاہیے۔ حنا کا ایک پائینچا ٹخنے میں اُڑسا ہوا تھا ــــ دوپٹہ کمر کے گرد باندھ رکھا تھا ــــ قمیص کی آستینیں اوپر چڑھی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور کینو کی پھانک ہتھیلی پر رکھے نمک مرچ سے لتھیڑ کر کھاتے ہوئے ناک منہ لال کیے ہوئے تھی۔

"آہا کپڑے آ گئے" حنا خوب صورت بیش قیمت کپڑوں کو دیکھ کر بچّوں کی طرح اُچھلی۔

"آ گئے محترمہ آ گئے ــــ" حسنہ نے اس کے سراپا پر نگاہ ڈالی "اب مہربانی سے

جا کر پہلے یہ کینو پھینکو اور ہاتھ دھو کر آؤ ــــ"

"ہائے بھابی ــــ بڑا مزے کا ہے کھٹ مٹھا ــــ کھائیں گی آپ" ا[س] نے ایک پھانک اس کی طرف بڑھائی۔

"حنا ــــ کینو کھانے ہی ہیں تو ڈھنگ سے کھاؤ ــــ"

"کیسے ــــ؟"

کوئی پلیٹ لو ــــ نمک دانی، مرچ دانی ــــ"

"اوں ہوں۔ اس طرح کھانے میں جو مزہ ہے نا بھابی ــ وہ ــــ"

"حنا ــــ تمہاری شادی ہو رہی ہے ــــ"

"مجھے پتا ہے ــــ"

"اب تو کوئی طریقہ سلیقہ سیکھو ــــ یہ عادتیں اب چھوڑ دو۔ تمہیں نئے گھر جانا ہے ــــ اور ــــ"

"بھابی ــــ آپ تو ہمیشہ میری حمایت کرتی تھیں ــــ"

"اب نہیں کروں گی ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"حمایت کرنے کا جو وقت تھا میں کرتی تھی۔ اب تمہیں اپنی نئی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہیے حنا۔ تم کو جاتے ہی گھر کی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ یہ کھلنڈرا پن نہیں چلے گا ــــ"

"تو کیا چلے گا بھابی ــــ" وہ ہنس کر بولی۔

"دیکھ حنا ــــ حسنہ اس کی ہنسی سے سنجیدہ ہو کر بولی ــــ" اب یہ اچھل کود اور بچوں کی سی حرکتیں چھوڑ دے، اپنے آپ کو اپنی عمر اور ذمے داریوں کے حوالے سے دیکھ۔ فیاض بہت ٹھہرے ہوئے سلجھے ہوئے مزاج کا متین اور سنجیدہ آدمی ہے ــــ"

"اوں ــــ بنتا ہوگا آپ کے سامنے ــــ"

"نہیں حنا ــــ اس کا مزاج تم جیسا نہیں ــــ"

"تو میں کیا کروں ــــ"

"تجھے اپنے آپ کو اس کے مزاج کے مطابق ڈھالنا ہے ــــ"

"فکر نہ کرو بھابی ــــ وہ میرے مزاج کے مطابق ڈھل جائے گا ــــ"

حنا باتھ روم میں چلی گئی۔ حسنہ نے اک گہری سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی "خدا کرے ایسا ہی ہو ــــ"

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ حنا کے سب بہن بھائی آ گئے۔ چھوٹی اور لاڈلی بہن کو رخصت کرتے ہوئے سب کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر دعائیں تھیں ــــ بابل کی دہلیز چھوڑتے وقت ہر لڑکی دلگیر ہوتی ہے۔ روتی دھوتی رخصت ہوتی ہے۔ بچھڑنا کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اسے اس وقت احساس ہوتا ہے۔ حنا بھی پھوٹ پھوٹ کر روئی ــــ اسے تو ماں باپ بھائی۔ بہنوں اور بھابی سے بچھڑنے کے غم کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں سے بچھڑنے کا بھی غم تھا ــــ اپنے اک اک ساتھی سے لپٹ کر وہ خوب روئی ــــ روتے روتے ان سے کہا "اب میں ہر شام تو تمہارے ساتھ کھیل نہیں پاؤں گی ــــ لیکن جب بھی یہاں آیا کروں گی تم سے ضرور کھیلا کروں گی ــــ میں تمہارے بنا اداس ہو جاؤں گی۔ جلدی جلدی آنے کی کوشش کیا کروں گی ــــ"

حنا رخصت ہو کر سسرال آ گئی ــــ سیم وزر کی گٹھری بنی وہ فیاض کے حجلۂ عروسی میں بیڈ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔ سسرالی عورتیں اس کا لمبا سا گھونگٹ کھینچ گئی تھیں، کچھ نئی اور من چلی دلہنوں نے اس کے کانوں میں بڑی رسیلی رسیلی سرگوشیاں بھی اتاری تھیں۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا ــــ وہ مسکراہٹیں ہونٹوں پہ سجائے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ فیاض کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ آہٹ ہوئی

دروازہ کھلا اور پھر بند ہوا — بوجھل بوجھل قدموں سے کوئی اندر چلا آیا — حنا نے سر
اور جھکا لیا — یقیناً یہ فیاض ہی تھا — خوشیوں روشنیوں اور چمک دمک سے بھرپور
عروسی میں انوکھی سی لذت آمیز مہک پھیل گئی — قدموں کی آہٹ صوفے کے قریب
گئی۔ پھر اسے لگا کر کوئی صوفے پر بیٹھ گیا ہے لائیٹر کی ٹک ہوئی۔ پھر سگریٹ کا دھواں
مہکتی فضا میں پھیلنے لگا۔

کئی منٹ بوجھل سی خاموشی کی نذر ہو گئے — فیاض بیڈ کے قریب نہیں آیا
وہیں بیٹھا سگریٹ کے کش لیتا رہا، حنا سے انتظار نہ ہو سکا۔ جھٹ سے گھونگٹ اٹھا
لیا —

فیاض نے اسے ایک دم گردن گھما کر دیکھا۔ دلہن کے خود ہی گھونگٹ اُٹھانے کی بات
اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن وہ چاند سا چہرہ دیکھ کر خوش ضرور ہو گیا — وہ رونمائی
میں دینے کے لیے انگوٹھی جیب سے نکال کر اٹھنے ہی کو تھا کہ حنا غرارے کو سنبھالتی
اُٹھی۔ دھم سے بیڈ سے کودی اور اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی — روٹھنے کے
انداز میں بولی — "اتنی دیر سے گردن جھکائے آپ کا انتظار کر رہی تھی — تھک
گئی ہوں میں — گردن دُکھنے لگی ہے۔ یہ زیور اور بھاری بھاری کپڑے۔"

فیاض نے معصوم سی لڑکی کو برق پاش نظروں سے دیکھا — پیار ان نظروں میں
ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھا — اور حنا کو بازوؤں میں بھر لیا —
حنا گھبرا گئی — وحشی ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا اور بازوؤں سے نکلنے کی تگ و دو
کی۔ لیکن بازوؤں کا حصار آہنی تھا — وہ ان سے نکل نہ پائی۔

دوسرے دن دعوتِ ولیمہ تھی۔ حنا کو آج بھی بھاری بھاری زیورات اور ملبوسات
پہننا پڑے۔ سب سے بڑی بات کہ سر جھکائے گھنٹوں بیٹھنا پڑا۔ ہر وقت دھما چوکڑی
اور اُچھل کود کرنے والی حنا کو تو جیسے سزا ملی تھی۔ کئی بار اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن

بہنوں اور بھابی نے اُٹھنے نہیں دیا۔ دو ایک بار تو عصمی نے اس کے چٹکی بھی کاٹی۔ حسنہ نے
کئی بار اس کا دوپٹہ نیم گھونگٹ کے انداز میں ٹھیک کیا۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو
بدل رہی تھی۔ بے تکلفی سے قہقہہ لگا دیتی تھی۔ پٹر پٹر باتیں کیے جاتی تھی — بہنوں
اور بھابی کو محتاط ہونا پڑا تھا۔ اس لیے عصمی نے جب دیکھا کہ وہ چپ ہی نہیں ہو رہی
تو چٹکی کاٹی — حنا تھوڑی دیر اپنے اوپر ظاہر داری کا خول چڑھائے چپ بیٹھی رہی۔
لیکن یہ سب کچھ اس کے مزاج کے خلاف تھا —

دعوت کے خلتے پر اس کی دونوں بہنیں اور بھابی اسے کمرے میں لے آئیں۔ جہاں
آتے ہی حنا نے دوپٹہ اتار پھینکا۔ پھر جلدی جلدی زیور اتارتے ہوئے بولی "اب تو
میں کبھی ان زیوروں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ کان دکھنے لگے ہیں۔ گردن اکڑ گئی ہے
تو بہ —" عصمی نے پیار سے سمجھایا — عظمیٰ نے بھی اور حسنہ نے بھی ملائمت
سے کہا "حنا اب تو شادی شدہ ہے ذرا تحمل سے کام لے۔ دو چار دن تو یوں ہی دلہن
بن کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ فیاض کے رشتے کی عورتیں جب تک گھر میں ہوں گی سنجیدگی سے
ہی کام لینا —"

"بھئی اس کا تو میاں بھی بہت سنجیدہ سا آدمی ہے" عصمی نے کہا "بڑے ٹھہرے
ہوئے مزاج کا لگتا ہے۔ اسی لیے تو اسے بھی سمجھاتے ہیں۔ کہ —"

"بس — کچھ نہ کہیں — میں اپنا گھر بار اور اپنا میاں خود سنبھال لوں گی —"
حنا نے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا —!

"خدا کرے —" بہنوں اور بھابی نے دعائیہ انداز میں کہا۔ حنا بیڈ پر چپ پڑ
گئی — وہ واقعی بہت تھک گئی تھی۔

گھر میں چند قریبی رشتے دار ہفتہ بھر رہے۔ حنا کو ان کی خاطر زیور بھی پہننا پڑا اور
بھاری بھاری کامدانی کام کے کپڑے بھی — سب اب بھی کرنا پڑتا اور آرام سے بیٹھے

رہنا بھی ——— حنا سب کو بہت اچھی لگی تھی۔ شکل وصورت خدا نے اچھی دی تھی
بھر کم جہیز بھی ملا تھا ——— خاندانی شرافت بھی ورثے میں حصے آئی تھی ——— شریف
تو بہت ہی خوش تھے۔

ایاز کو بھی اپنی کومل سی بھابی بہت پسند آئی تھی۔ کچھ زیادہ ہی اس لیے کہ وہ ہم
تھی، اور چند دنوں ہی میں اس سے بے تکلف بھی ہو گئی تھی ——— ہم عمری کا
بھی تقاضا۔

مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ سب کو جانا ہی تھا ——— جانے کو
تو اب بڑے بھائی اعجاز اور بھابی بھی کر رہے تھے ——— شریف الدین کو بھی
کے ساتھ ہی جانا تھا۔

اس دن انہوں نے حنا کو اپنے قریب بٹھایا ——— گھر کی چابیاں اسے دیں
بولے "بیٹی اب تُو اس گھر کی مالک ہے۔ سیاہ وسفید کی مالک۔ اس گھر کا بھرم، کی
عزت و وقار سب تیرے ہاتھ میں ہے۔ فیاض بہت اچھا ہے۔"

"میں اچھی نہیں ہوں بابا جان" وہ ان کی بات کاٹ کر ہنستے ہوئے بولی۔
شریف الدین نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم بہت اچھی
ہو۔ فیاض سے بھی اچھی۔"

"نہیں ——— آپ ایسے ہی کہہ رہے ہیں ———"

"یقین مانو ——— تمہاری اچھائی ہی سے تو میں مطمئن ہوں ——— اسی لیے تو ا
کے ساتھ ہی جا رہا ہوں۔ ہاں تم پر ایاز کی ذمے داری چھوڑے جا رہا ہوں ———"

"آپ اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہیں ——— میں تو بہت خوش ہوں کہ گھر
میرا ہم عمر بھائی بھی موجود ہے۔"

"لاڈ پیار میں اسے بگاڑ بھی نہ دینا" شریف الدین مسکرا کر بولے "اس کی پڑھائی

کا بھی خیال رکھنا ہے تمہیں ——— ڈاکٹر بننے تک اُسے ذرا۔"

"ہائے نہیں بابا جان ——— وہ اب اتنا ناسمجھ بھی نہیں کہ پڑھائی کے معاملے میں
اس پر سختی کرنا پڑے ———"

"جیتی رہو" شریف الدین نے پھر اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا ——— حنا نے
ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگایا اور پھر آنکھوں سے لگا لیا ——— عقیدت
اور محبت کا یہ اظہار شریف الدین کو بہت بھایا ——— انہوں نے ڈھیروں دعائیں حنا
کو دیں۔

اعجاز بھائی، بھابی ان کے دونوں بچے اور شریف الدین سب چلے گئے۔ تو حنا کو
گھر ایک دم ہی سُونا لگنے لگا۔

اس نے روہانسی ہو کر فیاض سے کہا "گھر تو ایک دم ہی خالی ہو گیا ہے ———"

"ہاں ——— سب چلے گئے ہیں ——— بہت رونق تھی ان سے۔"

"مجھے تو وحشت ہونے لگتی ہے ———"

"عادی ہو جاؤ گی ——— شکر کرو گھر میں غلام احمد اور برکتے ہیں۔"

"لیکن ———"

فیاض نے اس کا کندھا تھپتھپایا ——— وہ تو رو دینے کو تھی ——— کوئی کام دام
کیا کرو ——— دل لگا رہے گا۔"

"آپ دفتر سے جلدی آ جایا کریں نا ———"

"فیاض مسکرا دیا ——— کہو تو نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔"

حنا نے منہ بنا کر کہا "یہ کب کہا میں نے ———"

"دفتر سے چھٹی کے بعد ہی آ سکتا ہوں نا۔"

"ایاز بھی کالج سے اتنی دیر کے بعد لوٹتا ہے۔ سارا دن اکیلے گزارنا مشکل ہوتا ہے۔"

"اب اس کا تو کوئی علاج نہیں ہے میرے پاس ___ عادت ڈالنا پڑے گی اکیلے وقت گزارنے کی ___"

حنا سارا دن بور ہوتی رہتی ___ کبھی کبھی تو اسے واقعی ویرانی ڈرنے لگی وحشت سی ہوتی ___ بھلا بیٹھنا اسے آتا ہی کب تھا۔

وقت گزاری کے لیے اس نے کچن کا کام کرنا چاہا۔ لیکن برکتے نے اسے کچن کو ہاتھ لگانے نہیں دیا۔ "بہو بیگم میں مر تو نہیں گئی ___ ابھی تو آپ کے ہاتھوں مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی اور آپ کچن میں کام کرنے آگئیں ___ نہیں جی ___ جب تک ہوں آپ کو کچن میں آنے کی ضرورت نہیں ___ ہم نے اس گھر کا نمک کھایا ___ نمک حلال ہیں ہم لوگ ___ آپ کو آرام نہیں دیں گے تو ہم کس کام کے"

برکتے مخلص تھی ___ وہ تو اپنی نئی بیگم کے آرام کا بہت خیال رکھتی تھی ___ نویلی دلہن کو چولھا جھونکنے دیتی تھی بھلا؟

حنا کو خود بھی کھانا پکانے کا کوئی خاص شوق تو تھا نہیں۔ وہ تو وقت دھکیلنے کے لیے ایسا کرنا چاہتی تھی ___ کچن میں کام نہ ملا ___ تو اس نے کمروں کی ترتیب ٹھیک کرنا شروع کر دی۔ لیکن یہاں بھی غلام محمد اور جمعدارنی نے اسے کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیا۔

"آپ حکم کر دیں کہ کون سی چیز کہاں رکھنی ہے؟" غلام محمد سینے پر ہاتھ باندھ کر بولا ___ "ہم رکھ دیں گے۔ صفائی بھی آپ کی مرضی کے مطابق ہو گی ___ آپ کسی قسم کا تردد نہ کریں ___"

حنا کے لیے اب کون سا کام رہ گیا تھا ___ اپنی اور فیاض کی الماری اس نے ایک دن ہی میں ٹھیک کر لی تھی۔ رسالے اور اخبار گھر میں باقاعدگی سے آتے تھے۔ لیکن حنا کو ٹک کر بیٹھنے کی عادت کہاں تھی۔ رسالے الٹے پلٹے اخبار کی سرخیاں دیکھیں اور بس ___

"فیاض میں بہت بور ہوتی ہوں اکیلی ___" وہ اکثر شاکی لہجے میں کہتی۔

"گانے سنا کرو ___ فلمیں دیکھا کرو ___ یہ ڈیک اور وی سی آر تمہارے بہترین ساتھی ہو سکتے ہیں ___"

لیکن ___

گانوں اور فلموں سے بھی وہ اکتا گئی ___

تنہائی اسے کاٹنے کو آتی تھی ___ اسی لیے ایک دن اس نے برکتے سے پوچھا۔

"کیے اردگرد کے گھروں میں بچے نہیں ہیں کیا؟"

"ہیں کیوں نہیں بی بی ___ دائیں کوٹھی والوں کے تین بچے ہیں ___ بائیں والوں کے ___ اور سامنے والے گھروں میں بھی بچے ہی بچے ہیں ___"

حنا نے خوشی سے لہراتے ہوئے تالی بجا کر کہا۔ "بہت خوب"

برکتے نے حیرانی سے اسے دیکھا وہ بولی۔ "برکتے ان بچوں کو لے آیا کرو یہاں ___ ان سے کھیلا کروں گی"

برکتے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔ "بہو بیگم آپ بچوں سے کھیلیں گی"

"ہاں ___ اکیلے تو میں بہت بور ہوتی ہوں ___ بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں"

"لیکن بی بی ___ لوگوں کے بچے اپنے گھر میں اکٹھے کریں گی ___"

"کیا ہوا ___"

"وہ اسکول جاتے ہیں ___"

"تو شام کو بلا لایا کرو ___"

"شام کو تو صاحب بھی آجاتے ہیں ___ اور ایاز بیٹا بھی ___ بچوں کو غل غپاڑہ کرنے دیں گے وہ ___"

حنا نے مایوس ہو کر اسے دیکھا تو وہ شوخ سے لہجے میں بولی۔ "اللہ کرے گا خیر سے اپنے گھر ہی آجائے گا تو ___"

"برکتے ——"

برکتے اس کے اس طرح ٹوکنے پہ چپ ہو گئی۔

حنا میکے گئی تو حسنہ بھابی سے اپنے اکیلے پن کا رونا رویا —— حسنہ نے تسلی دی۔

"آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی —— کوئی کام وام کیا کرو ——"

پھر اس نے ہنس کر برکتے والی بات بھی کہی "خدا کرے تمہاری گود ہری ہو جائے —— پھر دیکھنا تنہائی کیسے بھاگتی ہے، فرصت نہیں ملا کرے گی سر کھجانے کو ——"

وہ ہنس کر بولی "وہ تو جب ہو گا دیکھیں گے —— میں اب کیا کروں؟"

"اب —— اب سارا دن فیاض کے انتظار میں گزارا کرو —— انتظار بھی بڑا ہے، لذت آمیز —— پیارا پیارا، کیوں جی ——"

حنا بھابی کی بات پر مسکرا دی۔

اس دفعہ وہ میکے سے اپنی کھیل کی چیزیں ساتھ لے گئی —— بیٹ گیند، لڈو، تاش، کیرم اور دوسری کھیلیں —— ایاز اور فیاض کی چھٹی کا دن تو وہ ان سے کھیل کر گزار سکتی تھی۔ ایاز کے کالج اور فیاض کے آفس سے آنے کے بعد بھی وقت کھیل کود دیا جا سکتا تھا۔ حنا یہ سوچ کر خوش ہو گئی۔

اس دن فیاض دفتر سے واپس آیا —— کپڑے بدل کر وہ کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ حنا چائے لے آئی۔ اس نے بستر میں گھسے گھسے ہی چائے پی۔

"کچھ کھیلتے ہیں فیاض" حنا نے ایک دم ہی کہا۔

"کیا ——؟"

کھیل کھیلتے ہیں جناب۔ اتنے پریشان کیوں ہو گئے ——" حنا نے ہنس کر کہا "نہیں سمجھے، گیم، گیم سر —" وہ اس کا منہ تکتے ہوئے زیر لب مسکرایا —— حنا شہہ پا کر

"اس دفعہ میں گھر سے اپنی ساری گیمز اٹھا لائی ہوں —— جناب باہر لان میں کھیلنا چاہیں تو بیڈمنٹن، کرکٹ، فٹ بال کوئی بھی کھیل کھیل سکتے ہیں اور یہاں کھیلنا پسند فرمائیں تو کیرم لڈو تاش ٹریڈ وغیرہ وغیرہ ابھی حاضر کیے دیتی ہوں"

وہ بہت شوخ ہو رہی تھی۔ فیاض نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے مسکرا کر کہا "فی الحال تو ہم یہ گیم ——"

"ہٹیے ——" حنا نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسے پیار سے گھورا۔ "ہر وقت ایک ہی بات ——"

"حنا —— اب تم بچوں والی کھیلیں کھیلنا چھوڑ دو —— اب تم شادی شدہ ہو اور ہماری بیوی —— سمجھیں ——" اس نے پھر اسے اپنی طرف اک جھٹکے سے گھسیٹا —— حنا اس کے پہلو میں آن گری۔ لیکن اس وقت اس کا موڈ کھیلنے کا تھا۔ اس لیے چند لمحوں میں ہی پیچھا چھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی —— فیاض نے پیار بھری روٹھی روٹھی نظروں سے اسے دیکھا۔ حنا پروا کیے بغیر دوسرے کمرے میں گئی اور لڈو اٹھا لائی۔

"اٹھیے" وہ کود کر بیڈ پہ آن بیٹھی۔

"کیوں ——؟" فیاض سینے تک کمبل کھینچتے ہوئے بولا۔

"لڈو کھیلیں ——"

"بھائی یہ بچوں والے کھیل کھیلنا مضحکہ خیز لگتا ہے مجھے۔"

"آپ ابھی سے بوڑھے ہو گئے ——"

"بچہ بھی تو نہیں ہوں ——"

"جوان ہیں —— لیکن بوڑھوں والی روح گھسی ہوئی ہے آپ میں ——"

"یہی سمجھ لو ——"

"نہیں کھیلیں گے ——"

"ادں ہوں"

"کیرم لاؤں ــــ"

"نہیں بھئی ــــ"

"تاش تو کھیلیں گے نا ــــ"

"اس وقت تو کچھ بھی کھیلنے کا موڈ نہیں۔ جو موڈ تھا تم نے بگاڑ دیا ــــ" وہ شرارت سے اسے دیکھ کر ہنسا۔ "اور یہ تاش تو نہ مجھے کھیلنا آتی ہے نہ اچھی لگتی ہے۔"

حنا نے منہ بنایا۔ لُڈو اٹھائی۔ بیڈ سے چھلانگ نما انداز میں اُتری۔ فیاض نے ہولے سے کہا "آرام سے آرام سے ــــ یوں ہرنیوں کی طرح قلانچیں نہ بھرا کرو سنبھل کر اٹھا کرو حنا ــــ"

یہ اس نے مذاق میں کہا تھا یا سنجیدگی سے حنا نے غور نہیں کیا۔ وہ لُڈو لیے کمرے سے باہر چلی گئی۔

لاؤنج میں ایاز بیٹھا تھا ــــ

"بھابی یہ کیا ــــ یہ کیا ہے ــــ" وہ بولا۔

"لُڈو ــــ کھیلو گے" حنا نے جلدی سے کہا۔

"کیوں نہیں ــــ آیئے دو دو ہاتھ ہو جائیں ــــ وہ مار دوں گا آپ کو۔ وہ مار دوں گا ــــ کہ یاد رکھیں گی"

"چیٹنگ تو نہیں کرو گے" حنا لُڈو درمیانی میز پر رکھتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"ہاتھ کی صفائی ــــ" وہ ہنسا ــــ حنا نے بھی ہنس کر کہا "میں نے پکڑ لی نا، تو دھنک کر رکھ دوں گی تمہیں ــــ"

"منظور"

دونوں کھیلنے لگے ــــ حنا بہت خوش تھی۔ ایاز کے ساتھ لُڈو کھیلتے ہوئے وہ

اس بدمزگی کو بھول سی گئی۔ جو فیاض کے انکار سے ہوئی تھی۔

دونوں خوب ہنستے شور مچاتے اور چیٹنگ پر لڑتے جھگڑتے رہے۔ کافی دیر بعد فیاض کمرے سے باہر آیا تو انہیں یوں مگن دیکھ کر خاموشی سے ہی باہر نکل گیا۔

چھٹی کا دن حنا نے کرکٹ یا فٹ بال کھیلنے کا پکّا پکّا پروگرام بنا لیا ــــ

اس دن بڑی سنہری دھوپ نکلی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی تپش کا احساس جانفزا تھا ــــ حنا نے غلام محمد سے کہہ کر لان میں کرسیاں ڈلوائی تھیں ــــ فیاض نہا دھو کر اخبار لیے وہیں آبیٹھا تھا۔ ایاز بھی ادھر ہی آگیا۔

"چلو آج کرکٹ ہو جائے ــــ" حنا نے دونوں بھائیوں سے کہا۔

"ایکدم ــــ" ایاز نے اپنے ہاتھ پہ ہاتھ مارا ــــ فیاض نے حنا کو یوں دیکھا۔ جیسے وہ کوئی انتہائی نامعقول بات کہہ گزری ہو ــــ حنا نے اس کی نگاہوں کو دیکھا ہی نہیں ــــ ایاز کے ہامی بھرنے پر ہی بھاگی بھاگی اندر گئی اور وکٹیں، بیٹ، گیند لے آئی۔

"لو یہ لگاؤ" اس نے وکٹیں ایاز کو دیں۔

"تین آدمی کھیلیں گے کیسے ــــ؟" ایاز بولا۔

"آج تو ایسے کہ ایک باؤلنگ کرے، دوسرا ہٹ لگائے، تیسرا پیچھے بھاگے ٹیم برابر ــــ"

"ٹھیک ہے ــــ" ایاز بولا ــــ وہ جلدی جلدی وکٹیں گاڑنے لگا۔

"فیاض" حنا نے کہا "آپ بیٹنگ کریں گے یا باؤلنگ"

"کچھ بھی نہیں ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"بس ــــ"

"کھیلیں گے نہیں ــــ"

"تم کرکٹ کھیلو گی ــــ؟"

"ہاں ــــ میں تو بہت اچھا کھیلتی ہوں۔ پوری ٹیم بنا رکھی تھی میں نے تو ــــ سارے ساتھی چھُوٹ گئے۔"

"بہت افسوس ہے ــــ"

"ہاں ــــ اس لحاظ سے کہ اتنے ساتھی چھوڑ کر جس کو ساتھی چنا ــــ وہ ساتھ ہی نہیں دیتا ــــ"

فیاض بد دلی سے مسکرایا ــــ حنا نے اصرار کیا۔ لیکن اسے نہیں کھیلنا تھا۔ وہ تو حنا کے بھی یوں کھیلنے پر رضامند نہیں تھا ــــ لیکن ایاز کے سامنے زیادہ مخالفت بھی نہیں کر سکا۔

"نہیں کھیلیں گے ــــ"

"نہیں ــــ"

"فیاض ــــ آپ عمر سے اتنا آگے کیوں نکلنا چاہتے ہیں"

"تم عمر سے اتنا پیچھے کیوں رہنا چاہتی ہو ــــ"

حنا اس کی بات سے کچھ مرعوب تو ہوئی ــــ لیکن جلدی سے بولی "اس طرح دیر سے بوڑھی ہوں گی ــــ آپ کی طرح جوانی ہی میں بڑھاپا نہیں چاہیئے مجھے ــــ"

فیاض نے اخبار منہ کے سامنے کر لیا۔ حنا ایاز کی طرف متوجہ ہو گئی ــــ جو اس کا ساتھ دینے کو تیار کھڑا تھا۔ ایاز نے بیٹ پکڑ لیا "آپ باؤلنگ کریں۔ بھائی جان فیلڈنگ ــــ پہلے میں کھیلوں گا"

"وہ بوڑھی روح نہیں کھیلے گی" حنا نے شوخی سے فیاض کو دیکھا ــــ "ہم دونوں ہی ہیں ــــ"

"چلیے پھر ــــ"

"بیٹنگ میں کروں گی ــــ تم باؤلنگ کرو ــــ"

"نہیں میں ــــ"

"نہیں میں ــــ"

دونوں جھگڑنے لگے ــــ فیاض گاہے گاہے انہیں دیکھ رہا تھا ــــ

ایاز کو حنا کی بات ماننا پڑی۔ بیٹ اسے دے دیا۔

پھر دونوں کھیلنے اور شور مچانے لگے ــــ فیاض جانے کب اٹھ کر اندر چلا گیا ــــ یہ ایاز کو پتہ چلا نہ ہی حنا کو۔ وہ تو دونوں بڑے جوش و خروش سے رنز بنانے اور باؤلنگ کرنے میں مصروف تھے۔ دوڑ دوڑ کر حنا کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اور پسینہ پسینہ ہونے لگی تھی۔

"بس بھابھی" ایاز نے اس کی یہ حالت دیکھی تو گیند ہوا میں اُچھالتے ہوئے بولا۔

"بس ــــ" وہ کرسی پر دھم سے آن گری۔

ایاز دوسری کرسی پر بیٹھ گیا "ویسے آپ بہت اچھا کھیلتی ہیں"

"ٹیم پوری ہو تو مزہ آئے ــــ کم از کم تین چار ساتھی اور ہو جائیں نا تو ــــ"

"ساتھی کہاں سے آئیں ــــ"

"تمہارے محلے میں بچے تو ہوں گے۔ چھٹی کے دن بلا لیا کریں گے انہیں ــــ"

"ہاں ہے تو ٹھیک ــــ پھر کھیلنے کا مزہ آیا کرے گا ــــ میں جگو ننھے ہونا اور بوکی سے کہوں گا ــــ چھٹی کے دن اسی وقت آجایا کریں ــــ سامنے اور اس طرف کے گھروں ہی میں تو رہتے ہیں سب ــــ"

"واہ ــــ مزہ آجائے گا۔ پھر دیکھنا میری گیم ــــ"

"دیکھ لیں گے" ایاز مسکراتے ہوئے اُٹھا۔

دوپہر کے کھانے پر ایاز حنا کے کھیل کی تعریف کر رہا تھا۔ حنا پھولی نہ سما رہی

تھی، بار بار داد طلب نظروں سے فیاض کو دیکھ رہی تھی ——— لیکن فیاض نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف دونوں کی سنتا رہا اور دونوں کے مسکراتے چہرے دیکھتا رہا۔

اگلے ہفتے ایاز نے محلے کے چار پانچ لڑکے لڑکیاں اکٹھے کر لیے دس دس بارہ بارہ سالہ بچے خوشی خوشی کھیلنے آ گئے۔

حنا واقعی بہت اچھی بیٹنگ کرتی تھی ——— باؤلنگ ذرا ٹھیک نہیں کرتی تھی لیکن یہ کمی جگنو پوری کر رہا تھا۔

کھیل خوب پُرلطف رہا۔ سب نے خوب شور مچایا۔ قہقہے ہنسی تالیاں آوازے، خوب ہنگامہ تھا ——— فیاض آج لان میں بھی نہیں آیا۔ کمرے کی کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

حنا دو گھنٹے کی اچھل کود کے بعد کمرے میں آئی تو بہت خوش تھی آتے ہی نعرہ لگایا۔

"بھئی مزہ آگیا آج ——— فیاض ———"

فیاض صوفے پر نیم دراز کوئی میگزین دیکھ رہا تھا ——— وہ اس کی طرف آئی اور صوفے پر دھم سے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی "اب اس رسالے ہی میں الجھے رہیے۔ باہر آکر دیکھتے نا ——— میں کتنا اچھا کھیلتی ہوں ———" اس نے فیاض سے رسالہ چھیننا چاہا۔

لیکن فیاض نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ——— حنا ہراساں سی ہو کر بولی "کیوں کیا ہوا ———"

"کچھ نہیں ———"

"پھر ——— پھر آپ ناراض ———"

"میں کوئی ناراض واراض نہیں ———"

"فیاض ———"

"پڑھنے دو مجھے ———"

حنا چند لمحے خاموش سے اُسے تکتی رہی۔ پھر اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی ——— وہ نہانے اور کپڑے بدلنے ہی اندر آئی تھی۔

تیار ہو کر وہ پھر فیاض کے پاس آ بیٹھی ——— فیاض نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ تو وہ بولی "فیاض آپ کو میرے کھیلنے پر اعتراض ہے؟"

"نہیں ———" اس نے بے تعلقی سے کہا۔

"تو پھر خفا کیوں ہیں ———"

"تمہیں کیا ———"

مجھے کیوں نہیں ———"

"تمہیں احساس ہو تو موقع ہی کیوں دو ———"

"موقع ہی دیا کہ کھیل ———"

"حنا ——— یہ لڑکوں والے کھیل اک بیاہتا لڑکی کو اچھے لگتے ہیں ———؟"

حنا چند لمحے چپ رہی۔ پھر اس نے گلے میں باہیں ڈال کر بچوں کی سی معصومیت سے بولی "فیاض مجھے ان کھیلوں سے خوشی ملتی ہے۔ کیا آپ مجھے یہ ننھی منی خوشیاں چلتے نہیں دیکھ سکتے ———"

فیاض اس کی معصومیت کے سامنے ڈانواڈول ہو گیا۔ اسے بازوؤں میں بھر کر پیار کر لیا ——— ہولے سے بولا "تم تو واقعی منّی سی بچی ہو ———"

"اور آپ عمر رسیدہ" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— فیاض نے بُرا نہیں مانا ———

اس دن ایاز ایک فلم کی خبر لایا "بھابی ——— ایک بڑی شاندار فلم آئی ہے چلیں گی دیکھنے ———"

اپنے بھائی سے کہو ــــ"

"آپ کہیں نا ــــ"

"نہیں بھئی ــــ میں تو نہیں کہوں گی ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"انکار کر دیں تو ــــ"

"آپ انہیں اصرار کر کے منا لینا ــــ بہت غضب کی پکچر ہے ۔ میرے دو تین دوستوں نے دیکھی ہے ۔ ضرور دیکھیں گے ہم بھی ۔ آپ بھائی جان کو تیار کریں ــــ"

"اچھا ــــ ویسے موری دیکھنے کا انہیں شوق تو نہیں لگتا ۔"

"دیکھتے تو شاید ہی ہیں ۔ وی سی آر پہ بھی کبھی کبھار دیکھتے ہیں ۔ سینما ہاؤس جانا تو ـ"

"پھر ــــ"

"آپ کی بات مان لیں گے کہیے تو سہی ــــ"

حنا نے کہا ۔

لیکن ۔

فیاض نے پس و پیش کی ــــ سینما ہاؤس میں تین گھنٹے بیٹھ کر فلم دیکھنا اسے بور لگتا تھا ۔

"ایاز کہتا ہے ۔ بڑے غضب کی فلم ہے ۔"

"تو تم چلی جاؤ نا اُس کے ساتھ ــــ"

"آپ نہیں جائیں گے ۔"

"اوں ہوں ــــ"

"ہم جائیں ــــ"

"چلے جاؤ ــــ"

"آپ بھی چلتے تو مزہ آتا ــــ"

"تم دونوں خوب انجوائے کر سکتے ہو ــــ میری کیا ضرورت ــــ"

حنا کے سر پر فلم دیکھنے کا بھوت سوار تھا ــــ وہ فیاض کی باتوں میں کھُلی تلخی کو محسوس ہی نہ کر پائی ۔ بھاگی بھاگی ایاز کے کمرے میں آئی اور بولی "چلو بن گیا پروگرام ــ"

"بھائی جان مان گئے ــــ"

"اجازت دے دی ہے ہمیں ــــ"

"وہ نہیں جائیں گے ــــ؟"

"نہیں بھئی ــــ حسبِ عادت انہیں کام کرنے ہیں ۔ پڑھنا ہے ۔ یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے ــــ چلو یہ بھی اچھا ہوا ہمیں اجازت تو دے دی ــــ"

"بس ٹھیک ہے ــــ آج ہی چلتے ہیں ــــ آپ تیار ہو جائیں ــــ یہی شو دیکھ لیتے ہیں ۔ جلدی سے تیار ہو جائیں ــــ"

"تیار کیا ہونا ہے ــــ ٹھیک ٹھاک کپڑے ہیں ــــ"

"ٹھیک ہے ۔"

دونوں پکچر دیکھنے چلے گئے ۔

رات دس بجے کے قریب واپس لوٹے تو دونوں اتنی اچھی فلم دیکھنے سے بہت خوش تھے ۔

غلام محمد گیٹ کھولنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا ۔ اور برکتے کھانا دینے کے لیے کچن میں بیٹھی تھی ۔

دونوں کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں آ گئے ۔

"کھانا لگا دوں ــــ؟" برکتے نے پوچھا ۔

"ہاں ــــ" ایاز بولا ۔

"صاحب نے کھانا کھا لیا ــــ" حنا بولی ۔

"جی ہاں ۔۔۔ تھوڑی دیر ہی ہوئی ۔۔۔ آپ کا انتظار کر کر کے کھا ہی لیا آخر۔"

"انہیں پتا نہیں تھا کہ فلم ختم ہوتے اور گھر آتے دس بج ہی جائیں گے۔"

"پتا نہیں جی۔" برکتے کھانا نکالنے باورچی خانے میں چلی گئی۔

کھانے کے بعد حنا خوشی خوشی کمرے میں آئی۔ اس کا موڈ بن رہا تھا کہ ساری کہانی فیاض کو سنا کر اسے فلم دیکھنے پر اکسائے گی اور کل دوبارہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے جائے گی۔

لیکن۔

اس کے آنے پر فیاض جاگتے ہوئے بھی سوتا بن گیا۔ اس کے جگانے پر اوں آں کی ۔۔۔ حنا کو اس پر بہت غصہ آیا ۔۔۔ عجیب سی عادتیں تھیں اس کی۔ ان عادتوں کو سمجھنے اور ان سے سمجھوتا کرنے کے بجائے اسے طیش آنے لگا ۔۔۔

وہ پھنکاری ۔۔۔ اور کچھ بولے بنا کپڑے بدل کر بیڈ کے ایک کنارے پڑ کر لیٹ گئی ۔۔۔ بڑی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔

صبح وہ ناراض ناراض اٹھی۔ لیکن فیاض نے خود ہی اسے بلا لیا ۔۔۔ فلم کے بارے میں پوچھا ۔۔۔ تو وہ بہل گئی۔

یوں بہت عرصہ چلتا رہا۔ کبھی فیاض کا موڈ ٹھیک ہو جاتا۔ کبھی حنا کا بگڑ جاتا۔ کبھی وہ منا لیتی۔ کبھی فیاض ہار مان جاتا ۔۔۔ حنا نے کسی حد تک فیاض کی ناراضگی کو سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ کھلنڈرے پن کو بدلنے لگی۔ کھیل کود میں حصہ لینا بھی کم کر دیا۔ سنجیدہ بننے کی شعوری کوشش بھی کرنے لگی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔

ایاز کی ذات ان دونوں کے درمیان غیر محسوس طریق سے آتی جا رہی تھی ۔۔۔ حنا کی اس سے بہت دوستی تھی ۔۔۔ وہ اس کا بہترین ساتھی تھا ۔۔۔ اس کا کہنا مانتا تھا، ساتھ دیتا تھا۔ مخلص اور ہمدرد بھی تھا۔

ایک دن حنا نے فیاض سے باتوں باتوں میں کہہ ہی دیا۔ "آپ سے تو ایاز ہی اچھا ہے۔ کتنا خیال رکھتا ہے۔ میری ننھی منّی خوشیوں کا ۔۔۔ اس کی کمپنی مجھے نہ ملتی تو اس گھر میں میں تو گھٹ کے رہ جاتی۔ بابا آپ تو بہت سوبر ہیں ۔۔۔ عمر میں پہلے ہی مجھ سے کافی بڑے ہیں۔ اس پر یہ کہ اپنی عمر سے بھی دس پندرہ سال آگے نکلتے ہیں ۔۔۔"

"ایاز تمہیں اچھا لگتا ہے؟ ۔۔۔"

وہ جھٹ سے بولی "بہت اچھا۔ بہت پیارا ہے ۔۔۔ میں نے کہا نا ۔۔۔ اس کی کمپنی مجھے نہ ملتی۔ تو میں اس گھر میں ۔۔۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

یہ ہنسی فیاض کے دل میں تیر کی طرح اُتر گئی ۔۔۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا "میں کیسا ہوں ۔۔۔؟"

وہ شوخی کے موڈ میں تھی بولی "ایک دم بور ۔۔۔"

"اچھا ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔" وہ اس کا منہ چڑا کر بھاگ گئی ۔۔۔ فیاض بے سہارا ستون کی طرح صوفے پر گر گیا ۔۔۔ پھر ۔۔۔ پھر اس کے ذہن میں جو اتنے عرصے سے سنپولیے رینگ رہے تھے ۔۔۔ سانپ بن کر پھنکارنے لگے ۔۔۔ وسوسے کا زہر ۔۔۔ شک کا زہر ۔۔۔ اُلجھاؤ کا زہر ۔۔۔ پھر یہ زہر ہولے ہولے چپکے چپکے ازدواجی زندگی کے اندر پھیلتا، اُترتا چلا گیا ۔۔۔ فیاض نے اپنے اُوپر ظاہرداری کا ایسا لبادہ اوڑھ لیا کہ حنا جیسی معصوم اور سادہ سی لڑکی کچھ جان نہ سکی، پہچان نہ پائی ۔۔۔ وہ سرپھری سی لڑکی اپنے حال ہی مست رہی۔ ننھی منی خوشیاں سمیٹتی رہی اور اپنا دامن بھرتی رہی ۔۔۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی وہ خیال نہیں آیا ۔۔۔ جو فیاض کی ہستی کو ہلا گیا تھا ۔۔۔ تخریبی عناصر ذہن میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے تھے۔ انھیں تو ۔۔۔۔ پھیلانا تھی ۔۔۔ فیاض

ٹک کا چشمہ آنکھوں پر لگا چکا تھا —— حنا کی ایک ایک حرکت ایک ایک بات کو ام
سے دیکھنے لگا۔

حنا سے سرد مہری تو وہ برت رہا تھا۔ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزارتا۔
ہوتا بھی تو سیدھے منہ بات نہ کرتا —— اپنے آپ ہی میں اُلجھا رہتا ——
کچھ اتنی آہستگی اور غیر محسوس طریق سے ہوا تھا۔ کہ حنا چاہتے ہوئے بھی اس تبدیلی
متعلق پوچھنے کی ہمّت نہ کرتی۔ اس نے تو یہ سب کچھ اس کی سنجیدہ طبیعت کا حصہ
لیا تھا۔

لیکن

جب کبھی فیاض کی کوئی بات، کوئی نظر، کوئی فقرہ تیر کی طرح سنسناتا ہوا اس
اندر اُتر جاتا تو وہ پریشان ہو جاتی، اس پریشانی کو ایاز محسوس کرتا تو ہمدردی سے
"کیا ہوا بھابی —— بہت اپ سیٹ ہیں —— بھائی جان نے کچھ کہا ——؟"

"کچھ کہتے ہی تو نہیں ——" اس دن حنا نے ایاز کو ہمدرد پا کر کہہ ہی دیا۔

"کیا مطلب ——؟"

"میں خود نہیں سمجھ پاتی —— جانے کیا ہوتا جا رہا ہے انہیں۔ ڈھنگ سے
ہی نہیں کرتے۔ ہر وقت اُلجھے اُلجھے رہتے ہیں ——"

"آپ پوچھیں نا ان سے ——"

"ہمت نہیں پڑتی —— کبھی کچھ کہوں بھی تو ایسے برفیلے انداز میں جواب
ہے کہ روح کانپ جاتی ہے ——"

"میں بھی بھائی جان کے رویے کی سرد مہری محسوس کرتا ہوں"

"ایاز میں کیا کروں ——" وہ پھوٹ سے رونے لگی۔ ایاز نے اس کے کندھے
ہاتھ رکھ کر اسے تھپتھپاتے ہوئے تسلّی دی "میں پوچھوں گا بھائی جان سے ——"

وہ اسے قریب بیٹھا تسلّی دے رہا تھا کہ اس وقت فیاض کمرے سے نکل کر لاؤنج
سے گزرا، اک اچٹتی سی نگاہ دونوں پر ڈالی پھر تیزی سے باہر نکل گیا —— ایاز کو کچھ
کہنے کی ہمّت ہی نہ ہوئی۔

"دیکھا تم نے" حنا آنسو پونچھتے ہوئے بولی "مجھے روتے دیکھ کر بھی نہیں رُکے
بے تعلقی سے باہر نکل گئے ہیں ——"

ایاز نے بھی پریشان ہو کر سر جھکا لیا —— بھائی کا یہ رویّہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔

یوں

بے شمار چھوٹے موٹے واقعے پیش آئے۔

حنا کی طبیعت خراب تھی نزلہ زکام تھا۔ حرارت بھی تھی۔ ایاز اس کی احوال پرسی کرنے
کمرے میں آیا —— اس نے حنا کو دوا کھلائی۔ اور آرام کرنے کی تاکید کرنے لگا ——
"شام کالج سے واپس آکر آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا ——"

"اس کی ضرورت نہیں۔ زکام ہی تو ہے" حنا شال سے سر لپیٹتے ہوئے بولی۔

"ساتھ بخار بھی ہے" اس نے حنا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر حرارت دیکھی۔

"اُتر جائے گا" حنا نے اس کا ہاتھ آہستگی سے ماتھے سے ہٹا دیا۔

فیاض کھڑکی سے باہر کھڑا کھڑکی کے شیشے میں پڑتا ان دونوں کا عکس دیکھ
رہا تھا۔

ایک دن فیاض دفتر سے گھنٹہ بھر لیٹ واپس آیا۔ کمرے میں آیا تو میز پر دو خالی
پیالیاں پڑی تھیں، دو کوارٹر پلیٹیں اور ایک پیالہ بھی پڑا تھا —— میز صوفے کے سامنے
تھا۔ فیاض کو اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ دونوں نے یہاں چائے پی اور چاٹ کھائی ہے۔
اور کر پیالے میں تھوڑی سی چاٹ بھی تھی۔

حنا بھی اس کے پیچھے ہی اندر آگئی۔

فیاض نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی ـــ حنا اس کا کوٹ اُتروانے آگے بڑھی،
نے گھوم کر اسے زہرناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون آیا تھا؟"

"کوئی نہیں ـــ" وہ حیران ہو کر بولی۔

فیاض نے طنزیہ مسکراہٹ اُچھالی اور میز کی طرف دیکھا۔ حنا نے اس کی نگا
کا تعاقب کرتے ہوئے میز پر پڑے جھوٹے برتن دیکھے تو مسکرا کر بولی "میں سمجھی آپ
مہمان کا پوچھ رہے ہیں۔ یہ تو میں نے اور ایاز نے چائے پی تھی ایاز چاٹ لایا
بڑے مزے کی تھی ـــ آپ کے لیے بھی رکھی ہے ـــ"

وہ فیاض کی بات سننے سے پہلے ہی لپک کر گئی ـــ اور چاٹ کا پیالہ لائ

لیکن

وہ

دہل گئی

فیاض نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے الٹا ہاتھ مار کر پیالہ پرے گرا
دیا تھا۔

اس دن وہ دوسرے کمرے میں جا کر بہت روئی۔

اور

اس دن بھی ایاز نے محبت اور پیار سے اپنی معصوم سی بھابی کے آنسو پونچھ
ہوئے پورے خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

بھائی کا یہ رویہ اس کی سمجھ سے بھی بالا تھا۔ وہ خود کون سا جہاندیدہ آدمی تھا
نوعمر ہی تھی، ناسمجھی تھی ـــ ماں کا پیار نہیں ملا تھا ـــ تو بھابی کے پیار میں ممتا پائی
تھی ـــ بھابی کے دکھ اسے ڈستے تھے۔ اپنے پیار کا برملا اظہار کرتا تھا۔ ہمدردی جتا

تسلی دیتا تھا۔ بھابی اسے ماں کی طرح عزیز تھی۔

"بھابی آپ نہ رویا کریں ـــ میں آپ کے آنسو دیکھ نہیں سکتا۔ اگر بھائی جان
کا آپ کے ساتھ یہی رویہ رہا ـــ تو میں کسی دن ان سے اُلجھ بیٹھوں گا ـــ"

"نہیں" حنا نے جلدی سے کہا "تم نے اپنے بھائی کے سامنے منہ کھولنے کی جرأت
کی، تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

"عجیب ہیں آپ بھی بھابی ـــ بے قصور، بے گناہ زیادتی برداشت کیے جا رہی
ہیں۔ خود زبان کھولتی ہیں نہ مجھے کھولنے دیتی ہیں ـــ"

ایاز نے غصے میں آ کر اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا اسے۔ حنا کو اس پر بڑا پیار آیا۔ اس
کے ماتھے سے بال اٹھاتے ہوئے بولی "میرے منے بھائی ـــ تیری ہمدردی ہی کافی
ہے میرے لیے ـــ اس سے آگے نہ بڑھنا نہ میں بڑھنے دوں گی ـــ ہم میاں بیوی
ہیں، لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے ـــ"

"بلاوجہ؟"

"یہی سمجھ لو ـــ"

"یہ زیادتی ہے ـــ"

"نہیں ایاز قصور میرا بھی تو ہے۔ مجھے تو بھابی اور بہنوں نے پہلے بھی سمجھانے
کی بہت کوشش کی تھی، کہ فیاض جیسے سنجیدہ آدمی کے ساتھ میرا کھلنڈرا پن نہیں چلے
گا ـــ لیکن میں ناسمجھ تھی ـــ سوچا تھا وہ یہ سب کچھ گوارہ کر لیں گے اور وقت
کے ساتھ ساتھ میں خود بخود سوبر ہو جاؤں گی ـــ"

"لیکن بھیا نے شاید پیار محبت نہیں دیا ـــ"

"ٹھیک ہے۔ میں احتیاط برتوں گی ـــ"

وہ دونوں کافی دیر تک دکھ سکھ بانٹتے رہے ـــ فیاض اس سے بھی بے خبر

نہیں رہا۔ ان کی کچھ باتیں اس کے کانوں میں بھی اُتریں اور کیا اُتریں زہر گھول گئیں۔

پھر

فیاض بات بے بات ایاز سے بھی الجھنے لگا ــــ ایاز کا جوان خون تپ اُٹھا لیکن بھابی کی وجہ سے چپ تھا ــــ

لیکن

ایک دن جب فیاض نے معمولی سی بات پر نوکروں کے سامنے اس کی بے عزتی کر ڈالی ــــ تو وہ لال بھبوکا ہوگیا ــــ حنا بھی سامنے کھڑی تھی۔

وہ غصے سے لرزتے ہوئے بولا "میں ان کی خاطر چپ ہوں بھائی جان، ورنہ"

"ورنہ کیا ــــ؟" فیاض نے اک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ حنا ناز برداشت نہ کر پائی دوڑ کر کمرے میں بستر پر جا گری ــــ منہ چھپا کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی ــــ

ایاز اس بلاوجہ بے عزتی پر تھرا اٹھا ــــ لیکن کچھ بولا نہیں ــــ ہاتھ نہیں اٹھایا۔ پلٹا اور تیز قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

فیاض روز بروز خونخوار ہی ہوتا چلا گیا۔ اور ایک دن اس نے حنا پر بھی ہاتھ اٹھا لیا ــــ

اس کے تھپڑ نے حنا کا سارا وجود ساری ہستی ہلا ڈالی ــــ گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ فیاض کو گہری نظروں سے دیکھا اور غراتے ہوئے بولی "آپ کو ہوتا کیا جا رہا ہے۔ آپ اب میری برداشت سے باہر ہو رہے ہیں۔ مجھے آج تک کسی نے پھول تک نہیں مارا ــــ آپ نے تھپڑ مارا ــــ کیوں ــــ کس خطا پر ــــ کس جرم کی سزا دے رہے ہیں آپ مجھے"

"بکواس بند کرو" وہ زور سے دہاڑا ــــ

آواز سن کر ایاز بھی آگیا ــــ

"کیا ہوا؟ کیا ہوا بھابی؟" اس نے بھابی کو تھام لیا ــــ

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے" فیاض دہاڑا ــــ ایاز نے بہتری اسی میں سمجھی کہ حنا کو کمرے سے باہر لے جائے۔

لیکن

آج حنا کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا تھا ــــ وہ اس کی زیادتی پر زور زور سے چیخ رہی تھی ــــ رو رہی تھی ــــ واویلا کر رہی تھی۔ ایاز اسے سمجھا رہا تھا ــــ غصہ تھوکنے کے لیے منتیں کر رہا تھا۔

"میں یہ زیادتی برداشت نہیں کروں گی"

"بھابی پلیز! بھائی جان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو جو جی میں آئے کہہ لیجئے گا۔ اب چپ ہو جائیے میرا تو دل ہول رہا ہے ــــ غصے میں انسان پاگل ہو جاتا ہے ــــ کچھ نہیں سمجھتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، کیا کر رہا ہے ــــ پلیز ہمت کریں۔ آپ تو مجھے منع کرتی تھیں ــــ آپ خود ــــ"

حنا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس دن سے دوریوں کی خلیج اور گہری ہوتی گئی۔ ایاز کی ہستی کا سہارا نہ ہوتا تو شاید حنا فیاض سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ کر میکے آ گئی ہوتی۔ لیکن آفریں تھی حنا کی ہمت اور برداشت پر گھر جہنم کدہ بنا ہوا تھا۔ لیکن اس نے ایک بات بھی میکے تک نہ پہنچائی تھی۔ حالات کے سدھرنے کے انتظار میں مر مر کر جیتی رہی۔

وہ اکثر ایاز سے کہتی "فیاض مجھے پسند نہیں کرتے۔ نفرت کرتے ہیں مجھ سے۔ میں ان کے معیار پر پوری نہیں اُتری۔ اتنے سوبر آدمی کو لڑکا ٹائپ لڑکی کیسے پسند آتی ــــ"

"لیکن اب تو آپ ایسی نہیں رہیں ــــ بدل ڈالا ہے اپنے آپ کو"

"پتا نہیں پھر بھی کیوں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

"میں خود نہیں سمجھ پاتا —— بھابی ہمیں کسی بڑے سے مشورہ لینا چاہیے۔ اپنی امی یا بھابی ——"

"نہیں ایاز —— میں اپنے دکھ یہیں تک محدود رکھوں گی ——"

ایاز کو دلی افسوس تھا —— کھلنڈری، شوخ و شنگ ہر وقت اچھل کود کرنے، ہنسنے ہنسانے والی، معصوم سی بھابی کو دکھی دیکھ کر اسے دلی افسوس ہوتا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ نہ پاتا تھا کہ کیا کرے۔

وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

حنا اور فیاض میں دوری پھیلتی چلی گئی —— اور یہ دوری اتنی پھیلی کہ فیاض نے چپ چاپ ایم ایس کرنے کے لیے امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا —— وہ حنا سے دور بہت دور چلا جانا چاہتا تھا —— اسی لیے خاموشی ہی سے تیاری بھی کر لی۔

چھوٹی سی بات بہت بڑی ہو گئی تھی۔ شروع میں شاید حنا نے ہوشمندی سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن اس کا قصور بھی نہ تھا —— دانشمندی سے فیاض ہی کام لیتا تو معاملہ نہ بگڑتا —— لیکن وہ بھی کسی حد تک سچا تھا —— اپنی اور حنا کی عمروں کے تفاوت اور مزاجوں کے تضاد نے اسے اس وہم میں مبتلا کر دیا تھا کہ حنا اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی —— اس پر ایاز کی شخصیت درمیان میں آ گئی —— دونوں ہم عمروں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر اس کا وہم شک بن گیا —— وہ اعتماد کھو کر بیٹھا —— خود بھی ٹوٹا پھوٹا، حنا کو بھی شکستہ کر ڈالا۔ اس نے نیت کر لی کہ امریکہ جاتے ہی حنا کو الگ کر دے گا —— تاکہ وہ ایاز کے ساتھ اپنی دنیا آباد کر سکے۔

جانے سے ایک دن پہلے ہی حنا کو پتا چلا —— تو وہ گھبرا گئی —— پریشان ہو گئی —— فیاض سے کئی دنوں سے بول چال بند تھی۔ لیکن وہ خود ہی اس کے پاس چلی آئی ——

روہانسی ہو کر پوچھا "آپ امریکہ جا رہے ہیں؟"

"ہاں" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے ——" اس کا دل ڈوب گیا۔ سسکتے ہوئے بولی "مجھے کس کے پاس چھوڑ کر جا رہے ہیں —— میں کہاں رہوں گی؟"

"یہیں۔"

"میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"تم اکیلی نہیں ہو گی۔ ایاز جو ہے۔"

"ایاز —— ایاز میرا بھائی ہے۔ اچھا ساتھی ہے۔ لیکن —— میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، نہیں رہ سکتی فیاض۔"

وہ روئی، سسکی، تڑپی۔

لیکن فیاض پتھر بنا رہا۔

"آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟" حنا نے اپنی سُرخ متوّرم آنکھوں کو آنچل سے پونچھتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیوں، میرا جُرم؟ میری خطا؟ میرا قصور؟" اُس نے دکھ سے پوچھا۔

فیاض منہ موڑتے ہوئے بے رحمی سے بولا "عمروں کا فرق اور سوچوں کا تضاد۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے فیاض کا کندھا جھنجھوڑ ڈالا۔

"بننے کی کوشش مت کرو" فیاض نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر کٹیلے لہجے میں بولا۔ "تم ایاز کے ساتھ خوش رہتی ہو.... خوش رہو گی...."

"فیاض" حنا کا ماتھا پہلی بار اس طنز میں چھپے شک پر ٹھنکا "تم نے مجھ پر شک کیا؟"

فیاض نے منہ پھیر لیا۔ بیدردی سے بولا "میں اور دھوکا نہیں کھا سکتا۔ میں تمہیں آزاد

کردوں گا ـــــ تم اور ایاز ـــــ"

وہ چیخی۔ پلک کراس کے سامنے آگئی ـــــ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

وہ پتھر دل بنا رہا۔

وہ اُسے تکتی رہی۔

فیاض اتنا تنگ نظر، ایسا تنگ دل اور ذلالت کی حد تک سوچ رکھنے والا ہو سکتا تھا، اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا

اس کا بدن کانپنے لگا۔

دماغ چکرانے لگا۔

آنکھیں پھٹنے لگیں۔

اور پھر ـــــ پھر فیاض جو اس کے لیے عظیم تھا۔ جو اُسے محبوب تھا اور جس کی خوشی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی سادگی اور معصومیت کو توڑ پھوڑ کر اک نئی جہت میں اپنا آپ موڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ فیاض اسے ایک دم ہی اتنا چھوٹا اتنا حقیر اور اتنا بے وقعت لگا کہ اُسے کچل دینے کی خواہش اس کے اندر بھڑک اٹھی۔

وہ دہاڑی اور اس پر جھپٹ پڑی۔

جذباتی دھچکے سے وہ بے ہوش ہو کر نہ گر پڑتی تو اس بے مروت اور بے رحم انسان کا گلا ضرور گھونٹ دیتی۔

جس نے اُسے سمجھا نہیں تھا۔

اور

سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

لیکن

ظلم تو یہ ہوا۔ کہ وہ ایسی بے ہوش ہوئی کہ پھر ہوش میں نہیں آئی۔

اندازِ مسیحائی

ڈاکٹر اسد ملک پرائیویٹ کمروں کے مریضوں کو دیکھنے کے بعد اب زنانہ جنرل وارڈ کا راؤنڈ لے رہے تھے۔ ان کے ساتھ سفید اوور آلز میں ملبوس تین جونیئر ڈاکٹر بھی تھے۔ دو تین نرسیں بھی تھیں۔ وارڈ نرس ہر مریض کا چارٹ جب ڈاکٹر بیڈ کے پاس جاتے تو لے کر سامنے آ جاتی۔ ڈاکٹر چارٹ دیکھتے۔ دوائیاں دینے کا پوچھتے۔ پھر مریض کی احوال پُرسی کرتے۔

"کوئی تکلیف تو نہیں اب؟"

تکلیف ہوتی تو مریض بتا دیتے۔ ڈاکٹر تسلی دلاسے دیتے اور ضرورت سمجھتے تو دوائی تبدیل کر دیتے۔ وارڈ میں سولہ بیڈ تھے۔ جن میں سے صرف دو خالی تھے۔ باقی سب پر عورتیں اور بچے پڑے تھے۔ ان مریضوں کے ساتھ ایک تیماردار بھی تھا۔ ایک بیڈ کے ساتھ ایک تیماردار کو رہنے کی اجازت تھی۔ مریضوں کی احوال پُرسی کو آنے والوں کے لیے اوقات مقرر تھے۔ جب سے ڈاکٹر اسد ملک نے اس اسپتال کا چارج لیا تھا۔ وہ ان اوقات کی پابندی بہت سختی سے کرواتے تھے۔ ان مقررہ اوقات کے علاوہ کوئی ان کمروں نہیں آ جا سکتا تھا۔ مریضوں کے آرام اور بہتری کے لیے وہ اس سختی پر مجبور تھے۔ جنرل وارڈ بھی اب صاف ستھرے تھے۔ اور مریضوں کی دیکھ بھال بھی اب بہت اچھی ہوتی تھی۔ سہل پسند ڈاکٹر، ڈاکٹر اسد ملک کی وجہ سے اب چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ نرسیں بھی بڑی مستعد ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر اسد کی اصول پسندی سے واقف تھے۔

ڈاکٹر اسد پچھلے سال ہی یہاں آئے تھے۔ وہ بیس سال بعد وطن لوٹے تھے، وہ مڈل ایسٹ کے کئی ملکوں میں رہنے کے بعد چار پانچ سال امریکہ کے اسپتالوں میں کام کرکے آئے تھے۔ ان بیس سالوں میں انھوں نے جو کچھ سیکھا تھا۔ جتنا تجربہ حاصل کیا تھا اس سے اب اپنے ہم وطنوں کو مستفید کرانا چاہتے تھے۔ ہر چند یہاں ان کا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ ماں باپ تھے نہ ہی کوئی بہن بھائی۔ پھر بھی وہ اپنی جڑیں اپنی سرزمین ہی میں پھیلی محسوس کرتے تھے۔ اس مٹی سے انہیں پیار تھا۔ یہ پیار انھیں واپس کھینچ لایا تھا۔ اور وہ بہت اچھی جاب چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ انھوں نے ان ملکوں میں رہ کر اتنا کما لیا تھا کہ ان کے بچّے تو کیا بچوں کے بچّے بھی اس کے سہارے عیش کی زندگی گزار سکتے تھے۔ پہلے پہلے ان کی بیوی عظمیٰ نے واپس آنے کی مخالفت بھی کی تھی ان کے دونوں بیٹے بھی واپس آنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن جب ڈاکٹر نے انھیں سمجھایا۔ نشیب و فراز سے آگاہ کیا کہ دیارِ غیر میں مدتوں رہنے کے باوجود اجنبیت حاوی رہتی ہے۔ کوئی غیر ملکی، ملکی تحفظات پانے کے باوجود ملکی نہیں ہو پاتا۔ اغیار میں کھو کر انسان اپنا تشخص بھی شناخت نہیں کر پاتا۔ تشخص اپنی مٹی ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی میں نمو پاتا ہے۔ اور پھلتا پھولتا ہے۔ جو عزت جو مان اور جو تفاخر اپنی مادرِ وطن کی آغوش سے اُبھرتا ہے۔ اسے کسی شناخت، حوالے یا پہچان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

عظمیٰ، ڈاکٹر کی باتوں سے قائل ہو گئی۔ بچوں کی عمریں ابھی ان حدود کو نہ پہنچی تھیں کہ وہ اپنا انتخاب اور پسند کا حق استعمال کر سکتے۔ بڑا بیٹا سولہ برس کا تھا۔ چھوٹا چودہ کا ــــ بیٹی تو صرف آٹھ سال کی تھی۔

یہاں آکر چار چھ ماہ اپنے آپ کو ماحول اور ماحول کو اپنے آپ میں مدغم کرنے میں صرف ہو گئے۔ پھر سلسلہ ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹر اسپتال میں اپنی ذات جذب کرنے لگے۔

بچّے اسکول اور پڑھائی میں لگ گئے۔ اور عظمیٰ بیوی اور ماں کی ساری ذمّے داریاں نبھانے میں لگ گئی۔ ایک خوبصورت اور صاف ستھرے علاقے میں انھوں نے پیارا سا گھر خرید لیا تھا ــــ یہ گھر عظمیٰ پورے طور پر گھر بنانے میں مصروف رہتی تھی۔ ڈاکٹر ملک کو جتنے سکون، اطمینان اور آرام کی ضرورت تھی، وہ اسے بہم پہنچانے میں کوشاں رہتی۔ ڈاکٹر کا مشن دکھی انسانیت کی خدمت کرنا تھا ــــ اور عظمیٰ کا مشن ڈاکٹر کی خدمت کرنا تھا۔ عظمیٰ جیسی پُرخلوص اور فرض شناس بیوی ڈاکٹر کی خوش بختی تھی ــــ ورنہ ان کے اندر عورت اک خوف اور ڈر کا نام بن چھپی بیٹھی تھی۔ وہ تلخ تجربوں کی آتش جلتی محرابوں تلے سے گزرے تھے کہ عورت انھیں پتھر کا ایسا نوکیلا ٹکڑا لگتی تھی۔ جو صرف چوٹ ہی نہیں لگاتا۔ زخم کے اندر تک اُتر جاتا ہے۔ بہت ڈرتے ڈرتے انھوں نے عظمیٰ سے شادی کی تھی، لیکن انھیں بہت جلد احساس ہو گیا کہ ہر عورت پتھر کا نوکیلا ٹکڑا نہیں ہے۔ بلکہ محبتوں اور چاہتوں کا ایسا نخلستان بھی ہے۔ جہاں صحراؤں میں بھٹکنے والے پیاسے مسافروں کے لیے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے بہتے ہیں۔

درختوں کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں میسر آتی ہے۔ اور صر صر کرتی ہوائیں چلتی ہیں۔

ڈاکٹر نے بھی عظمیٰ کو پیار کی پھوار میں پوری طرح بھگو دیا تھا۔ احترام کے در وا کیے تھے، مان دیا تھا۔ اعتماد کے نقطۂ عروج تک پہنچایا تھا۔

"میری طرف سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی مجھے احساس دلا دیا کرو۔ میں نہیں چاہتا، میری لاعلمی سے تمہارے کسی جذبے کو گزند پہنچے۔" اسد کہتے۔

عظمیٰ ہنس دیتی" ــــ تم نے مجھے وہ سب کچھ دیا۔ جس کی ایک عورت خواہش کر سکتی ہے۔ لیکن جانتے ہو نا ایک خواہش میرے دل میں ایسی بھی ہے جو تم دے ہی نہیں سکتے۔"

"ہاں بھئی ــــ خواہشوں پر لگام تو ہوتی نہیں۔ تکی بے تکی چلی آتی ہیں۔" ڈاکٹر بھی

مسکرا کر کہتے "ویسے عظمیٰ تم واقعی عام عورتوں سے ہٹ کر ہو۔ کوئی عورت اپنے پیار میں دوسری عورت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک تم ہو کہ۔۔۔۔"

ڈاکٹر کی شوخ مسکراہٹ سے محظوظ ہو کر وہ کہتی "مجھے تمہارے پیار میں حصے دار عورت کی خواہش نہیں ہے جناب! مجھے تو اس عورت کی خواہش ہے جو ہم دونوں پر پیار کی بارش کر سکتی ہو۔ میری ماں نہیں تھی، سوچا تھا۔ ساس ملے گی تو ممتا کا سارا حق ان سے وصول کروں گی ــــ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ تمہاری ماں بھی نہیں۔"

"ماں واقعی ابرِ رحمت ہوتی ہے اور میری ماں نے بہت پہلے مجھے اس شفقت سے محروم کر کے کڑی دھوپ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا ــــ کچھ بزدل تھی شاید وہ۔ تنگی ترشی سے نباہ نہ کر پائی، چپکے سے مر گئی۔"

"کاش وہ زندہ ہوتیں اسد۔ مجھے کسی بزرگ کے سایۂ عاطفت کے بغیر اپنا گھر ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔" عظمیٰ واقعی دل سے چاہتی تھی کہ گھر میں کوئی بزرگ ہو۔ جس کے پاس تجربوں اور زندگی کے نچوڑ کے خزانے ہوں۔ جو ہاتھوں میں چراغ لیے زندگی کے راستوں پر اس کی راہنمائی کرے۔ جو اسے کبھی کبھی ٹوک سکے۔ ڈانٹ دے عجیب و غریب سی خواہش تھی۔

ڈاکٹر اسد کبھی اُس کی اِس خواہش پر مسکرا دیتے، کبھی خوشی سے کوئی فقرہ کہہ دیتے اور کبھی کبھی بے طرح اداس بھی ہو جاتے۔ کاش ان کی ماں زندہ ہوتی اور عظمیٰ جیسی بہو پا کر ماضی کی ساری تلخیاں بھلا سکتی۔ لیکن ماں برسوں پہلے داغِ مفارقت دے چکی تھی ــــ عظمیٰ کی یہ خواہش پوری ہونے کا امکان نہیں تھا۔

یہ بات عظمیٰ بھی جانتی تھی۔ لیکن بس۔ یونہی ــــ جب اسے ڈاکٹر کی طرف سے دی جانے والی بھرپور خوشیوں کا احساس ہوتا تو یہ خواہش اس احساس میں کانٹے کی طرح اٹک جاتی ــــ آسودگی میں اک نا آسودہ سی خواہش لذتِ درد سے آگہی کا باعث بن

جاتی۔۔۔۔ جو کسی طور پر پریشان کن نہیں ہوتا۔

زندگی طمانیت اور آسودگی کی لہروں پر بہے چلی جا رہی تھی۔

عظمیٰ گھریلو ذمے داریاں پورے خلوص سے سنبھالے تھی۔

بچے پڑھائی میں مصروف اَن دیکھی جہتوں پر راستے بنانے میں مصروف تھے۔

ڈاکٹر اسپتال میں مریضوں کی مدد بھی اپنی جیب سے کرنے والا یہ ڈاکٹر ایک سال کے عرصے ہی میں سینکڑوں مریضوں کی دلی دعائیں حاصل کر کے بہت مقبول ہو چکا تھا۔

آج بھی انہوں نے راؤنڈ لیتے ہوئے جب بیڈ نمبر تین کی مریضہ کی دوائیوں کے متعلق پوچھا تو سسٹر رخسانہ آگے بڑھ کر بولی "سر' یہ دوائی انھیں اسپتال سے دی گئی ہے باقی دوائیاں انھوں نے منگوائی ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔"

ڈاکٹر اس مریضہ پر قدرے جھکتے ہوئے بولے "آپ نے دوائیاں نہیں منگوائیں؟"

"کہاں سے منگواؤں" معمر مریضہ کی چندھی آنکھیں دُھندلا گئیں "آپ لوگ تو بڑھیا بڑھیا دوائیں لکھ دیتے ہیں۔"

"بڑھیا بڑھیا" جونیئر ڈاکٹر زیرِ لب مسکرائے۔ لیکن ڈاکٹر اسد متانت سے بولے، "یہ دوائیں آپ کے لیے ضروری ہیں۔"

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے بیٹے کے پاس اتنی رقم ہے" وہ جلے بُھنے انداز بولی۔ تو ڈاکٹر نے سیدھے ہوتے ہوئے ڈاکٹر بخاری سے کچھ کہا۔ اس نے اثبات سے سر ہلا دیا۔

"فکر نہ کریں، آپ کی دوائی آجائے گی ــــ" ڈاکٹر اسد نے مریضہ سے کہا پھر اسے تسلی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ مریضہ کو یہ جتلایا نہیں کہ اس کی دوائیں ان کی

جیب سے آئیں گی۔ ڈاکٹر اسد کی یہی عظمت تھی۔ احسان کرتے لیکن جتلانے کے لیے نہیں۔ مدد اس طرح کرتے کہ مریضوں کی عزتِ نفس ..... مجروح نہ ہونے پاتی۔ لوگ انہیں انسانی روپ میں فرشتہ کہنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔

اگلے بیڈ پر ایک نو دس سالہ بچی لیٹی تھی۔ اس کی پریشان ماں سرہانے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے بچی کو تھپکی دی، پیار سے معائنہ کیا۔ دوائیوں کے متعلق سسٹر راشدہ سے پوچھا۔۔۔۔ پھر جونیئر ڈاکٹروں سے اس کی بیماری کی نوعیت کے متعلق باتیں کیں۔ بچی پہلے سے نسبتاً بہتر تھی، ڈاکٹر نے اس کی ماں کو بھی تشفی دی۔ بچی سے ہنس ہنس کر باتیں کر کے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

اسی طرح وہ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے بیڈ کے مریضوں کو دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ بیڈ نمبر چودہ پر ایک بوڑھی عورت آنکھیں بند کیے چُپ پڑی تھی۔ اسپتال کا لال کمبل اس کے سینے تک پھیلا ہوا تھا۔

”سر!“ سسٹر رخسانہ نے کہا ”یہ پیشنٹ رات دس بجے ایڈمٹ ہوا۔ ڈاکٹر اصغر کھوکھر ڈیوٹی پر تھے۔ انھوں نے اٹینڈ کیا۔۔۔۔ رات حالت کافی خراب تھی۔ قے اور لوز موشن کی وجہ سے بہت نڈھال تھیں۔ اب ٹمپریچر ایک سو ایک ہے۔ ہائی بلڈ پریشر۔ ہارٹ کا ایک دیلو... “

نرس، ڈاکٹر اصغر کھوکھر کی لکھی رپورٹ میں سے چیدہ چیدہ باتیں بتا رہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اسد ایک لفظ بھی شاید ٹھیک سے سن نہیں پائے۔ ان کی نظریں اس مریضہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ ان نظروں میں حیرانی کی کیفیت تھی۔ شناخت اور پہچان کی اذیت تھی۔

یقیناً اور یقیناً یہ وہی چہرہ تھا۔۔۔۔ گو وقت نے اپنی گرفت کا جال سا چہرے پر بچھا دیا تھا۔ لیکن ان ہلکی ہلکی جھریوں نے ان راستوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ جو حال کے ڈانڈے ماضی سے ملاتے تھے۔

ماضی بے شک ہماری گرفت میں نہیں ہوتا۔ ہم ہر لمحہ حال میں جیتے ہیں۔ مستقبل پتھر کی دیوار ہے۔ جس کے پار ہم دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ہم پر وارد ہوتے ہی حال بن جاتا ہے اور یہ حال لمحہ لمحہ سرک کر ماضی میں گم ہوتا جاتا ہے۔ وقت ہم سے حال کی اک اک واردات چھین کر چُرا کر ماضی کے سینے میں اُتار دیتا ہے۔ گم کر دیتا ہے۔

”لیکن!“

ماضی مستقبل کی طرح پتّھر کی دیوار نہیں۔ یہ شیشے کی دیوار ہے۔ شیشے کی دیوار۔ جس کے آر پار سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ لمحوں کی گرفت سے نکلا ہوا۔ وقت کا چھینا اور چُرایا ہوا اک اک لمحہ جو ماضی کے سینے میں پیوست ہوتا ہے۔ ہم پلٹ کر دیکھیں تو شیشے کی دیوار کے پار سب کچھ نظر آ جاتا ہے۔

ڈاکٹر اسد کی آنکھیں شیشے کی اس دیوار کے پار دیکھ رہی تھیں۔

اور جو کچھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان پر کپکپی، دہشت اور اذیت کا تاثر چھوڑ رہا تھا۔

”سر!“ ڈاکٹر بخاری نے ان کی محویت کو توڑا۔

”ہوں۔“ ڈاکٹر نے ایک دم سر کو جھٹکا دیا۔ آنکھوں میں بھر جانے والی پہچان اور شناخت کی کیفیت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ پوچھا ”یہ کون ہیں؟“

”پیشنٹ سر“ سسٹر سادگی سے بولی۔

”ان کا نام؟“

رخسانہ نے چارٹ پر نام دیکھا اور بولی ”آسیہ بیگم۔ عمر اکسٹھ سال۔ اور.....“

”آسیہ بیگم“ ڈاکٹر نے زیرِ لب دہرایا۔ تو ان کا یقین درست تھا۔ یہ آسیہ بیگم ہی تھیں۔

ڈاکٹر نے لب سکوڑ لیے۔۔۔۔ پھر رخسانہ سے سوال کیا ”انہیں کس نے ایڈمٹ

کروایا ہے؟

"پتا نہیں سر ــــ ایک عورت اور مرد لے کر آئے تھے۔ داخل کروا کے چلے گئے۔"

"ہوں! ہو سکتا ہے، وہ ان کا بیٹا اور بہو ــــ" ڈاکٹر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ یہ
قسم کی باتیں انھیں اس وقت نہیں کرنا چاہیے تھیں۔

"سر! آپ انھیں جانتے ہیں؟" ڈاکٹر ارشد نے اسد ملک کے چہرے کے پریشان کن اتار
چڑھاؤ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ڈاکٹر نے ہاں نہ کے درمیان یونہی سر ہلا دیا۔ ان کے ذہن میں بڑی طوفانی برپا
مچی تھی۔ آسیہ بیگم کی یہ حالت کہ انتہائی تشویشناک حال میں جنرل وارڈ میں ایڈمٹ ہوا
کے ہیجان کو متلاطم کیے دے رہی تھی۔

ڈاکٹر نے جلدی جلدی چارٹ پر نگاہ ڈالی۔ بیماری کی تشخیص اور علاج کے لیے
کچھ لکھا تھا۔ ایک نظر میں دیکھ کر چند ضروری ہدایات سسٹر کو دیں۔

"سر یہ جاگ رہی ہیں ــــ آپ ان سے باتیں کر سکتے ہیں۔ ان کی نظر بہت کمزور
ہے۔ بیڈ"

ڈاکٹر کچھ کہے بنا اگلے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔

سسٹر زارا اور دونوں جونیئر ڈاکٹروں کو ان کا یہ رویہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ڈاکٹر ملک کی
تو یہ عادت تھی کہ بیماری کے علاوہ وہ بھی مریضوں سے اچھی اچھی باتیں کیا کرتے تھے۔
جس سے بیمار کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سج جایا کرتی تھیں۔ بیماری سے مقابلہ کرنے کی ہمت
پیدا ہو جایا کرتی تھی۔

خلافِ توقع اور خلافِ معمول ڈاکٹر اس مریضہ سے کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ گئے
تھے۔ سب آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرتے ہوئے ایک دوسرے سے وجہ پوچھ رہے تھے۔

وجہ! جو انھیں معلوم نہیں تھی۔

اور نہ ہی استفسار کرنے پر معلوم ہو سکتی تھی۔

آخری مریض کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے گردن موڑ کر آسیہ بیگم کو دیکھا۔ چہرے پر کچھ
برہم برہم سی سختی اُبھر آئی تھی، جذبۂ ترحم بھی موجیں مارتا دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکٹر کی عجیب و
غریب سی کیفیت دوسروں سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔

"اسٹاف!" ڈاکٹر اسد نے وارڈ کے بیرونی دروازے کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"یس سر!" رخسانہ بولی۔

"اُس پیشنٹ کے گھر سے کوئی دیکھنے آئے تو میرے پاس لے آنا۔"

"بہتر سر!"

"اور ان کی نگہداشت صحیح طرح کرنا!" ڈاکٹر نے خشک اور کھردرے لہجے میں کہا۔ یہ
لہجہ ان کا اپنا نہیں تھا۔

ڈاکٹر اپنے آفس میں چلے آئے۔ بڑی سی میز کے دوسری طرف رکھی آرام دہ کرسی پر
بیٹھتے ہوئے انھوں نے اسٹیتھسکوپ پر رکھ کر سر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

وہ اس وقت خاصے مضطرب اور بے چین نظر آ رہے تھے۔ آج پہلی بار ان کا جی
چاہ رہا تھا کہ وہ آفس کا دروازہ بند کر دیں۔ کوئی انھیں بلانے نہ آئے۔ وہ چُپ چاپ
کرسی کی پشت پر سر ڈالے آنکھیں بند کیے پڑے رہیں۔ اور بند آنکھوں کے اندر کھلنے
والی آنکھوں سے شیشے کی دیوار کے اس پار دیکھتے رہیں۔ ماضی کو کُریدتے رہیں، اُلٹ پلٹ
کرتے رہیں، اس طرح کہ ماضی کا لمحہ لمحہ زنجیر بن کر سارے حالات و واقعات تسلسل سے ان
کے سامنے لے آئے۔

وہ واقعی آنکھیں بند کر کے شیشے کی دیوار کے پار اُتر گئے۔

وہ اس نو دس سالہ بچے کو دیکھ رہے تھے۔ جو میلا کچیلا پھٹا پرانا لباس پہنے تھا۔
جس کے ہاتھ کالی سیاہی سے رنگے تھے۔ جس کی ذہین اور چمکدار آنکھیں کھلائی کھلائی

تھیں۔ جس کے بال میل سے اَٹے تھے۔ جس کے پاؤں میں ڈھول اور مٹی اس طرح جمی ہوئی کہ جوتے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ جس کا بدن تو خوب چوڑا چکلا تھا۔ لیکن خوراک کی کمی نے چمڑی ہڈیوں پر منڈھ دی تھی۔

اور یہ بچّہ اسد تھا!

تنگدستی کی وجہ سے بیماری میں بغیر علاج گھُل گھُل کر مَر جانے والے غفور ملک کا بیٹا۔ جو اب بھی اپنی بیوہ اور انتہائی غریب ماں کے ساتھ گاؤں کے اس بوسیدہ مکان میں رہتا تھا جو اس کی ماں نے گروی رکھا ہوا تھا۔ لیکن اب سود کی رقم اتنی بڑھ چکی تھی کہ مکان ہی ہاتھ سے جا رہا تھا۔

ماں خود بھی بیمار رہتی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سینے پہ ہاتھ رکھ رکھ کر کھانسا کرتی تھی۔ بخار میں جلا کرتی تھی۔ اور ڈھیروں بلغم اُگلا کرتی تھی۔ اس حال میں بھی وہ چوہدری کے کھیتوں پر کام کیا کرتی تھی تاکہ اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پال سکے۔

صرف پیٹ پالنے ہی کا سوال نہیں تھا۔ سوال تو اسد کی پڑھائی کا تھا۔ یہ بچہ جو بہت زیادہ پڑھنا چاہتا تھا۔ جسے ڈاکٹر بننے کی خواہش تھی۔ کبھی کبھی بیمار اور لاچار ماں کے لیے مسئلہ بن جاتا تھا۔

"میں کہاں سے پیسے لاؤں، تجھے پڑھانے کے لیے؟ کچھ نہیں بنے گا تو۔ خواب مت دیکھا کر۔ ڈاکٹر امیروں کے بچّے بنتے ہیں۔ چار جماعتیں پڑھ لے، یہی کافی ہیں۔ خط پڑھ لکھ لے گا بس۔ میرے ساتھ مزدوری کرنے چلا کر۔ اب مجھ سے اتنی محنت نہیں ہوتی۔"

"اماں! مجھے بہت شوق ہے۔ اماں، چوہدری صاحب کے بڑے بیٹے کی طرح میں بھی ڈاکٹر بنوں گا۔"

"کہا نا! ایسے خواب مت دیکھا کر۔"

"اماں، میں ضرور ڈاکٹر بنوں گا۔ دن رات محنت کر کے ڈاکٹر بنوں گا۔ ابا اسی لیے مر گئے

کہ اس کا علاج نہیں ہو سکا۔ اماں، میں تیرا علاج ضرور کروں گا۔ ایک بار ڈاکٹر بن جاؤں۔"

مدقوق سی اماں کے سینے سے اک آہ سی نکلتی۔ کھڑکھڑاتی ہڈیاں چٹخنے لگتیں۔ وہ سوچتی، ناسمجھ ہے نا، کتنے دُور کی باتیں سوچتا ہے۔ بیمار ماں سے اتنے لمبے سفر کی توقع رکھتا ہے۔

اماں کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں۔ اسد ان آنسوؤں کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتا اور اس کے دل میں ڈاکٹر بننے کی لگن اور شدت اختیار کر جاتی۔

وہ بہت ذہین اور لائق بچّہ تھا۔ ناسازگار حالات میں بھی شوق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا۔ ہر امتحان میں اوّل آتا۔ لگن اور بڑھ جاتی۔ گاؤں کے اسکول میں صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کی جا سکتی تھی۔ یہ اک دُور افتادہ گاؤں تھا۔ مڈل اسکول ساتھ والے گاؤں میں تھا۔

اسد نے پانچویں جماعت پاس کر لی تو اماں نے کہا۔ "بس بیٹا، اب پڑھائی ختم۔"

"نہیں اماں۔" وہ عزم سے بولا۔ "میں چھٹی میں داخل ہو رہا ہوں۔"

"کہاں؟"

"ساتھ والے گاؤں میں مڈل اسکول ہے۔"

"وہ گاؤں جانتا ہے، کتنی دور ہے؟"

"ہاں۔"

"تین سوا تین میل سے کم نہیں فاصلہ۔"

"تو کیا ہوا؟"

"کیسے جایا آیا کرے گا؟"

"پاؤں خدا نے کس لیے دیے ہیں اماں، چلنے کے لیے دیے ہیں اماں۔ فاصلے طے کرنے کے لیے۔"

"ضد نہ کر۔"

"میں ضرور پڑھوں گا۔"

"کتابوں کے لیے پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ کہاں سے خرچے پورے کرے گا؟"

"سب کرلوں گا۔"

"کیسے؟"

"میں نے ماسی زینتے سے بات کرلی ہے، اس کے ڈنگروں کے لیے شام کو چارا لایا کروں گا۔ وہ مجھے پیسے دیا کرے گی۔"

"اسد ——!"

"ہاں ماں، اس سے میری پڑھائی کا خرچہ نکل آیا کرے گا۔ تو فکر نہ کر۔"

گیارہ سالہ بچے کے منہ سے یہ پُرعزم فیصلہ سُن کر ماں حیران سی ہوگئی۔ پھر بولی "محنت مزدوری کرنا ہی ہے تو جو پیسے ملیں، اس سے کچھ کھایا پیا کر۔ صحت تو دیکھ اپنی، پڑھ پڑھ کر اور سوکھ جائے گا۔"

اسد بولا "چاچے صمد سے بھی میں نے بات کی ہے۔ وہاں سے بھی کچھ پیسے مل جایا کریں گے۔ چھٹی کے دن اس کی بھینس کو نہلایا کروں گا۔"

اماں ہنستی رہی۔

اسد نے جو کہا تھا، وہی کر دکھایا۔ اس نے مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ روزانہ تین ساڑھے تین میل پیدل آنا اور جانا ایک بچے کے لیے معمولی بات نہ تھی۔ لیکن اس کا عزم متزلزل نہیں ہوا۔ اس نے ساری تکلیفوں کے باوجود چھٹی جماعت میں ہمیشہ کی طرح اول پوزیشن لی۔ اس کا حوصلہ اور بڑھا اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ محنت شروع کردی۔

"آٹھ جماعتیں پڑھ بھی لیں۔ تو پھر کیا کرے گا؟"

"اماں تو دیکھتی جا —— بس —— تیری دعاؤں کی ضرورت ہے مجھے بس۔"

"ماں کے پاس خالی دعاؤں کے سوا اور ہے بھی کیا تیرے لیے۔"

"یہی کافی ہے۔"

"مجھ سے نہیں دیکھا جاتا بیٹے۔ میلوں پیدل چلتا ہے تو، ڈنگروں کا چارا لاتا ہے۔ بھینیں نہلاتا ہے۔ اتنی سی جان ہے تیری۔ سوکھتا ہی جا رہا ہے۔ میری مان اب چھوڑ دے پڑھنا۔"

"نہیں اماں —— پڑھوں گا تو میں ہر حالت میں۔ بھوکے رہنا پڑے یا چیتھڑے پہننا پڑیں۔ کوئی پرواہ نہیں۔" اماں بے چاری کیا کرتی۔ کیا کرسکتی تھی چوتھے چھٹے مہینے کچھ پیسے جوڑ لیتی تو اس کے لیے ایک آدھ سستے کپڑے کا جوڑا بنوا دیتی۔ یا کبھی ربڑ کے سلیپر خرید دیتی۔ اس سے زیادہ کی استطاعت تھی ہی نہیں۔ اسد جو پیسے کماتا تھا، وہ کتابوں کاپیوں پر خرچ کردیتا تھا۔

ان دنوں وہ ساتویں جماعت میں تھا۔

اسکول سے گھر آیا... تو ماں کے سامنے والی چارپائی پر ایک خوش پوش شہری آدمی کو بیٹھے دیکھا۔

وہ حیران سا ہوا۔ ذہن پہ زور دیا۔ لیکن یاد نہ آیا کہ وہ کون ہے۔ ایسے چہروں والے آدمی، ابا زندہ تھا تو کبھی کبھی گھر آیا کرتے تھے۔

اس نے بستہ ماں کی چارپائی پر رکھتے ہوئے اجنبی کو سلام کیا۔

اس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے کہا "یہ تیرا بیٹا ہے صغراں۔"

"ہاں، بھائی وقار۔"

"بڑا ہوگیا ہے اب تو۔" وہ بولا پھر اسد سے پوچھا "پڑھتے ہو؟"

"جی۔"

"کس کلاس میں؟"

"ساتویں میں۔"
"میرا جبّار بھی ساتویں میں ہے۔"
"جبّار بڑا ہے یا چھوٹا؟" صغیراں نے پوچھا تو وہ بولا "اسرار بڑا ہے، وہ نویں میں ہے، جبّار چھوٹا ہے۔"
"بس دو ہی بچے ہیں یا؟"
"دو ہی ــــ بیٹی ہوئی تھی، دو سال کی ہو کر فوت ہو گئی۔"
وہ افسوس کرنے لگی۔
وقار، صغیراں کا دور پار کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی گاؤں میں سال بھر کے لیے گندم یا چاول خریدنے آتا تو صغیراں سے مل کر جاتا ــــ دل کا اچھا تھا۔ کچھ نہ کچھ دے کر ہی جایا کرتا تھا۔ صغیراں کے شوہر کے مرنے پر تو سارا خرچہ ہی اس نے کیا تھا۔ شہر میں اچھا کاروبار تھا۔ دس مرلے کا کشادہ مکان بھی بنوا لیا تھا۔ موٹر سائیکل بھی رکھی ہوئی تھی۔ گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔
"دودھ پیو گے وقار بھائی؟" صغیراں نے پوچھا۔ پھر اسد کی طرف اشارہ کر کے بولی "چاچے صمد کی بھینس نہلاتا ہے اسد۔ کبھی کبھی وہ گڈوی دودھ کی دے دیتا ہے۔ بڑا کھرا دودھ ہے۔"
"تم تو پڑھ رہے ہو؟" بھینس نہلانے کا سن کر وقار، اسد سے پوچھنے لگے۔
صغیراں نے جلدی سے کہا "پڑھتا بھی ہے، محنت مزدوری بھی کرتا ہے۔ پاگل ہے پڑھائی ایسے تو نہیں ہوتی نا، میں تو دو وقت کی روٹی بھی حاصل کر لوں تو بڑی بات ہے۔ بیماری پیچھا نہیں چھوڑتی۔ محنت بھی تو نہیں ہوتی اب۔"
صغیراں اپنی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے اسد کے شوق اور لگن کی باتیں بھی کرنے لگی۔ تو وقار بے حد متاثر ہوا۔ خاص کر یہ سن کر کہ یہ بچہ علم حاصل کرنے کے لیے میلوں پیدل چل کر اسکول جاتا آتا ہے۔
"وہاں مڈل تک اسکول ہے؟" اس نے پوچھا۔
"جی۔" اسد تعظیم سے بولا۔
"اس کے بعد ــــ"
"شہر جاؤں گا۔"
"لو اور سنو۔" صغیراں تعجب سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولی "شہر جا کر کیا کرے گا؟"
"دسویں تک پڑھنے کے لیے شہر ہی جانا ہو گا اماں۔ اس کے بعد کالج۔"
صغیراں نے ماتھے پر ہاتھ مارا ــــ تو وقار جلدی سے بولے "بڑا پُرعزم بیٹا ہے تمہارا، یہ ضرور کامیاب ہو گا۔"
صغیراں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"تمہارا بچہ بہت ذہین ہے صغیراں۔ اسے شہر داخل کروا دو۔ یہ ضرور کچھ نہ کچھ بن جائے گا۔"
"شہر میں داخل کروا دوں، کیسے بھائی؟"
وقار چند لمحے چُپ رہے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے "اگر میں اسے شہر لے جاؤں تو؟"
"ماما جی۔" اسد بے اختیار ہو کر بولا "میں آپ کا احسان....."
اس کی آواز فرطِ جذبات سے گھُٹ گئی۔ وقار نے اٹھ کر اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور بولے "تم فکر نہ کرو بیٹے۔ ماما کہا ہے تو ماما بن کر دکھاؤں گا۔ میں تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میرے دو بیٹے پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے تم ہو گئے۔ تم اپنی ماں سے پوچھ لو۔ پھر میں تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ ہاں ساتویں جماعت اب یہیں پڑھ لو۔ دو ماہ رہ گئے ہیں پھر آٹھویں میں شہر داخل کرا دوں گا۔"
اسد کی تو جیسے خدا نے سُن لی ہو۔ ماں کو راضی کرنا مشکل نہ تھا۔ صرف ماں کے اکیلے پن

اور بیماری سے متفکر تھا۔ اس کا حل بھی اس نے سوچ لیا تھا۔ اس نے ماسی زینتے کی منت سماجت کی کہ وہ اس کی ماں کا خیال رکھے۔ تھوڑا بہت کام لے کر روٹی دے دیا کرے۔

اس نے ساتویں جماعت پاس کر لی، تو وقار صاحب حسبِ وعدہ اسے لینے آگئے۔
ماں کا جی تو نہ چاہتا تھا کہ وہ بیٹے کو جدا کرے۔ لیکن اس کی خوشی اور بہتری کے لیے ایسا کرنا ہی تھا۔ پھر خدا نے وسیلہ بنا دیا تھا۔ اسد اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا تھا۔ کیا عجب کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن ہی جائے۔ ماں ایک انجانی سی خوشی سے دوچار ہو گئی۔ اور اس نے اسد کو نیک دعاؤں کی چھایا تلے وقار صاحب کے ساتھ شہر روانہ کر دیا۔

جاتے وقت اس نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے نصیحت کی ”اسد بیٹے جس مقصد کے لیے مجھے تنہائیوں کا روگ دے کر جا رہے ہو۔ اسے پورا کرنا۔ وقار صاحب تمہاری ذمّے داری اپنے اوپر لے رہے ہیں، ان کا ادب لحاظ کرنا اور کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دینا۔“ پھر اس نے وقار صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ دیے اور روہانسی آواز میں بولی، ”مجھ بے آسرا کا ہاتھ تھام رہے ہو بھائی۔ خدا تمہیں اس کی جزا دے گا۔ میرے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا ہے تو اسے شفقتوں سے محروم نہ کرنا۔ یتیم ہے۔ اور یتیموں کی خبرگیری اور مدد کرنے والوں کے اللہ کے ہاں بڑے درجات ہیں۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔“

وقار نے اسے تسلی دی ”بہن جہاں میرے دو بچے ہیں، وہاں اسد کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں سمجھوں گا اللہ نے مجھے تیسرا بیٹا دے دیا ہے۔ تم اس کی طرف سے بالکل بے غم ہو جاؤ۔“

”خدا تمہیں اس نیکی کا بڑا اجر دے گا بھائی۔“

وقار صاحب، اسد کو اپنے ساتھ لے آئے۔

وقار صاحب کا مکان گلی کی نکڑ پہ واقع تھا۔ پکّی لال لال اینٹوں والا روشن اور ہوادار مکان دو منزلہ تھا۔ مختصر سے خاندان کے لیے یہ خاصی بڑی جگہ تھی۔

اسد اپنے کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے جب اس گھر میں داخل ہوا، تو یوں لگا جیسے کسی خیالی جنّت میں آ گیا ہو ——— کہاں وہ کچّا اور ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا نما گاؤں کا مکان اور کہاں یہ حویلی نما پکّا مکان۔ جس کے کمروں میں سامان بھرا تھا۔ کوئی کمرہ بیٹھنے کا تھا کوئی کھانے کا۔ سونے کے کمرے الگ تھے، جہاں چوبی پلنگ پڑے تھے۔ کھڑکیوں دروازوں پر پھولدار پردے لٹک رہے تھے۔ بجلی کی روشنی تھی۔ نل کا پانی تھا۔

اسد گھر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ جبار اور اسرار بھی ملے اور آسیہ بیگم سے بھی وقار صاحب نے متعارف کروایا۔ اسد بچہ تھا لیکن نظروں کی پہچان رکھتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جبار اور اسرار نے تو تھوڑی سی اجنبیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد اسے قبول کر لیا تھا، لیکن آسیہ بیگم نے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا، وہ اتنی تند اور اتنی بیگانہ تھیں کہ اسد کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔

”کون ہے یہ؟“ آسیہ نے اس کے سراپا پر وہی تند اور بیگانہ نگاہ ڈال کر پوچھا تھا۔

”تم کو بتایا تو تھا۔ صغیراں ہے نا میری دودھ پار کی بہن، اس کا بیٹا ہے۔ بہت لائق اور ذہین بچہ ہے۔ شہر میں پڑھنے آیا ہے۔ یہ اب ہمارے پاس ہی رہے گا۔“

آسیہ نے منہ بنایا۔ وقار نے دونوں بیٹوں سے کہا۔ ”اسد تمہارا دوست ہے، جاؤ اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ اور باتیں کرو کھیلو۔“

”آؤ“ اسرار نے اسد سے کہا۔ اسد سہما سہما آسیہ کو دیکھتا دونوں بھائیوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

”یتیم بچہ ہے۔ پڑھنے کا بہت شوق ہے اسے۔ پڑھ لکھ کر کچھ بن ہی جائے گا“ وقار نے آسیہ سے کہا۔ ”اسے اسکول میں داخل کروا دیں گے کل۔ جہاں اسرار اور جبار پڑھ....“

”اس اسکول میں داخل کروا دو گے؟“

”تو کیا ہوا؟“

"اس کا دماغ عرش پر نہیں پہنچاؤ۔ گورنمنٹ اسکول میں داخل کرادو۔ اتنے خرچے برداشت نہیں ہوں گے۔"

آسیہ نے لڑجھگڑ کر وقار صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کو جبار، اسرار کے اسکول میں داخل نہیں کروائیں۔ گورنمنٹ اسکول میں داخلہ دلوائیں۔ جہاں فیس برائے نام تھی۔

اسد نے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ اسکول گھر سے اتنا زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی جانے آنے لگا۔ جبار اور اسرار کے پاس سائیکلیں تھیں۔ وہ ان پر اسکول جایا آیا کرتے تھے۔

وقار، اسد کا بہت خیال رکھتے۔ مشفق و مہربان تھے لیکن آسیہ کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وقار کے رویے سے تو وہ جل جاتی تھی۔ وہ ساری شفقت و مہربانی جو اسد کے وجود کو ٹھنڈی پھوار کی طرح بھگو دیتی تھی۔ آسیہ ساری کی ساری بڑی سنگینی سے نچوڑ لیا کرتی تھی۔ جبار اور اسرار اس کے اپنے بچے تھے۔ اس سے پیار اور پیار کا اظہار قدرتی بات تھی لیکن جب سے اسد آیا تھا۔ وہ ترجیحی سلوک بڑا جتلا جتلا کر کرنے لگی تھی۔

بہت جلد اسد کی گھر میں حیثیت اک نوکر کی سی ہو گئی۔

صبح اُٹھتے تو وہ اسے باورچی خانے میں دھکیل دیتی۔ ملازم لڑکے کے ہوتے ہوئے بھی اسے حکم دیتی "کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ برتن دھو ڈالو۔ دیکھتے نہیں ساجا چائے بنا رہا ہے" اسد بلا چوں چرا برتن دھونے لگتا۔

"ناشتا میز پر لگا دو" دوسرا حکم صادر ہوتا۔

وہ جلدی ناشتے کی چیزیں اور برتن میز پر لگا دیتا۔

شروع شروع میں وقار صاحب، اسد کو اپنے ساتھ ہی میز پر بٹھاتے تھے لیکن آسیہ نے یہ ریت نبھانے نہ دی۔ وہ میز پر آکر بیٹھنے لگتا، تو پلیٹ میں کھانا ڈال کر اسے تھما دیتی۔

"چلو باورچی خانے میں جا کر کھاؤ۔"

اسکول سے واپس آتا تو آسیہ نے ڈھیروں کام اس کے لیے رکھے ہوتے۔ آسیہ نے اس کے یہاں ہونے سے یوں مصالحت کر لی تھی کہ مفت کا نوکر مل گیا تھا۔

جبار اور اسرار بھی اب ماں کی دیکھا دیکھی اسے نوکر ہی سمجھنے لگے تھے۔ اسد ان کا کمرہ صاف کرتا۔ ان کے کپڑے ٹھکانے پہ رکھتا۔ یونیفارم ہر رات کو استری کر کے الماری میں لٹکاتا اور جوتے پالش کرنا تو اس کی ذمے داری بن گئی تھی۔ ذرا بھی کوتاہی ہوتی تو آسیہ بیگم کان اس طرح مروڑتی کہ کئی دن اینٹھن محسوس ہوتی رہتی۔ سُبکی الگ محسوس ہوتی۔ لیکن

وہ خاموشی سے ہر زیادتی سہے جا رہا تھا۔ اس نے بہر طور پڑھائی جاری رکھنا تھی۔ اسکول سے واپسی پر اتنے کام کرنا ہوتے کہ اسکول کا کام کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ یہ کام وہ رات کو سونے سے پہلے کیا کرتا تھا۔

اس کے سالانہ امتحان قریب تھے۔ وہ رات کے دو دو بجے تک جاگ کر پڑھتا رہتا۔ دن میں تو کتابوں کو ہاتھ لگانے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ آسیہ بیگم نوکیلے پتھر کی طرح دل و جگر میں گڑی رہتی تھی۔

امتحان ہوئے۔

نتیجہ نکلا۔

اس نے ہمیشہ کی طرح یہاں بھی پہلی پوزیشن لی۔ استادوں نے بہت ہمت بڑھائی۔ وہ خوشی خوشی گھر آیا۔

"میں اوّل آیا ہوں" اس نے خوش خبری سنائی۔ آسیہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"میں اوّل آیا ہوں" اس نے دوبارہ کہا۔ شاید آسیہ کی طرف سے ہمت افزائی کی توقع کر رہا تھا۔

لیکن وہ بپھر کر بولی "سُن لیا ہے۔ اوّل آئے ہو تو کیا کروں۔ سر پر بٹھا لوں تمہیں۔"

اسد کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس دن اسے اپنی ماں بہت یاد آئی جب وہ اپنا نتیجہ ماں کو سناتا تھا کتنی خوشیاں اُتر آتی تھیں اس کے چہرے پر، کتنے پیار سے اس کا ماتھا چُوما کرتی تھی۔ کتنے مان سے لوگوں کو بتاتی پھرا کرتی تھی۔

گھر میں صرف وقار صاحب ہی تھے جنھوں نے شاباش دی۔ جبار اور اسرار کے نتیجے کی رپورٹ بھی آئی تھی اسرار تو بمشکل پاس ہوا تھا اور جبار نے بھی کلاس میں اکیس پوزیشن لی تھی۔

"کچھ شرم کرو تم دونوں۔ اسد کی طرف دیکھو۔ ہمیشہ سے اوّل آ رہا ہے۔" وقار نے کہا تو آسیہ بگڑ کر بولی "اپنے بچّوں کے مقابلے میں اسے شہ دیتے ہو۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے، فسٹ آ کر میرے بچّوں کی سُبکی کروا رہا ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم چُپ رہو جی۔ اور ہاں اس سے میرے بچّوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وقار چُپ ہو گئے۔ آسیہ نے اسد کو خوب ڈانٹا ــــ "دیکھوں گی آئندہ تم کیسے اوّل آتے ہو؟"

اسد سر جھکائے اس کی ڈانٹ سنتا رہا۔ لیکن اب اس کے اندر بھی ایک باغیانہ سی لہر اٹھنے لگی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا "دیکھ لینا میں کیسے اوّل آتا ہوں؟"

اسد نے ہر ظلم ناروا کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے عزم کر لیا کہ وہ آسیہ بیگم کو کچھ بن کے دکھائے گا۔ کچھ بھی ہو، وہ ڈاکٹر ضرور بنے گا۔

نویں جماعت میں اسد نے سر دھڑ کی بازی لگا کر محنت شروع کر دی۔ دن میں تو وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ آسیہ ایک لمحے کو بھی چین نہ لینے دیتی تھی۔ لیکن رات اس کی اپنی تھی، وہ رات کو پڑھتا رہتا تھا۔

لیکن

آسیہ اسے نیچا دکھانے کو تُل گئی تھی۔ ایک دن اسے بے طرح ڈانٹنے کے بعد بولی "ساری رات بھر بجلی جلائے رکھتا ہے۔ خبردار جو آئندہ دس بجے کے بعد تیرے کمرے میں روشنی نظر آئی۔ تیرا باپ بِل دے گا۔ سُن لیا نا؟"

وہ گھبرا گیا۔ گڑگڑا کر بولا "دن میں وقت نہیں ملتا اس لیے رات کو پڑھتا ہوں۔"

"دس بجے کے بعد روشنی نہیں ہو گی تمہارے کمرے میں سُن لیا؟" آسیہ نے اس کا کان زور سے مروڑا۔ تو وہ بلبلا اُٹھا۔

وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے چاہا کہ وقار صاحب سے شکایت کرے، لیکن آسیہ نے تو دھمکی دی تھی کہ اگر یہ بات اس نے وقار صاحب تک پہنچائی تو وہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دے گی۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ رات دس تو اسے باورچی خانے ہی میں بج جاتے تھے۔ پڑھنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ اس کی پریشانی پر آسیہ تمسخر سے ہنستی۔ اعلانیہ کہتی۔ "دیکھوں گی نا اب کیسے اوّل آتے ہو۔ میرے بچّوں پر برتری حاصل کرنے لگے تھے نا۔ اب کرو؟"

اسد کا خون کھول جاتا۔ عزم مستحکم ہو جاتا۔ جی چاہتا زور زور سے کہے "میں اوّل آؤں گا۔ اوّل آؤں گا۔ دیکھ لینا۔ تمہارے بچوں کو نیچا دکھاؤں گا؟"

جو کوٹھری نما کمرہ اسد کو دیا گیا تھا۔ اس کی ایک کھڑکی گلی کے رُخ کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے گلی میں جلنے والے کھمبے پر لٹکے بلب کی روشنی کمرے میں پڑ جاتی۔ اسد نے اس ہلکی سی روشنی کو غنیمت جانا۔ وہ رات کے دو دو تین تین بجے تک اس ناکافی روشنی میں کھڑکی میں بیٹھ کر کتابوں پر جُھکا رہتا۔

کبھی موم بتّیاں لے آتا اور ان کی مدّھم روشنی میں اسکول کا کام کر لیتا۔
جس رات وہ زیادہ جاگ نہ سکتا پو پھٹے اُٹھ بیٹھتا اور طلوع ہوتے آفتاب کی ہلکی روشنی

میں اپنا کام کر لیتا۔

انہی دنوں ایک افتاد آن پڑی، اس کی ماں بیمار تو تھی ہی اب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اطلاع ملتے ہی چھٹیاں لے کر گاؤں آ گیا۔ ماں نحیف تھی نا۔ اس نے بہت زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ صرف اس کو دیکھنے کی تمنا تھی جو سانس لیے جا رہی تھی۔ اسد کے گاؤں پہنچنے کے دوسرے دن ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اسد پر جو بیتی وہی جانتا تھا۔ وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا۔

اپنا غم سینے میں چھپائے وہ تین چار دنوں ہی میں واپس لوٹ آیا۔ اس کا دل ہر چیز سے جیسے اُچاٹ سا ہو گیا۔ کبھی کبھی تو سوچتا کہ ماں کے ساتھ وہ بھی مر جاتا تو اچھا تھا۔

لیکن زندگی موت کے بغیر نہیں مرتی اور جینا ہے تو جیسے جانے کا گُر بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ اسد کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ٹوٹنے بکھرنے سے بچا لیا اور پھر لگن اور ولولے سے پڑھائی میں لگ گیا۔

ایک دن آسیہ نے کہا بھی "اتنا غم ٹوٹا ہے تم پر، چھوڑ دو پڑھائی وڑھائی، سکون نہ ہو تو پڑھو گے کیسے۔ کوئی کام دام ڈھونڈ لو۔ ڈاکٹر بننے کی حسرت ہی رہے گی تمہیں۔"

اسد کو یہ پتھر کی عورت بہت بُری لگی۔ اس کی ضد میں بولا "میں ڈاکٹر بن کے دکھاؤں گا۔"

"منہ لگتے ہو میرے۔" اس نے اسد کو کس کر تھپڑ مارا اور اس کے اندر جذبوں کی شدت بیدار ہو گئی۔ اس کا عزم آہنی ہو گیا۔ اک تیز نگاہ آسیہ پر ڈالتے وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اس کا نتیجہ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ شاندار تھا۔

یہ بات سب کے لیے ہی حیران کُن تھی۔ لیکن آسیہ کے لیے تو تباہ کن تھی۔ وہ تو یقین ہی نہ کر رہی تھی۔ تملاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ماں کا غم نہیں تھا اسے۔ پڑھتا بھی کچھ نہیں تھا۔ دس بجے ہی لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ اتنے نمبر آئے کیسے؟"

اسد کو اس کے اس طرح تملانے پر بے پناہ خوشی مل رہی تھی۔

آسیہ کے اپنے بچے پھر بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اسرار تو فیل ہی ہو گیا تھا۔ جبّار کے بھی بہت کم نمبر آئے۔ وہ اپنے بچوں کا غصہ بھی اس پر نکال رہی تھی۔

بولنے بکنے سے بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اس نے تو اسد کی کامیابی کی سب راہیں مسدود کر دی تھیں۔ لیکن وہ پھر بھی مات دے گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ وہ لڑکا جو صبح سے باورچی خانے میں موجود ہوتا ہے اسکول جانے تک گھر کے کئی کئی کام کرتا ہے۔ جسے وہ دس بجے سے پہلے اپنی کوٹھری میں بھی جانے نہیں دیتی۔ جسے اس نے دس بجے کے بعد بتی جلانے سے منع کر رکھا ہے۔ وہ کیسے اتنی شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوا؟ سوچوں نے اس کے ذہن میں شک اُبھارا۔ یہ ضرور رات رات بھر بتی جلائے بیٹھا پڑھتا رہتا ہو گا۔ سب کے سو جانے کے بعد بتی جلا لیتا ہو گا۔ یہ شک مضبوط اور ناقابلِ تردید ہو گیا۔

اور ایک دن اس نے اس اندھے شک کی بنا پر اسد سے سختی سے باز پرس کی۔

اسد نے سچ بولا۔ قسم کھائی کہ اس نے دس ساڑھے دس کے بعد کبھی بتی نہیں جلائی۔

"تو پھر، پڑھا کیسے؟"

"جیسے میری مرضی۔" وہ اس کی باز پرس سے بھڑک سا گیا تھا۔

"اچھا اب تیری مرضی بھی چلنے لگی یہاں ـــــ" آسیہ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ ایک نہیں دو تین تھپڑ جڑ دیئے۔

گھر کے ملازم اور بچوں کے سامنے اسد کی پٹائی ہوئی۔ سُبکی کے احساس نے اُبھرتے نوجوان کی رگِ حمیت پھڑکائی۔ اس نے گال پر ہاتھ رکھ کر کھا جانے والی نظروں سے آسیہ کو دیکھا اور پہلی بار ترشی اور تلخی سے بولا "آپ اپنے بچوں کی نالائقی کا غصہ مجھ پر اُتار رہی

ہیں۔ آپ مجھے مار پیٹ کر، بُرا بھلا کہہ کر میرے عزم کو تو متزلزل نہیں کر سکتیں، میں نے
تہیہ کر رکھا ہے اسے ہر صورت پورا کر دوں گا۔ میں ڈاکٹر بن کے رہوں گا۔ بن کے دکھاؤں گا
کر لیں آپ جو کچھ کرنا چاہتی ہیں۔"

یہ جواب آسیہ سے برداشت کہاں ہو سکتا تھا۔ وہ تو بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ
پڑی۔ اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر جھٹکا دیتے ہوئے بولی "تیرا یہ زعم۔ دیکھتی ہوں
بنتے ہو ڈاکٹر۔ اوقات دیکھو اپنی اور چلے ہو ڈاکٹر بننے۔ کل سے تمہارا اسکول جانا بند۔
کی جگہ اب تم گھر کا کام کرو گے۔"

اسد نے آسیہ کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے اپنے بال چھڑائے۔ غراتے ہوئے بولا "
سہہ لی میں نے آپ کی زیادتی۔ اسکول جانے سے مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"میں ـــــ میں روک سکتی ہوں۔" آسیہ نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"دیکھ لوں گا۔" وہ کہتے ہوئے اوپر چھت پر چلا گیا۔ آسیہ کے غرانے اور چیخنے
بُرا بھلا کہنے کی آوازیں اس کا کوٹھری کے اندر بھی تعاقب کرتی رہیں۔

وہ کافی دیر اپنی چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ آسیہ بیگم اس سے کیوں خار کھاتی تھیں
کیوں جلتی تھیں۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس
میں وہ.... خواہ مخواہ کا بوجھ بنا ہوا ہے۔ آسیہ بیگم نے اسے پہلے دن ہی ناگواری
دیکھا۔ اس کے وجود کو برداشت نہ کرنے کا احساس دلایا تھا۔ اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے

لیکن یہاں نہ رہے تو جائے کہاں؟

سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ وہ اب کافی سمجھدار تھا۔ دسویں
جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ سال اس کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس نے اچھی
پوزیشن لے کر میٹرک پاس کرنا تھا۔ اس کی منزلِ مقصود کا اس کامیابی پر انحصار تھا۔ لیکن
اتنے کٹھن اور نامساعد تھے کہ بے چارہ بے سہارا لڑکا سمجھ نہ پاتا تھا کہ کیا کرے۔

یہاں سے چلا جائے تو کہاں رہے جا کر۔ کیسے پڑھائی جاری رکھے۔ پڑھائی چھوڑ
دے تو خواب ٹوٹ جائیں گے۔ عزم بکھر جائے گا۔ منزل نہیں ملے گی۔ یہ وہ کبھی برداشت
نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب تو وہ آسیہ بیگم کی ضد میں پڑھنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر بن کر اسے دکھانا
چاہتا تھا۔

پتا نہیں ذہن میں کیا سمائی۔ لگن اور ہمت کی کس منزل پہ تھا کہ کشتیاں جلا ڈالیں۔
ایک رات وہ اپنی کتابیں اور دوسری چیزیں سمیٹ کر چُپ چاپ گھر سے نکل گیا۔
وہ رات اس نے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں گزاری۔

پھر کئی راتیں ایسے ہی گزاریں۔ شام تک اسکول ہی میں رہتا اور رات کو ویٹنگ روم
میں آ جاتا۔ اسٹیشن پر سامان اٹھا رکھ کر چند پیسے گزر بسر کے لیے کما لیتا۔

لیکن اس طرح زندگی کی گاڑی چل تھوڑا ہی سکتی تھی۔

وہ بے حد پریشان رہنے لگا۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ وہ تھا اور اس کی
غمگسار تنہائی، وہ اور اس کی تنہائی ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔ لازم و ملزوم
بن چکے تھے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، میں اور میری تنہائی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر میں نہ
رہا تو میری تنہائی کس قدر تنہا ہو جائے گی۔

ذہن پر بہت بڑا بوجھ لیے وہ گھسٹ گھسٹ کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہا تھا۔ ابھی
اس کے حوصلے نہیں ٹوٹے تھے۔ اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ اس
نے ڈاکٹر بننا تھا اور ضرور بننا تھا اس کے عزم میں اب ضد بھی شامل ہو گئی تھی۔

حوصلے پست نہ ہوں تو قدم جمانے کو جگہ مل ہی جاتی ہے۔ راہیں استوار ہوتی
جاتی ہیں۔ اور قسمت بھی یاور ہو۔ تو وسیلے از خود بن جاتے ہیں۔

اسد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسکول میں شام تک بیٹھ کر پڑھنے پر ایک دن چوکیدار
نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "روزانہ شام ڈھلے گھر جاتے ہو؟"

"گھر؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" اسد نے تلخی سے کہا۔

"کیا؟"

"میں یتیم ہوں۔ ماں ہے نہ باپ، بھائی ہے نہ بہن۔ کوئی گھر بار بھی نہیں، ویٹنگ روم میں سوتا ہوں۔ تھوڑی بہت مزدوری کر کے خرچہ چلاتا ہوں لیکن اب فیس داخلے کی۔ کہاں سے دوں گا؟"

چوکیدار اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اس کے حالات کریدتا رہا۔ ہمدردی جاگی۔ اس نے اسد سے کہا "آج سے تم میرے ساتھ رہا کرو گے۔ کوارٹر میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔"

چوکیدار نے نہ صرف اسے پناہ دی بلکہ دوسرے ہی دن ہیڈ ماسٹر کو بھی روداد سنا ڈالی۔ ہیڈ ماسٹر بے حد متاثر ہوا اسد تین سال سے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ اتنا ذہین اور لائق تھا۔ ہیڈ ماسٹر جانتا تھا اس کی مدد کرنا ضروری تھی ہیڈ ماسٹر نے اسے بلایا۔ حالات کا اتنی ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کرنے پر شاباش دی۔ اسکول کے فنڈ سے اس کا داخلہ دیا اور آئندہ بھی مدد دینے کا وعدہ کیا۔

ہیڈ ماسٹر کے ملنے والے ایک مینجر بزرگ ہونہار طلبا کی بہت مدد کرتے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے دوبئی میں تھے۔ زکوٰۃ خیرات جو بھی دینا ہوتی یہ بزرگ اسے رفاہی کاموں میں خرچ کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر نے اسد کے متعلق بتایا۔ تو انہوں نے اس کی پڑھائی اور رہائش کے سارے خرچے اپنے ذمے لے لیے۔

اسد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایک در بند ہوا تو دوسرا خدا نے کھول دیا۔ پریشانی سے نجات ملی تو وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر پڑھائی میں جت گیا۔

ایف ایس سی میں ٹاپ کیا۔ میڈیکل میں داخلہ مل گیا۔ رہائش ہوسٹل میں تھی۔ دن گزرتے پتہ بھی نہ چلا اور اسد ڈاکٹر بن گیا۔

جس دن اسد ڈاکٹر بنا اس کی زندگی کا وہ عظیم ترین دن تھا۔ وہ سجدۂ شکر بجا لایا۔ خدا نے اس پر یہ خاص الخاص کرم کیا تھا کہ اک یتیم و بے سہارا انسان کو کامیابی کے اس زینے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس دن اسے آسیہ بیگم بھی بہت یاد آئی۔ جی چاہا کہ جا کر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے۔ اسے بتائے کہ وہ ڈاکٹر بن گیا ہے۔ وہ اس کے نالائق بیٹوں سے کہیں برتر ہے۔

لیکن

اس سوچ کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ غرور و تفاخر سے بچنا چاہتا تھا۔ خداوند تعالیٰ کی نوازشوں اور انعام و اکرام پر سجدۂ شکر بجا لانے والے اسد سے ایسی سطحی اور گراوٹ والی حرکت سرزد ہو ہی نہیں سکتی تھی، دوسرے کی انا اور عزت نفس کو مجروح کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔

ہاؤس جاب کے بعد اسے نوکری بھی مل گئی۔ کچھ پیسے جمع ہو گئے۔ تو اس نے اپنے محسنوں کے پاس دوبئی جانے کا سوچا۔ وہ بھی اس ہونہار لڑکے سے ملنے کے خواہش مند تھے۔

اسد دوبئی گیا۔ وہاں اسے ایک اچھی جاب کی آفر بھی ملی۔ اس نے یہ نوکری قبول کر لی۔ پانچ سال تک وہ وہاں رہا۔ وہیں اس کی شادی عظمیٰ سے ہو گئی۔ عظمیٰ جو ان محسنوں کی یتیم بھانجی تھی۔ یہ شادی اسد نے ڈرتے ڈرتے کی۔ عورت کا روپ جو آسیہ نے دکھایا تھا وہ اس سے خوف زدہ تھا۔

لیکن

قسمت ڈاکٹر پر مہربان تھی۔ رفیقِ حیات ایسی ملی جس نے اسکو زندگی کے خوبصورت اور آسودہ لمحات سے آشنا کیا۔ ڈاکٹر اسد دوبئی سے سعودی عرب چلا گیا۔ تین سال وہاں گزارے۔ زندگی نے بھرپور نعمتوں سے نوازا۔ حج کی سعادت حاصل کی پھر وہ یورپی ملکوں میں کئی سال قیام پذیر رہا۔ یو کے میں ایف آر سی ایس کی ڈگری لی۔ چند سال وہاں گزرے پھر وہ امریکہ چلا گیا۔

اب پچھلے سال وہ ڈاکٹر اسد ملک فرشتہ خصلت انسان مسیحائی تاثیر رکھنے والا شخص اس ہسپتال میں اپنے فرائض انجام دینے کے لیے چلا آیا۔

"سر" نرس کی آواز پر ڈاکٹر اسد نے سوچوں کے بحر طلاطم سے ابھرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔"سر..." نرس نے پھر کہا۔

ڈاکٹر ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر حال میں آچکے تھے سر کو ہولے سے جھٹکا دیا اور ریوالونگ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے رُخ دروازے کی طرف موڑا اور نرس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر۔ وہ بیڈ نمبر ۱۴ کی پیشنٹ......"

"آسیہ بیگم؟"

"کیا ہوا انہیں۔ تکلیف ہے کوئی؟"

"جی۔ نہیں۔ ان کے گھر سے"

"کوئی آیا ہے؟"

"جی"

"کون؟"

"پتہ نہیں سر۔ وہی ہیں جو رات انھیں ایڈمٹ کروا کے گئے تھے۔ انھیں بھیج دوں؟ آپ نے کہا تھا نا"

"ہا۔ں۔ ہاں"

"بہتر سر" نرس چلی گئی۔ ڈاکٹر کرسی میں پھر پیچھے کو ہٹ گئے۔ اسرار یا جبار۔ دونوں میں سے کوئی ایک ہوگا۔ ڈاکٹر نے سوچا۔ ڈاکٹر کے ذہن میں یہ بھی خیال آیا کہ انہیں ان سے بیگانگی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے یا اپنائیت کا؟

وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ نرس ایک مرد اور عورت کو اندر لاتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں"

ڈاکٹر نے دیکھا، وہ اسرار نہیں تھا۔ جبار بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی اور ہی شخص تھا۔ اس کے ساتھ غالباً اس کی بیوی تھی تیس بتیس سالہ آدمی نے سلام کرتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

ڈاکٹر نے کرسی سے قدرے اُٹھتے ہوئے عورت کو سلام کر کے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود اس شخص سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ "ڈاکٹر ملک"

"اشفاق احمد" آنے والے نے اپنا نام بتایا۔ ڈاکٹر نے عورت کی برابر والی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی فرمایئے" اشفاق نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بلایا تھا ہمیں"

ڈاکٹر بیٹھ گئے۔ میز پر کہنیاں ٹکا کر ہاتھوں کی مٹھی پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے بولے۔ "آپ آسیہ بیگم کے کیا لگتے ہیں آپ ہی نے رات انہیں ایڈمٹ کروایا تھا نا"

"جی" اشفاق بولا۔ "بس انسانیت کا ناتہ ہے جی ہمارا"

"کیا؟"

"ڈاکٹر صاحب بہت دکھی اور لاچار ہیں آسیہ بیگم"

"بیمار جو ہیں"

"بیماری سے زیادہ لاچاری ہے۔ بہت دکھی ہیں۔ اکیلی جان اور دکھ ہزار"

"میں سمجھا نہیں۔ ان کے شوہر تھے۔ دو بیٹے۔ اور بھرا پرا گھر۔ پیسے کی فراوانی"

"آپ انہیں جانتے ہیں؟ عورت نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیا۔

"آں۔ ہاں۔ پچیس برس پہلے"

"بہت پرانی بات ہے وہ تو" اشفاق بولا۔ "پچیس سالوں میں کایا پلٹ جاتی ہے"

ڈاکٹر نے دم سادھے رکھا۔ اشفاق بولا۔ "ان کے شوہر کا انتقال ہوئے بھی بیس برس

ہو چکے ہیں"

"اوہ"

"اور دونوں بیٹے بالکل آوارہ نکلے۔ باپ کے مرنے کے بعد بزنس بھی تباہ کر دیا۔ نے کسی منشیات کے بیوپاری کی بیٹی سے شادی کر لی۔ دوسرا ہمسائیوں کی بیٹی بھگا کر کہیں رد ہو گیا۔ بڑے بیٹے نے چند سال پہلے گھر بیچ دیا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا ہے۔ ان دنوں ہے ملک سے باہر جا چکا ہے۔ ماں کو دونوں بیٹے بے سہارا چھوڑ گئے۔ آسیہ بیگم ہمارا امی کی سہیلی تھیں۔ امی انھیں اپنے ہاں لے آئیں۔ امی کے انتقال کے بعد بھی ہم نے انھیں اپنے پاس ہی رکھا ہوا ہے بے سہارا ہیں۔ ہمیں تو خدا کا خوف ہے۔ امی سنایا کرتی تھیں کہ یہ بہت صحت مند بڑی خوشحال تھیں۔ لیکن اب"

"اللہ میری توبہ" عورت نے آہ بھری" بیچاری بہت ہی دکھی ہیں۔ درد درد کر نظر بے حد کمزور ہو گئی ہے۔ سنائی بھی کم دیتا ہے۔ مال و دولت رہا نہ اولاد۔ کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا بیچاری کے"

"ہم سے جو ہو سکتا ہے، ہم کر دیتے ہیں" اشفاق بولا۔ بڑے بھلے دن گزار رہی رہی ہیں۔ پتہ نہیں کتنی زندگی ہے ابھی، خیر اللہ مالک ہے"

وہ باتیں کر رہے تھے اور ڈاکٹر اسد کی سوچیں پھر شیشے کی دیوار کے پار جا چکی تھیں۔ پینتیس چھتیس سالہ سرخ سپید صحت مند عورت۔ پیسے کی ریل پیل۔ گھر بار۔ شوہر بچے۔ کتنا مان تھا اسے ان سب پر۔

لیکن

"اجازت ہے ڈاکٹر صاحب!" اشفاق نے اٹھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عورت بھی اٹھنے لگی۔

"شکریہ" ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

عورت بولی"بے کس اور بے بس ہیں مریضہ۔ ڈاکٹر صاحب ان کا علاج اچھی طرح کیجیے گا۔ خدا ترسی ہی ہے"

ڈاکٹر نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ تو ڈاکٹر پھر کرسی میں گر گئے۔

ان کے ذہن میں بلا کا شور تھا۔ آسیہ بیگم کے ہاتھوں جھیلی سختیاں اور مصائب ذہن کا گھیراؤ کر رہے تھے۔ وہ ساری اذیتیں، سارے کرب جو اس کے ہاتھوں انھوں نے اٹھائے تھے، اپنا حساب مانگ رہے تھے۔

ڈاکٹر کا جی چاہا آسیہ بیگم کی حالت پر خوب قہقہے لگائیں، خوشی منائیں اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہیں" دیکھ لیا اپنا انجام، بہت مان تھا اپنے آپ پر، اپنے گھر پر، اپنے بچوں پر۔ سب ساتھ چھوڑ گئے۔ مجھ پر طنز کرتی تھیں نا، دیکھ لو میں آج کس مقام پر ہوں۔ کتنا بڑا ڈاکٹر ہوں۔ دھن دولت میرے گھر کی باندی ہے۔ عظیم عورت کی رفاقت مجھے میسر ہے۔ پیار، پیارے بچوں کا ساتھ ہے اور تم۔ تم۔ اس حال میں۔ بیماریوں لاچاریوں اور دکھوں کی پوٹ بن کر میرے پاس ہی آئی ہو۔ میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں چاہوں۔ تو تمہیں اسی بیڈ پر سسک سسک کر لمحہ لمحہ کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دوں۔ ہاں۔ میں اپنے دکھوں اپنی اذیتوں، اور اپنی مصیبتوں کا تم سے اسی طرح بدلہ لوں گا۔ لوں گا"

بے اختیارانہ ڈاکٹر ملک نے میز پر مکا مارا۔ اور اپنے ہی مکے کی آواز سے وہ چونک گئے۔

"اُف" انھوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گراتے ہوئے کہا" میں کہاں پہنچ گیا تھا۔ رذالت کے کن گڑھوں میں گرنے جا رہا تھا۔ یہی تو آزمائش کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور نوازشوں کے بدلے میں کتنی حقیر اور ذلیل باتوں کی سوچوں میں گھر گیا تھا۔ قدرت آسیہ بیگم سے خود ہی انتقام لے چکی ہے۔ میں کون ہوتا ہوں۔ اس سے بدلہ لینے والا میرے خدا، میری بھٹکی ہوئی سوچوں پر مجھے معاف کر دینا۔ مجھ سے بھول ہوئی، غلطی سرزد

ہوئی ہے، مجھے معاف کر دینا۔ میرے مولا مجھے معاف کر دینا۔"

ڈاکٹر اسد اٹھ کھڑے ہوئے۔ عظمت کے مینار کی طرح روشن ذہن اور عزم کی استواری لے کر انھوں نے آسیہ بیگم کو وارڈ سے پرائیویٹ کمرے میں منتقل کروایا۔ اس کے سارے اخراجات خود برداشت کیے اور بڑی تندی سے اس کا علاج کیا۔ وہ گھر سے اس کے لیے کھانا منگواتے۔ اور کتنی کتنی دیر اس کے پاس بیٹھے اس کی ہمت بندھاتے رہتے۔

وہ جس دن ڈسچارج ہو رہی تھیں۔ اشفاق اور اسکی بیوی انھیں لینے آئے تھے۔

ڈاکٹر اسد نے دونوں سے کہا "آپ لوگوں کی بہت مہربانی جو آپ نے اتنا عرصہ ان کی نگہداشت کی۔ اب یہ آپ کے ہاں نہیں میرے ہاں رہیں گی۔"

"جی" دونوں متعجب ہو کر بولے "آپ ان کے کچھ لگتے ہیں؟"

"انسانیت کا ناتہ ہے" ڈاکٹر نے مسکرا کر اشفاق کی بات دہرائی "ویسے میری بیوی کو ایک عدد ساس کا بہت شوق ہے۔ وہ کسی بزرگ ہستی کے سایۂ عاطفت میں رہنے کی خواہش مند ہیں۔ میرا خیال ہے، اِن کے ہمارے ساتھ رہنے سے وہ بہت خوش ہوگی۔ ہاں میں نے آسیہ بیگم کو یقین دلایا ہے کہ میں ان کے بیٹے کا دوست ہوں، یوں ان کا بیٹا ہی ہوں، امید ہے آپ بھرم کے اس رشتے کو توڑیں گے نہیں۔ ویسے آپ جب انہیں ملنا چاہیں، آسکتے ہیں، میرے گھر کے دروازے آپ کو کھلے ملیں گے۔"

ڈاکٹر، آسیہ بیگم کو بڑی عزت اور احترام سے اپنے گھر لے آئے۔ انہوں نے آسیہ بیگم کو یقین دلایا تھا کہ وہ جبار کے جگری دوست ہیں۔ جبار امریکہ میں ہے اور اس نے ڈاکٹر پر بہت سے احسان کیے تھے۔ جس کا بدلہ وہ اس طرح چکانا چاہتے ہیں۔

آسیہ بیگم، ڈاکٹر اسد کو پہچان نہ سکی تھیں۔ نظر بے حد کمزور تھی۔ سنائی کم پڑتا تھا۔ پھر پچیس برس ان پر جس بیدردی سے گزر گئے تھے۔ یادوں کے سارے شناخت یا پہچان کا سوال ہی کیا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ کہانی گھڑی ہی اس لیے تھی کہ وہ کسی وقت بھی ماضی سے

نہ ٹکرائیں۔ ان کی انّا مجروح نہ ہو اور عزتِ نفس بھی قائم رہے۔

عظمیٰ اس معمر اور بزرگ عورت کے گھر میں آنے سے خوش تھی۔ لیکن کسی قدر متجسّس بھی۔ اس رات جب وہ آسیہ بیگم کو اپنی بیٹی کے کمرے میں بیڈ پر لٹا کر شب بخیر کہہ کر آئی۔ تو اس نے آسیہ ہی کی باتیں کرتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟"

بیڈ پر لیٹے ڈاکٹر نے آنکھیں بند کر کے کہا "عظمیٰ یہ وہ ہیں ــــ جو نہ ہوتیں تو شاید میں ڈاکٹر نہ بن پاتا۔ بس اس سے زیادہ ان کے متعلق اور کچھ نہ پوچھنا۔"

آسیہ بیگم، ڈاکٹر اسد کے ہاں بڑی عزت و احترام سے جی رہی ہیں۔ اپنے محسن کے متعلق وہ اب تک جان نہیں پائیں کہ یہ وہی بے سہارا یتیم و یسیر لڑکا ہے۔ جس پر انھوں نے اپنے عروج کے دور میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ یہ بات وہ کبھی جان بھی نہ پائیں گی۔ کیوں کہ ڈاکٹر اسد انھیں خفت و شرمندگی کے احساس سے دوچار کرنا نہیں چاہتے۔ کسی کی انّا یا عزتِ نفس مجروح کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں۔ وہ تو الٹا آسیہ کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے ماں کا خالی خانہ پُر کر دیا ہے۔

اور اکثر وہ یہ بھی تو سوچتے ہیں کہ وہ نہ ہوتیں تو شاید..... شاید وہ ڈاکٹر بھی نہ بن سکتے۔ تخریب کے حوالے سے ہی سہی۔ تعمیر کی راہیں تو آسیہ بیگم کے رویے ہی سے بنی تھیں۔

ہونی انہونی

ہوٹل کا وسیع و عریض ہال شادی کی تقریب کے لیے بطور خاص آراستہ کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ پھولوں اور روپہلی کاغذوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ ڈسکو لائٹس بہار دکھا رہی تھیں۔ درمیان میں جگہ چھوڑ کر آگے پیچھے کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ تقریباً ڈھائی سو آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ ایک طرف سنہری اور نقرئی رنگ کاغذی پھولوں اور مہکتے اصلی پھولوں کے پردے سے لٹک رہے تھے۔ انہی کے درمیان اسٹیج تھی جس پر سرخ مخملیں صوفے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں دولھا دلہن کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ ہر طرف چمک دمک تھی۔ آرکسٹرا پر دھیمے سُروں میں خیر مقدمی دُھن بج رہی تھی۔ مہمان آرہے تھے۔ دلہن کے والدین بھائی بہنیں اور دوسرے قریبی عزیز مہمانوں کی عزت افزائی کے لیے بیرونی دروازے پر کھڑے تھے۔ آنے والوں کا ہنستے مسکراتے چہروں سے استقبال کر رہے تھے۔ مبارک بادیں وصول کر رہے تھے۔ تحائف اکٹھے کر کر کے کونے والے کمرے میں پہنچا رہے تھے۔ عورتیں زرق برق لباسوں اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والے بیش قیمت زیوروں سمیت رات کے فنکشن کی مناسبت سے گہرے میک اپ کیے آرہی تھیں۔ مردوں نے بھی صاف ستھرے لباس پہنے ہوئے تھے۔ نوجوانوں کی اکثریت نے عوامی سوٹوں پر جیکٹس، واسکٹیں اور کوٹیاں پہن رکھی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں جدید طرز کے خوبصورت لباس پہنے تھیں۔

بارات کا انتظار تھا۔ فون آچکا تھا کہ بارات گھر سے چل پڑی ہے۔ اس لیے دُلہن کے عزیز و اقارب کچھ بے تاب سے نظر آرہے تھے۔ بہت بڑے گھر کی بارات تھی۔ استقبال کرنے والے بھی کچھ کم نہ تھے۔ پھر بھی قدرے گھبراہٹ تھی۔ اِدھر اُدھر یونہی بھاگے پھر رہے تھے۔ باراتیوں کے لیے جو کرسیاں اور صوفے مخصوص تھے ان پر کچھ مہمان آبیٹھے تھے۔ دلہن کی خالائیں اور بہنیں بڑے تپاک اور پیار سے ان کو جگہ خالی کرنے کا کہہ کر دوسری نشستوں پر بٹھا رہی تھیں۔

باراتیوں پر سے پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے کے لیے دُلہن کی چھوٹی بہن زونی اور اس کی چند سہیلیاں بڑے دروازے سے باہر نکل آئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی..... ٹوکریوں میں پھول اور پتیاں تھیں زونی کی سب سے عزیز سہیلی شہناز اس کے قریب ہی کھڑی تھیں۔

"شہنہ تم اِدھر آجاؤ۔ دو دو یہ قطاریں بنا لیتے ہیں؟" کسی نے کہا۔

"نہیں یہ میرے ساتھ یہیں کھڑی رہے گی" جھلمل کرتے دوپٹے کا پلّو سنبھالتے ہوئے زونی نے ہنس کر کہا۔ "ہیں نا شہنہ؟"

شہنہ نے یونہی سر ہلا دیا۔

"بھئی اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟" زونی نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"نہیں تو؟" شہنہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔

"دیر ہو جانے کے خیال سے ڈر رہی ہو نا؟"

"ہوں"

"نو بجے تک تو بمشکل بارات آئے گی میڈم۔ رات کے بارہ بجے سے پہلے نہ جا سکو گی گھر۔"

"ہائے اللہ۔ امّی تو جان سے مار ڈالیں گی مجھے ___ پتا ہے نا کتنی مشکلوں سے اجازت ملی ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔"

"تمہارے لیے نہیں ہے نا؟"

"بزدل ہو بہت ــــ" دونوں کی باتیں سن کر پاس کھڑی ربیعہ نے کہا۔ "شادی بیاہ کا معاملہ ہو تو دیر ہو ہی جاتی ہے" ــــ شہنہ نے آنکھیں پھیلا کر اُسے دیکھا۔

"فکر نہ کرو" زونی نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔ "میں نے آنٹی سے کہہ دیا تھا کہ فکر نہ کریں۔ دیر ہو بھی گئی تو میں خود چھوڑنے آؤں گی۔"

"سچی؟"

"ہاں۔"

"امّی نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟"

"یار اتنی اچھی امّی ہیں تمہاری کچھ نہیں کہیں گی۔ خواہ مخواہ ہی ڈر رہی ہو۔ مطمئن ہو کر کھڑی رہو، ابھی باراتیوں پر پھول نچھاور کرنے ہیں محترمہ نے۔"

شہنہ نے کندھے اُچکائے ــــ وہ واقعی کچھ نروس سی ہو رہی تھی۔ امّی کا ڈر تو تھا سو تھا اس ہوٹل میں ایسی تقریب میں شرکت کرنے کا پہلا موقع تھا۔ اس نے ہوٹل اندر سے کبھی کب دیکھا تھا۔ اسی لیے تو امی سے لڑ جھگڑ کر اس شادی میں شرکت کی اجازت لے لی تھی۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی جس میں ابھی تک پرانی قدروں کی شناخت باقی تھی۔ عصری تقاضوں سے مرعوب و مغلوب ہو کر نئی تہذیب اور جدیدیت کو بھی قبول کیا جا رہا تھا لیکن بخوشی نہیں، سو مین میخ نکالی جاتی تھی۔ برائی بیان کی جاتی، بدصورتی تلاش کی جاتی، قباحتیں ٹٹولی جاتیں پھر زمانے کا ساتھ دینے کو وہی کچھ کرنا بھی پڑتا ــــ یوں یہ لوگ زمانے کے ساتھ چل تو رہے تھے لیکن شانہ بشانہ نہیں، کئی قدم پیچھے رہ کر۔ اس سوچ اور خیال نے شہنہ کی تعلیم میں بھی رخنہ اندازی کی تھی۔ میٹرک سے آگے پڑھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کالج کے نام سے یہ لوگ گھبراتے تھے لیکن شہنہ نے داخلہ لے لیا تھا۔ امّی کو اس نے خود ہی سمجھایا تھا۔ میٹرک پاس کی کوئی

اہمیت نہیں تھی..... بی اے، بی ایڈ کرنے کے بعد وہ کسی اسکول میں ملازمت کر سکتی تھی۔

ملازمت بھی اس کی ضرورت تھی۔ وہ بیوہ ماں کی بیٹی تھی جس نے خود محنت کر کے بیٹی کو پالا تھا۔ بھائیوں کی دست نگر رہی تھی۔ وہ ان کی ممنون احسان تھی۔ جنھوں نے کسمپرسی میں اسے سہارا دیا تھا لیکن شہنہ کو یہ بات کھلتی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ماں کو احسانوں کے اس بوجھ تلے سے نکالنا چاہتی تھی۔

"امّی جب میں کمانے لگوں گی تو پھر آپ ماموں ممانیوں کے سامنے سر اونچا کر کے بات کیا کریں گی۔ ٹھیک ہے ان لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا ہے لیکن ممانیاں جس طرح جتاتی ہیں مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔" وہ ماں کے گلے میں بانہہ ڈال کر کہتی۔

امّی اُس کا ماتھا چوم لیتیں "اللہ کرے تیرے کمانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس سے پہلے ہی تیرے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی "یہ بہت شوق ہے امّی میرے اچھے بھلے ہاتھ پیلے کرنے کا۔"

امّی بھی مسکرا دیتی۔

لیکن دل ہی دل میں ہول سا اُٹھتا محسوس کرتی۔ اپنے مالی حالات سے آگہی تھی اچھے رشتے ویسے ہی کمیاب تھے۔ اس پر جہیز کا مسئلہ۔ دو ایک دل پسند رشتے دیکھے بھی لیکن بات اس لیے نہ بنی تھی کہ جہیز کا پلڑہ رشتے کے پلڑے سے بھاری تو کیا برابر بھی نہ آتا تھا۔ امّی کو مایوسی تو ہوئی تھی لیکن ناامید نہ تھیں۔ اپنی شہنہ کے لیے انھوں نے جس قسم کا رشتہ تلاش کرنا تھا، برابر کوشش میں لگی ہوئی تھیں ــــ ویسے ایرے غیرے کے ہاتھ میں اپنی خوبصورت اور خوب سیرت بیٹی کا ہاتھ دینے کو وہ بھی تیار نہ تھیں۔ اس پر خود شہنہ نے بھی کئی بار ڈھکے چھپے اور کئی بار ہنستے ہوئے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"امّی میری شادی کرنی ہے تو ڈھنگ کا رشتہ ڈھونڈیئے گا، نہیں تو عین موقع پر انکار

کر دوں گی۔"

امی اس کی باتوں پر ہنس پڑتیں۔ ماں بیٹی میں دوستی اور بے تکلفی کا رشتہ بھی از
لیکن بے تکلفی اور دوستی کے باوجود شہنہ امی کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی
کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی جو امی کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ وہ خود تھرڈ ایئر میں
کالج سے سیدھے گھر اور گھر سے کالج، یہی معمول تھا۔ بازار جانا ہوتا تو امی کے ساتھ
سہیلیاں تھیں جو کالج تک ہی تھیں۔ صرف زونی سے دوستی تھی۔ کبھی کبھار زونی کے ہاں
امی کی اجازت سے ہو آتی تھی ان کے ہاں۔ امی نے زونی کو دیکھا بھالا تھا۔ طبقاتی فرق
تو تھا۔ وہ اک امیر کبیر گھرانے کی بیٹی تھی لیکن امارت کے باوجود وہ بڑی پُرخلوص اور
با اخلاق تھی۔ اسی لیے دونوں کی دوستی نبھ رہی تھی۔

آج زونی کی بہن کی شادی تھی۔ امی، شہنہ کو ہوٹل میں بھیجنے پر رضامند تو نہ تھیں
لیکن دوستی تھی، اور زونی کا اصرار بھی۔ خود شہنہ بھی یہ تقریب دیکھنا چاہتی تھی۔ اس
لیے امی کو اجازت دینا ہی پڑتی تھی۔ شہنہ نے امی سے فاختئی رنگ کا وہ سوٹ زبردستی
لے کر سلوایا تھا جو امی نے اس کے جہیز کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ ان سادہ کپڑوں میں بھی بڑی
پیاری لگ رہی تھی۔ زونی نے بڑے اصرار سے اُسے اپنے نازک نازک بُندے پہنائے
تھے، اور ہلکا ہلکا میک اَپ بھی کرایا تھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیوں نے بڑے قیمتی لباس پہن
رکھے تھے۔ بناؤ سنگھار میں دلہنوں کو بھی مات کیا ہوا تھا۔ طلائی زیورات بھی پہنے تھے۔
لیکن وہ اپنی سادگی ہی کی وجہ سے سب میں منفرد نظر آ رہی تھی۔ کئی مہمان عورتوں نے
اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تھا۔ کئی نے اس کا حدود اربعہ بھی جاننے کی کوشش
کی تھی۔

"بارات آ گئی ——— بارات آ گئی" اک شور سا مچ گیا ——— گاڑیوں کی قطاریں پارک
ہونے لگیں۔ لوگ گاڑیوں سے نکل نکل کر ادھر آنے لگے۔ لڑکیاں ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور

ور کرنے لگیں۔ ہنسی مذاق اور شور و غل سے اک ہنگامہ بپا تھی۔
شہنہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ——— پھولوں بھری ٹوکری اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن
پھول مہمانوں پر نچھاور نہیں کر سکی۔ جھجک اور گھبراہٹ نے ایسا کرنے نہیں دیا۔

"ارے۔ بارات جا بھی چکی اور تم نے پھول" عاصمہ نے اسے ٹھوکا دیا تو اس نے
بدحواسی میں ساری ٹوکری اچھال دی۔ پھول اور پتیاں کچھ فرش پر بکھریں، کچھ اس نوجوان
کے چہرے اور لباس پر پڑیں جو دو رویہ کھڑی نوجوان و سجی سجائی لڑکیوں کو مسکرا مسکرا کر
دیکھتے ہوئے اندر جا رہا تھا۔

پھولوں کی ایکا ایکی بارش ہوئی تو وہ رُک گیا۔ اک لمحہ کو شہنہ کی طرف دیکھا۔
بعض لمحے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ کسی ایسے ہی موقعے کے منتظر ہوتے ہیں۔ احساس کو
جذب کر لینے کی قوت ان میں بے حد ہوتی ہے۔

حسین لڑکیوں کے ہنستے مچلتے گروپ میں یہ سادہ سی لڑکی اتنی منفرد لگی کہ عامر اس
خاص لمحے کی گرفت میں آ گیا جو احساس کو جذب کر لینے کی پوری قوت رکھتا تھا۔

"شکریہ مس" اس نے مسکرا کر کہا تو عاصمہ نے ہنس کر کہا۔

"صرف مس نہیں مس شہناز عرف شہنہ۔"

"اوہ شہنہ صاحبہ" عاصمہ کی شوخ حماقت پر شہنہ تو جزبز ہوئی لیکن عامر کو اس کا
نام پتا چل گیا۔ "بہت بہت شکریہ۔ میری راہوں میں پھول بچھانے کا۔"

وہ ذومعنی بات کر کے آگے بڑھ گیا کہ برآمدے سے اس کا دوست اسے پکار رہا
تھا۔ لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولیں۔ "تو جناب عامر صاحب ہیں ———؟"

شہنہ بوکھلا سی گئی تھی۔

"چلو اب یہیں تو نہیں کھڑے رہنا" زونی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔

"میدان تو مار لیا اس نے" کئی ہنس کر بولی۔

"ہے خوب اسمارٹ ـــ بڑا شوخ اور چلبلا سا لگتا ہے۔" نگہی بولی۔

"اندر چلیں۔" عاصمہ نے کہا۔ "ذرا اس ذات شریف سے ملیں گے۔"

"وہ تو منتظر ہی ہوگا۔ کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا ہم سب کو۔" عائزہ نے ہنس کر کہا۔

"ہم سب کو نہیں یار ـــ صرف شہنہ کو تک رہا تھا۔" نگہی نے ہنس کر شہنہ کو دیکھا۔ شہنہ کو ان لڑکیوں کی بے باک گفتگو اچھی نہیں لگی، لیکن چپ رہی۔ وہ سوچ رہی تھی ہو سکتا ہے ہوٹلوں کی تقریبات میں شرکت کرنے کے ایسے ہی آداب ہوں۔

کھانے کے دوران شہنہ اپنے چہرے پر نگاہوں کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ اس سے ویسے ہی اس ہڑبونگ میں کچھ کھایا نہیں گیا۔ مہمان تو فاقہ زدہ لوگوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اتنے مہذب اور شائستہ نظر آنے والے لوگ جس طرح کھانے پر جھپٹ رہے تھے۔ وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اسمارٹ اور بنی سنوری عورتیں بھی پلیٹوں میں پہاڑیاں بنائے ہوئے تھیں۔ یوں لگتا تھا۔ آج تک انہوں نے ایسا کھانا کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اتنا شور ایسی چھینا جھپٹی کھانے تک پہنچنے کے لیے دوسروں سے دھکے بازی۔ شہنہ تو حیران ہو ہو کر صرف تکے ہی جا رہی تھی۔ وہ تو زونی اس کے لیے پلیٹ میں کھانا لے آئی تھی۔ ورنہ وہ بھوکی ہی رہ جاتی۔ اس نے پلیٹ اسے تھماتے ہوئے کہا "کچھ خود بھی ہمت کرو۔ یوں کھڑی رہیں تو کچھ نہ ملے گا۔ ہوٹلوں میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ ایک بار کھانا لگ گیا سو لگ گیا۔ اسی لیے تو لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں جو پیچھے رہ گیا اُسے بچا کھچا ملے گا۔"

اس نے اور کیا لینا تھا۔ زونی جتنا کچھ ڈال کر لے آئی تھی، وہی کافی سے زیادہ تھا وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی تھی لیکن ہال میں گھومتے پھرتے لوگوں سے باتیں کرتے

دل اور عورتوں سے ہنسی مذاق کرتے وہ پُرشوق سی نگاہیں اس کی طرف بھی برابر اُچھال رہا تھا۔ شہنہ پر جب بھی اس کی نگاہ پڑتی دل زور سے دھڑک اٹھتا۔

کھانے کے بعد دولہا دلہن اسٹیج پر لا بٹھائے گئے۔ نوجوانوں نے درمیان میں بڑی جگہ پر اُن کی آمد کی خوشی میں بھنگڑا ڈالا۔ پھر کچھ جوڑے رقص کے لیے اُٹھے۔ ہڑا پر رقص کی تیز تیز دُھنیں بجائی جا رہی تھیں۔ عورتیں مرد نوجوان سب خوشی کا اظہار کر کے ناچ رہے تھے۔ کوئی رقص کی ٹیکنیک کی الف بے بھی نہ جانتا تھا۔ کوئی تھوڑے سے اسٹیپ جانتے تھے۔ کچھ ڈسکو میں مصروف تھے۔ باقاعدگی سے ناچنا شاید چند لوگوں کے سوا کسی کو نہیں آتا تھا اور ان چند لوگوں میں وہ بھی تھا۔ لگتا تھا اس فن میں ماہر ہے۔ اس کے قدم نپے تُلے انداز میں اٹھتے تھے۔ ہاتھوں اور جسم کی حرکت متوازن تھی۔ کئی ایک لڑکیوں نے اس کے ساتھ ڈسکو کیا۔ وہ اَن تھک انداز میں مصروف رقص تھا۔ شہنہ اُسے دیکھ رہی تھی۔ یہ نوجوان اپنی حسین سیاہ آنکھوں گھنے بالوں اور چھریرے بدن کی ساحرانہ کشش میں رقص کرتے ہوئے اُسے جکڑے جا رہا تھا۔ وہ اپنی نگاہیں اس سے ہٹا لینا چاہتی تھی۔ اپنے دل سے اس کا خیال نکال دینا چاہتی تھی لیکن جو پورے زور شور سے از خود رستے بناتا آنکھوں سے دل اور دل سے روح میں اُترتا چلا جائے۔ ایک کمزور سی لڑکی کر بھی کیا سکتی تھی۔ کیونکر اُسے روک سکتی تھی۔

"یہ وقت آنے کا ہے۔" امی نے زونی کے جانے کے بعد جو اُسے گھر پہنچانے آئی تھی غصے سے شہنہ سے کہا۔

شہنہ تو سرور و انبساط میں ڈوبی تھی۔ زندگی نے آج اپنا جو رُخ دکھایا تھا اس سے مسرور تھی۔ مسکراتے ہوئے امی کے گلے میں باہنیں ڈال کر انھیں پیار کر لیا۔ "ہائے امی آپ نے تو بگاڑ دیا ہے، سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ اتنی شاندار تقریب تھی۔ کچھ اس کا حال احوال پوچھیں۔"

اُلٹا ڈانٹنے لگی ہیں۔"

امی نے اس کی بانہیں گلے سے نکالتے ہوئے کہا۔ "تو مزے کی بات کر رہی ہے۔ یہاں جان اٹکی ہوئی تھی۔ یہ بھی کوئی دستور ہے بھلا؟"

"یہ بڑے لوگوں کے دستور ہیں ماں جی ـــــ کیا ہوا جو چند گھنٹوں کے لیے ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے۔" وہ خواہ مخواہ ہنسے جا رہی تھی۔

"چل بک بک بند کر۔ کپڑے بدل۔ نیند خراب کر دی میری۔" امی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایک دن اور خراب ہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

"کل رات دعوت ولیمہ ہے۔"

"تیرا جانا کوئی ضروری نہیں۔"

"نہیں امی ـــ میں نے ضرور جانا ہے۔ آنٹی نے بھی اتنی تاکید کی تھی اور زونی کا تو آپ کو پتا ہی ہے، چھوڑے گی تھوڑا ہی ـــ پھر میرا جی بھی تو چاہتا ہے۔ امی آپ نے کبھی کسی ہوٹل میں شادی بیاہ کی تقریب دیکھی ہو تو ـــ"

"بس کر اب۔ چل کپڑے بدل۔"

"کل جانے دیں گی نا؟"

"اتنی دیر لگانا ہے، تو کبھی نہیں بھیجوں گی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ امی کے لہجے میں تھوڑی سی چھوٹ نظر آ رہی تھی۔ اس نے پھر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے گال پر پیار کر لیا۔

دوسری شام وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی ـــ براؤن رنگ کا سادہ جوڑا اس کے پاس تھا۔ دو چار دفعہ پہلے بھی پہن چکی تھی لیکن چارہ اور کوئی نہیں تھا۔ ویسے

رنگ اس پر کھلتا بہت تھا۔ اس رنگ کی مناسبت سے اس نے کل سے قدرے شوخ میک اپ کیا۔ آج چہرے پہ اتنا نکھار اور آنکھوں میں اتنی زندہ بشاشت تھی کہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ خود ہی حیران ہو رہی تھی۔

امی سے جلد واپس بھجوانے کا زونی نے بھی وعدہ کیا۔ وہ اسے لینے آئی تھی لیکن جاتے جاتے بولی۔ "آنٹی آپ بالکل فکر نہ کیجئے گا۔ اگر ذرا دیر بھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں، شادی ہے، دیر ہو ہی جاتی ہے۔ ویسے آج تو ہم لوگ بھی جلدی واپس لوٹیں گے۔ میں شہنہ کو خود چھوڑ جاؤں گی۔"

شہنہ نے آنکھوں آنکھوں میں امی سے التجا کی۔ پھر اُن کی خاموشی کو رضا سمجھ کر زونی کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ زونی کی بڑی سی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ آج وہ بڑے اعتماد سے گاڑی میں بیٹھی۔

زونی نے آج بھی اس کے میک اپ کو کچھ ٹچ دیئے۔ گلے میں اپنی امی کا گلوبند زبردستی پہنا دیا اور اس کے سادہ کپڑوں کا ہم رنگ کامدانی کا دوپٹہ اوڑھنے کے لیے نکال لائی۔

"ہائے نہیں زونی ـــ میں نہیں اوڑھوں گی اتنا بھاری دوپٹہ۔"

"کیوں نہیں اوڑھے گی؟" زونی نے دوپٹہ اس کے کندھے پر ڈال کر ایک طرف کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "یوں ہی رکھنا ـــ بڑی بوڑھیوں کی طرح سر پر نہ ڈال لینا۔ دیکھو کتنی حسین لگ رہی ہو۔"

"وہ تو میں واقعی لگ رہی ہوں۔" زونی کے کمرے میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر وہ اٹھلائی۔ "سادہ کپڑوں میں بھی لگ رہی تھی۔"

"جی نہیں ـــ اب تو سراپا قیامت نظر آ رہی ہو۔"

وہ ہنسی۔ "کیا فائدہ ـــ؟"

زونی نے بھی ہنس کر کہا۔" بہت فائدہ ہے۔ یہ قیامت کسی پر ڈھے بھی سکتی ہے"

" ہائے زونی ___ مت کرو ایسی باتیں"

" کل وہ تمہارے متعلق پوچھ رہا تھا" زونی نے اپنا جائزہ آئینے میں لیتے ہوئے کہا۔

شہنہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بڑے چور سے انداز میں بولی" کون؟"

" عامر"

" وہ کون ہے؟"

" رات بھر میں بھول بھی گئیں۔ بھئی وہی جس پر تم نے پھولوں کی ٹوکری اُنڈیل دی تھی ___ وہ جوڑا نس....."

" ہُوں ___"

" دولہا بھائی کا بہت قریبی دوست ہے"

" میرا ___ کیوں پوچھ رہا تھا؟"

زونی ہنس پڑی" واقعی بہت بُدھو ہے تو؟"

شہنہ دل ہی دل میں مسکرائی" اتنی بھی نہیں" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

" تجھ میں بڑا انٹرسٹڈ تھا"

" چل ہٹ ___"

" آج ذرا اس سے گپ شپ لگا لینا"

" جی نہیں"

" نہ سہی ___ اتنا وجیہہ اسمارٹ اور اونچے خاندان کا لڑکا ہے ___ تجھے نہیں پسند تو ہمیں کیا"

وہ ہنس پڑی ___ پھر زونی کو دیکھ کر بولی" تو تو ایسے بات کر رہی ہے جیسے وہ

مجھے اپنانے چل نکلا ہے۔ رشتہ بھیجا ہے"

" تو آج ذرا اُسے لفٹ دے کے دیکھ۔ کہاں جائے گا؟ چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات نہ ہو تو مجھے کہنا"

زونی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ شہنہ یقین اور بے یقینی کے عالم میں جواب بھی دیئے جا رہی تھی۔ یہ نوجوان اُسے اچھا لگا تھا۔ اس بات سے وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ لگاؤ کی ڈوری تو کل ہی بندھ گئی تھی۔ آج وہ ولیمے میں شرکت بھی تو صرف اسی لیے کر رہی تھی کہ وہ بھی آیا ہو گا۔ لیکن اپنے جذبوں کو اندر ہی اندر چھپانا تھا۔ زونی کی باتوں کو مذاق سمجھا اور مذاق کے انداز ہی میں خود بھی باتیں کیں۔

ولیمے کی تقریب بھی کل ہی جیسی تھی۔ مہمانوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ رنگ و بُو کا سیلاب اُمنڈا تھا ___ دولہا دُلہن آج بھی اسٹیج پر براجمان تھے۔ آج زونی کی بہن مونی کل کی طرح شرمائی لجائی نہیں تھی۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ سراپا تبسم تھی۔

شہنہ اُس کے پاس گئی۔ اس کو اور دُولہا بھائی کو سلام کیا۔ مونی نے اپنے شوہر انی سے کہا۔" یہ زونی کی بڑی عزیز دوست ہے۔ شہنہ"

شہنہ کے نام پر وہ کچھ چونکا۔ پھر مونی سے کچھ کہا۔ وہ مسکرا دی ___ اسٹیج پر دُلہن دیکھنے اور بھی لوگ آ گئے تھے اس لیے شہنہ پیچھے ہٹی پیچھے ہٹتے ہٹتے اُس نے سنا، انی کہہ رہا تھا۔" کل عامر انہی کی بات کر رہا تھا"

شہنہ جلدی سے اسٹیج سے اُتری۔ انی کی بات سُن کر کچھ بدحواسی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسی لیے تو سامنے سے آنے والے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

" اوہو" ٹکر سے بچنے والے نے اُسے کندھے سے روک لیا۔

" آپ" شہنہ کی نگاہیں بالکل قریب کھڑے عامر پر پڑیں جو اُسے روکے کھڑا تھا۔

" آپ؟" عامر اس پر نگاہ شوق ڈالتے ہوئے مسکرایا۔" میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا"

"کیوں؟" وہ قدرے پیچھے ہٹ کر بولی۔

عامر نے نگاہوں میں مستی بھرتے ہوئے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ وہ کانوں کی لوؤں تک سُرخ ہو گئی۔ عامر کچھ کہنے کو تھا لیکن وہ سنے بغیر پلٹی اور جلدی سے مہمانوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

لیکن تھی تو ہال ہی میں۔ وہاں ڈھونڈ نکالنا کیا مشکل تھا۔ عامر کی نگاہیں متلاشی تھیں۔ وہ اسے ایک کونے میں چند عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ کھڑی نظر آ گئی۔

"شہنہ ـــ" وہ قریب آ گیا۔ اپنا نام اس بے تکلفی سے اُس کے منہ سے سن کر وہ سن سی ہو گئی۔ لیکن وہ بڑے اطمینان سے بولا "آپ کو زدنی بلا رہی ہے۔"

شہنہ نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔ نگاہوں میں سرور و کیف بھرے اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ شہنہ خواتین کے جھرمٹ سے نکل کر اس کی طرف آئی۔

"کہاں ہے زدنی؟" اس نے پوچھا۔

"باہر۔" عامر نے ایک بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کر دیا اور پھر شہنہ کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ جہاں چند حضرات کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ وہ بھی اُن سے باتیں کرنے لگا۔ شہنہ کو پہلے اُس کی بات پر اعتماد نہیں تھا، لیکن جب وہ ان لوگوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا تو وہ بلا جھجک دروازے سے باہر چلی گئی۔

زدنی کو تلاش کرتے چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ اگلے دروازے سے نکل کر وہ اُس کے سامنے آ گیا۔

"وہ ـــ وہ زدنی ـــ" شہنہ بوکھلا گئی۔

"گولی مارو زدنی کو ـــ دیکھو تو باہر فضا کتنی حسین ہے۔ چاندنی کے غبار میں یہ سبزہ، یہ پھول، یہ درخت ـــ"

"لیکن آپ نے ـــ"

"میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں کے ہجوم میں بھی باتیں کی جا سکتی تھیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں ـــ آپ بہت جلد نروس ہو جاتی ہیں۔"

وہ سر جھکائے کھڑی رہی ـــ یوں لگتا تھا پاؤں زمین میں دھنس گئے ہیں۔ ہلنے جلنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ آخر دل بھی تو کوئی چیز ہے۔ عمر کے تقاضے بھی تو کچھ ہوتے ہیں۔ شہنہ اس کی اتنی رومانوی پیش کش کو کیسے مسترد کر دیتی۔

"آیئے۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"کہاں؟"

"اس طرف۔ لوگوں کے شور شرابے سے ہٹ کر بیٹھتے ہیں۔ بہت خوب صورت گوشہ ہے وہ۔" وہ چل دیا۔ شہنہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"میں نے کل آپ کو پہلی بار دیکھا تو ـــ" وہ رُک گیا۔ سگریٹ سلگایا اور لمبا سا کش لیا۔

"تو ـــ" وہ ہولے سے بولی۔

"تو ـــ تو اپنا آپ اپنا نہ رہا۔" وہ بڑے خوبصورت انداز سے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے مسکرایا۔

"ہائے ـــ" وہ شرما گئی۔

"بس یہی ادا لوٹ لے گئی۔" وہ پھر کش لیتے ہوئے بولا۔

دونوں اُس گوشے کے قریب آ گئے جہاں پتھریلے بینچ پڑے تھے۔ پھولوں کی بیلیں جھکی تھیں اور خوبصورتی سے تراشا ہوا سبزہ قدم بوس تھا۔

شہنہ جھجک رہی تھی، شرما رہی تھی۔ لیکن وہ بڑے ماہرانہ انداز میں جال پھینک رہا تھا۔ فٹ بھر کا فاصلہ دے کر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ شہنہ کا حوصلہ بڑھا۔ اس کی شرافت کی قائل ہو گئی۔

عامر نے اپنا مختصر سا تعارف کروایا۔ "میرے والدین کراچی میں ہیں۔ میں اُن کی اکلوتی اولاد ہوں ۔۔ یہاں ایک مل لگانے کا پلان ہے، اس لیے آیا ہوا ہوں۔ میرا مستقبل اسی شہر سے وابستہ ہے اور اب تو یہ بات بالکل ہی پکی ہو گئی ہے کہ میں چاہوں بھی تو یہاں سے کہیں جا نہ پاؤں گا۔"

شہنہ اُس کی بات سمجھتے ہوئے شرمگیں انداز سے مسکرا دی۔ اس نے شہنہ سے بھی تعارف چاہا۔ اپنے متعلق اس نے بھی پوری سچائی سے سب کچھ بتا دیا۔

"ویسے مجھے زونی نے بھی آپ کے متعلق بتایا تھا۔"

"آپ۔ زونی کے رشتہ دار ہیں۔"

"میں انی کا جگری دوست ہوں اور زونی کے منگیتر کا کزن ۔۔ رشتہ داری اور بھی ہے۔"

"کیا ۔۔؟"

"میں زونی کی دوست کا چاہنے ۔۔۔۔۔" اس نے شوخی سے شہنہ کو دیکھا۔

شہنہ شرما گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ چاہت کے مرحلے اتنی تیزی سے طے ہو جائیں گے، اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

تھوڑی دیر دونوں اِدھر اُدھر کی بامعنی اور بے معنی باتیں کرتے رہے۔ جب وہ واپس ہال میں آئے تو زونی لپک کر اُن کی طرف آئی "بڑا اچھا ۔؟"

شہنہ تو گھبرا گئی۔ عامر ہنس کر بولا "بہت بہت شکریہ"

"کس بات کا؟" وہ حیرانگی سے بولی۔

عامر، شہنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولا "اتنی خوبصورت دوست پال رکھی تھی، میرے۔"

زونی اس کی بات کاٹتے ہوئے ہنس کر بولی "لٹو ہو گئے۔"

"بالکل ۔۔"

شہنہ آگے بڑھ گئی۔ زونی اور عامر باتیں کرتے دوسری طرف چلے گئے۔

"میں کالج آ جاؤں تمہیں لینے ۔۔"

"ہائے نہیں ۔۔"

"کیوں۔ ملنا پسند نہیں؟"

"یہ بات نہیں عامر"

"تو پھر ۔۔؟"

"بُری بات ہے۔ میں کالج سے ہمیشہ سیدھی گھر جاتی ہوں۔ میری امی میرا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔ کبھی دیر ہو جائے تو پریشان ہو جاتی ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

عامر نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ شہنہ کو اس پر ترس آ گیا لیکن بے ساختگی سے ہنس پڑی۔ انی اور مونی کی دعوتیں ہو رہی تھیں۔ زونی، عامر کے اصرار پر دو تین دفعہ شہنہ کی امی سے اجازت لے کر اُسے دعوتوں میں لا چکی تھی۔ شہنہ بھی محبت کی ہوشربائیوں اور سحر خیزیوں میں گم تھی۔ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ سوتے جاگتے میں حسین خوابوں کے تانے بانے بُنتی رہتی تھی۔ عامر اس پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔

آج بھی وہ شہنہ کو لیے لان میں ٹہل رہا تھا۔ مہمان اندر ضیافت اڑا رہے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کے پیغام سُن رہے تھے۔ عامر پریشان تھا۔ اس لیے آئندہ ملنے کی راہیں نکالنا چاہتا تھا ۔۔ ایک راہ یہ بھی تھی کہ وہ کسی دن شہنہ کو لینے کالج پہنچ جائے اور پھر کسی ریسٹوران یا آبادی سے دور شہنہ کو لے جا کر دل کی باتیں کہے اور سُنے، لیکن شہنہ اس بات پر رضامند نہ تھی۔

"میں تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتا شہنہ" اس نے عاجزی سے کہا۔

وہ ہولے سے بولی "میں جانتی ہوں"

"پھر بھی ملنے سے گریزاں ہو"

"نہیں عامر۔ کالج سے آپ کے ساتھ ایک دن بھی جانا ممکن نہیں ہے"

"پھر ۔۔۔ پھر کوئی طریقہ سوچو"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا"

"یہ دعوتیں ہمیشہ تو نہیں چلیں گی۔ پرسوں انی اور مونی ہنی مون پر جارہے ہیں"

"ہاں"

"تو پھر یہ بہانہ بھی نہیں چلے گا تمہارا امی کے سامنے ۔۔۔"

"ہوں ۔۔۔"

"کچھ بتاؤ نا ۔۔۔ کیا کروں گا میں ۔۔۔ مر جاؤں گا تڑپ تڑپ کر"

"اللہ نہ کرے" عامر نے اتنے جذباتی انداز میں کہا کہ شہنہ نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

عامر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا "اب یہ ہاتھ میرے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹے گا ۔۔۔ میں تم سے جلد ہی شادی کر لوں گا ۔۔۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا نا ۔۔۔" اس نے اتنی بڑی بات اتنی اچانک اور ایسے غیر متوقع طور پر کہی کہ شہنہ بوکھلا سی گئی۔

"بولو نا ۔۔۔ اعتراض تو نہیں تمہیں" اس نے شہنہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا ۔۔۔ جب دوسری بار اس نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا تو اس نے ہولے سے کہا۔

"عامر میں تمہاری ہوں ۔۔۔ ہمیشہ تمہاری رہوں گی"

کھانے کی میز پر سے سب اٹھ کر جا چکے تھے۔ صرف انی، مونی اور زونی بیٹھے تھے۔ زونی، عامر کا پروپوزل سن چکی تھی۔ وہ شہنہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ انی اس کی مخالفت کر رہا تھا۔

"زونی، تم کس کی باتوں میں آگئی۔ وہ میرا دوست ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کی باتوں پر کبھی یقین نہ کرنا۔ فلرٹ کرتا ہے۔ کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اپنی دوست کو بچالو ۔۔۔ وہ ۔۔۔"

"اللہ بھائی جان آپ اچھے دوست ہیں، وہ خواہش کر رہا ہے اور ۔۔۔ آپ" مونی بولی "بھئی انی کا دوست ہے۔ اسی لیے تو مخالفت کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ اس قابل نہیں ہوگا"

"قابل کی بات نہیں" انی بولا "وہ بہت امیر والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی ممی اپنی بھتیجی سے اس کا رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔ وہ لڑکی بھی میں نے دیکھی ہوئی ہے۔ بہت بڑے خاندان کی ہے، اسمارٹ ماڈرن ہر لحاظ سے موزوں ۔۔۔"

"وہاں کیوں نہیں کرتا"

"بس دل پھینک واقع ہوا ہے۔ کچھ عرصہ اسے بھی لیے لیے گھومتا تھا"

مونی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ زونی بھی کچھ پریشان ہوئی۔

انی بولا "اس کی پسند تو ہر مہینے بدلتی ہے پچھلے دنوں جس لڑکی کے لیے اس کا دم نکل رہا تھا۔ وہ اس کی جان کو روتی پھرتی ہے۔ کوئی ایک رومانس ہے اس کا۔"

"لیکن زونی نے قدرے سنبھل کر کہا "یہاں صرف رومانس کی بات تو نہیں رہی نا، وہ شادی کرنا چاہتا ہے"

انی ہولے سے مسکرایا، پھر ٹوتھ پک اٹھاتے ہوئے بولا "ہونہہ شادی"

"سچی ۔۔۔ شادی ہی کے لیے تو کہا ہے اس نے"

"ماں باپ کی رضامندی کے بغیر کرلے گا؟"

"یہی کہہ رہا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تب بھی کرلے گا۔"

انی ہنسا۔ پھر بولا "ماں باپ سے کہنے کی جرأت ہی نہیں ہوگی اسے زونی صاحبہ، بہت ڈرتا ہے ڈیڈی سے ـــــ وہ تو اس کے ڈیڈی بھی ممی کی بھتیجی سے شادی نہیں کرنا چاہتے اس کی۔ ورنہ کیا مجال جو یہ ان کے سامنے نہ کرسکے۔"

زونی چپ ہوگئی۔

لیکن اگلے روز عامر، مونی کے پاس آیا۔ منت سماجت کی اور شہنہ سے شادی کے سلسلے میں اُس کی مدد چاہی۔

"بھئی اپنے ممی ڈیڈی سے بات کرو۔ راضی کرلو انھیں۔" مونی نے کہا۔

"وہ کب مانیں گے۔ شہنہ جیسی مڈل کلاس کی لڑکی کے متعلق تو وہ سننا بھی گوارا نہ کریں گے۔"

"تو پھر ـــــ"

"میں اپنی ذمہ داری جانتا ہوں۔ میرے وسائل نہیں۔ میں شہنہ سے شادی کرکے اس کا بار اُٹھا سکتا ہوں ـــــ کس چیز کی کمی ہے۔" وہ بولے چلا گیا۔

"بھئی میں کیا کرسکتی ہوں۔" اس کی لمبی چوڑی تقریر سننے کے بعد مونی بولی۔

"آپ میری شادی کروادیں۔ شہنہ کی امّی سے کہیں۔ انھیں رضامند کریں میں اُن کی ہر بات مانوں گا۔ ہر فرمائش پوری کروں گا۔"

"آپ تو واقعی سنجیدہ ہیں ـــــ"

"اتنا سنجیدہ کہ اگر یہاں شادی نہ ہوسکی تو شاید زندہ نہ رہ سکوں۔" وہ بڑے گھمبیر لہجے میں بولا۔

مونی سوچ میں پڑگئی۔

رات اُس نے انی سے بات کی۔ حسبِ معمول اس نے مخالفت کی۔ "وہ جذبات میں آیا ہوا ہے ـــــ عشق کا بھوت سوار ہے اس پر ـــــ وہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ اسے سمجھاؤ ـــــ کسی معصوم لڑکی کی تباہی کی ذمہ داری نہ لو اپنے سر۔ وہ خود بھی کبھی سنجیدہ نہیں ہوا۔ بہتیرے عشق کرچکا ہے۔"

"لیکن اب تو شادی کرنا چاہتا ہے۔" مونی متاثر تھی۔

"تو ماں باپ کو راضی کرے۔"

"وہ تو ہر طور نہیں ہوں گے۔ شہنہ عام سے گھر کی لڑکی ہے وہ اسے کیسے قبول کرسکتے ہیں۔"

"مونی وہ کروڑپتی باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ ـــــ اچھی لڑکی ہے شہنہ ـــــ دولت کی کمی نہیں۔ لڑکی کو قبول کریں گے۔ شادی ہوجائے تو میرا خیال ہے وہ بھی ہتھیار ڈال دیں گے۔"

انی اور مونی دیر تک بحث کرتے رہے۔ مونی بھی زونی کی ہم خیال ہوگئی۔ شہنہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ دولت ہی نہیں تھی نا اس کے پاس ـــــ اور کیا کمی تھی ـــــ وہ سوچتی کیوں نہ شہنہ کا رشتہ اس جگہ ہوجائے۔

مونی اور زونی، انی کی مخالفت کے باوجود عامر کے اصرار پر شہنہ کی امی کے ہاں رشتہ لے گئیں۔ امّی کی تو باچھیں کھل گئیں۔ ایسے رشتے کا تو انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھولی نہیں سمائیں۔ بس نہیں چلا کہ بات ان کے منہ سے نکلتے ہی شہنہ کو دُلھن بنا کر اُن کے حوالے کردیتیں، لیکن جب پتا چلا کہ لڑکا اپنی من مانی کررہا ہے۔ والدین کی رضا اور مرضی کے بغیر شادی کرنا چاہتا ہے تو ان کے شوق اور خوشی پر جمود سا طاری ہوگیا۔ سمجھ بھی گئیں اور اس رشتے کے پس پردہ جو محرکات ہوسکتے تھے وہ بھی بوند

بوند پانی کی طرح ذہن کی حساس سطح پر گرنے لگے۔ رومانوی داستانیں حسین تو ہوتی ہیں لیکن حقیقت سے جب ٹکرائیں تو چُور چُور ہو جاتی ہیں۔ اذیّت کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں۔ ساری مسرتیں اور راحتیں گم ہو جاتی ہیں اور صرف کرب و اذیت مقدّر بن جاتا ہے۔ جہاندیدہ عورت تھیں، بہت کچھ سمجھ گئیں۔ لیکن بچّی نادانی میں اگر چاند کی تمنا کر بیٹھی تھی۔ تو اُسے سمجھانا اُن کا فرض تھا۔ انہوں نے دونوں بہنوں کو شائستگی سے کہہ دیا۔" ہم غریب لوگ ہیں۔ ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں، خاص کر اس صورت میں کہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف لڑکا اپنی من مانی کر رہا ہو۔ اکلوتا بچہ والدین سے ہمیشہ کے لیے ناتہ نہیں توڑ سکتا اور جس لڑکی سے وہ اپنی مرضی سے رشتہ جوڑ لینا چاہتا ہے اس کے ماں باپ کبھی قبول نہیں کر سکتے ـــ اس لیے معذرت چاہوں گی۔"

دونوں بہنیں بددل تو ہوئیں لیکن دونوں ہی چاہتی تھیں کہ شہنہ بھی طبقاتی لحاظ سے کسی نہ کسی طرح ان کے ہم پلّہ ہو جائے ـــ اس دن تو ناکام واپس چلی آئیں لیکن اگلے دن پھر وہاں جا پہنچیں۔ عامر نے بھی مجبور کیا تھا۔ خود بھی چاہتی تھیں۔

" آنٹی " مونی نے گھنٹہ بھر کی مغز پچی کے بعد کہا " عامر آپ کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہر کام کرے گا۔ اُسے والدین عاق بھی کر دیں تب بھی وہ لاکھوں کا مالک ہے۔ اس کے نام بہت کچھ ہے۔ یہ نہ بھی ہوتا تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہزاروں روپے ماہوار کما سکتا ہے۔ اگلے سال ٹریننگ کے لیے امریکہ جا رہا ہے۔ اس کی زندگی بن جائے گی اور پھر یہ بھی تو سوچیں ایک ہی بیٹا ہے۔ ماں باپ اُسے چھوڑ نہیں سکتے۔ ضد میں آ کر شادی سے روک سکتے ہیں لیکن جب شادی ہو جائے گی عامر کی رضا اور مرضی سے ـــ تو پھر کیا جواز ہو گا ان کے پاس ـــ ہار کر وہی عامر کو بلائیں گے اپنائیں گے اس کی دُلھن کو ـــ"

زونی بھی اپنے طور پر بہت کچھ کہتی رہی ـــ عامر بہت اُونچی فیملی کا چشم و چراغ تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا۔ جوانی دیوانی تھی ـــ لڑکیاں خود بھی تو اس خوبرو اور امیر و کبیر نوجوان کے پیچھے پڑی رہتی تھیں اور بڑی بات کہ اس نے فلرٹ بہت لڑکیوں سے کیا ہو گا۔ شادی کے لیے تو کسی سے تیار نہ ہوا تھا۔ اب اتنی سنجیدگی سے شادی کے لیے تیار تھا یہ معمولی بات نہ تھی۔

مونی اور زونی نے کئی پھیرے ڈالے۔ ہر دفعہ شہنہ کی امی کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ امی بے چاری کشمکش و پیچ میں تھیں۔ شہنہ کا رویہ بھی بہت کچھ سمجھا تا تھا۔ انکار کی صورت میں لڑکی کے ردّعمل میں بغاوت کا عنصر بھی شامل ہو سکتا تھا۔

وہ ابھی ہاں اور ناں کے مرحلے ہی میں تھیں کہ ایک دن عامر خود ہی اُن کے ہاں آ گیا۔ شہنہ ہی نے دروازہ کھولا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی فریادی انداز میں بولا۔
"شہنہ، امی کیوں دیر کر رہی ہیں۔ میری جان لینے کے دَرپے ہیں ـــ"

شہنہ جلدی سے اسے آنے کا راستہ دیتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی ـــ
"آج آ ہی گئے ہو تو خالی ہاتھ نہ لوٹنا۔"

" کون آیا ہے شہنہ ؟" صحن سے امی کی آواز آئی۔ عامر تیزی سے صحن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ کا بیٹا۔"

امی نے صحن میں آ جانے والے خوبرو اسمارٹ نوجوان کو سر تا پا دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ دل میں اُتر گیا۔ " کون ہو تم بیٹے ؟" انھوں نے آہستگی سے کہا۔

عامر آگے بڑھا، ان کے سامنے جھکتے ہوئے بولا ـــ " بیٹا بھی کہہ رہی ہیں اور پوچھ بھی رہی ہیں میں کون ہوں ؟"

امی کا ہاتھ آپوں آپ اس کے خوبصورت گھنے بالوں پر ٹک گیا سمجھ گئیں کہ یہ عامر ہی ہے۔ عامر شفقت بھرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا " میں عامر

ہوں امی۔"

امی نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا، لیکن عامر نے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ
پکڑے کہا "امی بیٹا کہا ہے تو بیٹا بن کے رہوں گا۔"

اس کی ضدی گزارش پر امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ڈیوڑھی اور
کے درمیانی دروازے میں کھڑی شہنہ نے یہ مسکراہٹ دیکھی تو من ہی من میں ہزاروں
چراغ جل اُٹھے۔ زندگی کی راہیں روشن ہوگئیں۔

امی، عامر کو لے کر بیٹھک میں چلی گئیں اور وہ چائے کا اہتمام کرنے لگی۔

زدنی اور مونی بنیادیں تو بنا چکی تھیں۔ عامر نے امی کا دامن اس وقت تک
چھوڑا، جب تک اپنے حسین ازدواجی رشتے کی عمارت ان بنیادوں پر نہ اُٹھالی۔

اسی شام وہ منگنی کی انگوٹھی لے آیا۔ ڈائمنڈ کی خوبصورت انگوٹھی اس نے شہ
کے ہاتھ میں خود ہی پہنادی۔ "شہنہ میں نے آج تک جو کچھ چاہا ہے پایا ہے۔ بغیر کسی
تردد بلا کسی محنت ــــ لیکن تمہیں پانے کے لیے مجھے اتنی پریشانی، تشویش اور انتظا
کرب اُٹھانا پڑا ـــ لیکن میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ آخر تمہیں پا ہی لیا۔"

شہنہ تو کیف و سرور کے عالم میں اپنے آپ ہی میں نہ تھی۔ اتنی بڑی خوشی چھپا
جانا بھی تو آسان نہیں ہوتا نا ـــ

شادی کی تاریخ بھی عامر نے خود ہی مقرر کرلی۔ امی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ
صرف یہی کہہ سکیں "کچھ وقت تو دیتے ـــ تھوڑی بہت تیاری تو کرنا ہی ہوتا
ہے۔"

"کسی تیاری کی ضرورت نہیں امی۔ میں آپ پر آج سے شہنہ کا کوئی بوجھ نہیں ڈالنا
چاہتا ـــ شہنہ آپ نے مجھے سونپ دی۔ اب اُن کی ہر ضرورت میری ذمہ داری ہے۔"

"نادان۔" امی پیار سے مسکرائیں۔

امی نے اس رشتے کی بات بھائی بھابیوں سے کی تو سب حیران رہ گئے امی کی عقل
بڑے بھائی نے تو برملا کہا "یہ سخت حماقت کی ہے۔"

بھابیوں نے بھی کہا "ماں باپ شامل نہیں اور شادی رچا رہا ہے لڑکا۔ کل کلاں
ئی بات ہوگئی تو کس کو پکڑو گے۔ ماں باپ کی ذمہ داری تو نہیں ہوگی۔"

سب نے کچھ نہ کچھ کہا۔ امی کو بُرا بھی لگا کہ خوشی کے موقع پر فال بد منہ سے نکال
ی ہیں۔ پھر بیٹی کے نصیبے پر اتراتے ہوئے سوچا "سب جلتے ہیں میری بیٹی کے مقدر سے۔"

امی کو اب کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ اپنے طور پر تیاری میں لگ گئیں۔ چند جوڑے
ڑے خرید کر رکھے ہوئے تھے۔ ایک آدھ سونے کی چیز بھی تھی۔ دل تو چاہتا بیٹی کو
بت اور سونے میں جڑ کر رخصت کریں، لیکن مجبوری تھی۔ پھر بھی جو کچھ پاس تھا، بنانے
وارنے میں جٹ گئیں۔

عامر نے تو ہر چیز شہنہ کی پسند کی بنوائی۔ وہ روز شہنہ اور زدنی کو ساتھ لے
تا۔ کپڑے، جوتے، کاسمیٹک، زیور، جو شے بھی شہنہ کو اچھی لگی، اس نے فوراً خرید لی۔

تقریب شادی ہوٹل ہی میں ہوئی۔ سارا خرچہ خود عامر نے برداشت کیا۔ شہنہ
بصورت عروسی لباس اور جگمگاتے زیورات سے سج کر عامر کے پہلو میں آ بیٹھی۔

دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہوش میں مدہوشی اور مدہوشی میں ہوش
لی بات تھی ـــ دونوں کو شاید لاشعوری طور پر ڈر تھا کہ مل نہ پائیں گے۔ اس لیے
ب مل گئے ـــ تو سُدھ بدھ ہی نہ رہی۔

شہنہ خوش تھی۔

عامر خوش تھا۔

ان دونوں کو خوش دیکھ کر امی خوش تھیں۔

چند دن ہوٹل میں گزارنے کے بعد دونوں ہنی مون کے لیے چلے گئے۔ مری، کاغان،

سوات اور کالام تک گھوم آئے۔ شہنہ، امّی اور زونی کے لیے خوبصورت اور قیمتی
لے کر آئی۔

عامر ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہائش پذیر تھا یہاں جو رہل بن رہی تھی اس کا
کے لیے ڈیڈی نے یہاں بھیجا ہوا تھا ___ یہاں بیرے، خانساماں کے علاوہ ایک
نوکر اور بھی تھے ___ ہنی مون سے واپسی پر وہ شہنہ کو اس گھر میں لے آیا۔

یہ گھر شہنہ کی چھوٹی سی جنت تھی۔ دو بیڈ روم کا یہ گھر معمولی طور پر آراستہ تھا
عامر نے اس سے کہا" یہ گھر چھوٹا ہے۔ ہم عنقریب بڑی کوٹھی میں شفٹ ہو جائیں گے
اسے تم اپنی مرضی سے سجانا۔ صرف ڈیڈی سے اجازت ملنے کی دیر ہے۔"

شہنہ سرشاری کے عالم میں بولی" عامر یہ گھر ہی کافی ہے۔ یہ جنت ہے میری۔
تم جب بھی ڈیڈی سے اجازت لینے کی بات کرتے ہو میرا دل دہل جاتا ہے۔"

"کیوں ___؟"

"کیا خبر ___ انھیں تمھاری من مانی کرنے پر اتنا غصّہ آئے کہ مجھے ہی دھتکار دیں"

"تمہیں کہا ہے نا ایسی باتیں نہ تو کیا کرو۔ نہ سوچا کرو۔ میرے ہوتے ہوئے تم
کسی ڈر یا خوف کو دل میں جگہ دی تو یہ میری سچائی اور محبت سے منہ موڑنے کے
مترادف ہوگا۔"

"نہیں عامر" وہ اس کے سینے سے لگ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی" مجھے
تمہارے خلوص اور پیار پر پورا یقین ہے۔"

"یہ یقین متزلزل نہیں کرنا۔ میں ڈیڈی اور ممی کو بہت جلد راضی کر لوں گا۔ وہ
تمہیں قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ میں اور تم اب ایک ہیں دو نہیں۔
مجھے قبول کرنا ہے تو تمہیں بھی قبول کرنا پڑے گا انھیں ___"

شادی کی اُڑتی اُڑتی خبر عامر کے ڈیڈی ملک سیف اللہ تک بھی پہنچی۔ پہلے تو یقین
نہیں آیا لیکن خبر مستند تھی۔ لیکن بغاوت برداشت کون کرتا؟ آپے سے باہر ہو گئے۔
غصّے سے منہ میں جو آئی بکتے چلے گئے۔

"سن لو" گھر پہنچتے ہی وہ بیوی کو دیکھ کر چلّائے۔

"کیا ہوا؟" عامر کی ممی کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ہاتھوں پر
لوشن ملتے ہوئے بے توجہی سے متوجہ ہوئی۔

"صاحب زادے نے شادی کر لی ہے ___" انھوں نے بم پھینکا۔

"کیا؟ ___" ممی کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا۔

"کسی عام سے گھر کی گری پڑی لڑکی کو بیاہ لایا ہے۔"

"نہیں ___ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہو گیا ہے۔"

"میں نہیں مانتی ___ عامر ایسی لڑکیوں سے دوستی کر سکتا ہے شادی نہیں۔"

"تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا ___ وہ شادی کر چکا ہے۔"

ممی نے خوف زدہ ہو کر ڈیڈی کو دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔ ڈیڈی نے جلدی
سے بازو کے سہارے اسے تھام کر اس کے شاندار بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہونے
لگی تھی۔ انھوں نے نوکر کو آواز دی۔ پانی لانے کو کہا۔ وہ تین لڑکے دوڑے، کوئی
پانی لے آیا کوئی دودھ۔ خبر تھی ہی ایسی۔ ان سے برداشت نہ ہو سکی۔ ڈیڈی دل گردے
والے تھے۔ خبر کا اثر تو لیا لیکن اس طرح نہیں۔ انھیں تو بس عامر پر غصّہ آئے جا رہا
تھا۔ بے نقط سنا رہے تھے۔ اس لڑکی کو جو عامر کی رفیقۂ حیات بن گئی بے طرح کوس
رہے تھے۔

کئی دن گھر میں ہنگامہ رہا۔ ملک سیف اللہ غصّے سے پھنکارتے رہے اور ممی دکھ

سے کراہتی رہی۔ انہونی ہو گئی تھی۔ اپنے سے کم تر گھرانے کی لڑکی کو قبول کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ہنگامی اور جذباتی دور چند دنوں میں کچھ ٹھنڈا پڑا تو دونوں نے حالات کا جائزہ لیا۔

"اب کیا کرنا چاہیے" دونوں ایک دوسرے سے یہی پوچھتے تھے۔

"میں اس شادی کو سرے سے مانتا ہی نہیں" ملک سیف اللہ نے فیصلہ دے دیا۔

"بالکل" ممی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

پھر اس دن ملک سیف اللہ نے سنجیدگی سے کہا" عامر کو یہاں بلاتے ہیں"

"وہ آئے گا؟" ممی نے پریشانی سے کہا۔

"نہیں آئے گا تو میں اسے عاق کر دوں گا"

"اکڑ جائے گا۔ ذرا ہوشیاری سے کام لیں۔ اسے یونہی بلا بھیجیں۔ یہ ظاہر ہی نہ کریں کہ ہمیں اس کی شادی کا پتا چل گیا ہے۔ ایک بار یہاں آگیا تو پھر جا نہیں پائے گا واپس"

"بیوی کو بھی ساتھ اُٹھا لایا تو؟"

"اس گھر میں وہ قدم نہیں رکھ سکتی"

"کیا کرو گی؟"

"طلاق دلواؤں گی ــــ اسے کسی طور قبول نہیں کیا جا سکتا ــــ"

دونوں اس لڑکی سے پیچھا چھڑانے اور بیٹے کو ہاتھ میں لینے کے منصوبے بنانے لگے۔ پھر انہی دنوں امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں عامر کے داخلے کی اطلاع آگئی وہ چھ ماہ کا کورس کرنے وہاں جانا چاہتا تھا۔ تین چار جگہ اپلائے کیا ہوا تھا۔ ایک جگہ سے داخلے کی اطلاع مل گئی۔

عامر کو داخلے کی اطلاع دے دی گئی۔

شہنہ ابھی اپنے پیارے سے گھر کی فردوسی رعنائیوں سے پوری طرح ہمکنار بھی نہ ہوئی تھی کہ عامر کا بلاوا آگیا۔ وہ بیحد پریشان ہوئی "میں تمہیں نہیں جانے دوں گی"

"پگلی" عامر نے اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر کہا" ٹریننگ کے لیے میں امریکہ جا رہا ہوں۔ اتنی مشکلوں سے داخلہ ملا ہے۔ یہ موقع کھونا حماقت ہے۔ چھ مہینے کی تو بات ہے۔ لوٹ آؤں گا ــــ تمہارے پاس"

"نہیں عامر نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو" وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"ڈیڈی کو میری شادی کا شاید پتا نہیں چلا۔ اسی لیے بلوا رہے ہیں مجھے۔ پتہ چل گیا ہوتا تو سیدھا عاق کر دیتے مجھے ــــ" اس نے شہنہ کا کندھا تھپتھپایا۔

"تم اپنے ڈیڈی سے کہہ کیوں نہیں دیتے۔ چھپاتے کیوں ہو؟ اب تو ہم شادی کے مقدس بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ وہ کیا کر لیں گے؟"

عامر نے اُسے دیکھا اور ہولے سے بولا" وہ کیا نہیں کر سکتے۔ بندھن تڑوا دینا اُن کے لیے مشکل تو نہیں"

"عامر" شہنہ کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ حواس باختہ سی ہو کر اس نے عامر کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا۔

وہ چپ رہا۔

"عامر۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ــــ کیا کہہ دیا ہے۔ تم تم ــــ اُن کے کہنے پر مجھے چھوڑ......"

"نہیں بھئی ——— میں نے تو ویسے ہی بات کی ہے ——— ڈیڈی بہت جابر قسم کے آدمی ہیں، اور مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے ——— ان کے سامنے میں بول نہیں سکتا، تم نہیں جانتیں وہ کس طرح اپنی بات منواتے ہیں۔"

شہنہ چپ کی چپ رہ گئی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ عامر ایسی بات کہے گا۔ ابھی تو شادی کو پورا مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ابھی ننھی مُنّی خوشیاں بھی پوری طرح چن نہ پائی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

دوسرے دن عامر مِل کے متعلق مینجر کو پوری ہدایات دینے کے بعد گھر آیا۔ شہنہ اداس و پریشان بیٹھی تھی ——— عامر نے جیسے نوٹس ہی نہ لیا۔ بولا ——— "کل میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟"

"ڈیڈی نے بلایا ہے۔ جانے کی تیاری کرنا ہے۔ مجھے اگلے ہفتے امریکہ پہنچنا ہے۔ ڈیڈی نے ساری تیاری کرلی ہے۔"

"اور میں ———"

"تم ——— تم اکیلی رہ سکتی ہو؟"

"اکیلی؟"

"امّی کے ہاں چلی جانا۔"

وہ چند لمحے عامر کو تکتی رہی پھر مستحکم لہجے میں بولی "میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"کہاں؟" عامر جلدی سے بولا۔

"تمہارے ممی ڈیڈی کے پاس ——— میں وہاں رہوں گی۔"

"لیکن ——— لیکن شہنہ۔"

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ اور اس گھر میں جانے کا مجھے

پورا حق ہے۔ میں ان سے اپنا آپ منواؤں گی۔"

"یہ ——— یہ حماقت ——— نہ کرنا شہنہ ——— صرف چھ ماہ کی بات ہے۔ تم اپنی امّی کے پاس رہ کر میرا انتظار کرنا ——— میں واپس تمہارے پاس ہی آؤں گا پھر کوئی کوشش کریں گے ——— ابھی وقت نہیں ——— تم میرے ممی ڈیڈی کو نہیں جانتیں۔ دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گے۔"

شہنہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ عامر نے اُسے بازو کی لپیٹ میں لے کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے ——— اسے تسلیاں دیں، بہلاوے دیئے ——— اسے مجبور کیا کہ اُس کی واپسی تک وہ اپنی امّی کے پاس رہے۔

وہ رو دھو کر چپ ہو گئی۔

عامر نے اُسے کچھ رقم دی جو چھ ماہ کے لیے کافی تھی۔ اب اُسے چھ ماہ گزارنا تھے۔ چاہے کرب و اذیت میں گزرتے چاہے ہنسی خوشی

ممی گرجی برسی نہ ڈیڈی نے کچھ کہا۔ دونوں نے اس کا خیر مقدم خوش دلی سے کیا۔ عامر سمجھا کہ اس کی شادی کا انھیں پتا ہی نہیں چلا ——— اس کے اعصاب پر جو بوجھ مسلط تھا وہ کسی حد تک کم ہو گیا ——— وقت کم تھا۔ کام زیادہ، اس لیے پانچ سات دن دوڑ دھوپ ہی میں لگا رہا ——— اتنی فرصت نہ ملی کہ خیر خبر کی اطلاع شہنہ ہی کو دیتا۔ اطلاع دینا وہ کچھ ضروری بھی نہ سمجھ رہا تھا۔ اپنے گھر اور ماحول میں آکر وہ کسی حد تک بدل گیا تھا۔ لڑکیاں اس کی زندگی میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ آنے والیوں کا خیر مقدم وہ بڑے تپاک اور پُرجوش انداز میں کیا کرتا تھا۔ لیکن جانے والیوں کے لیے اس کے دل نے کبھی کوئی جذبہ، کوئی افسوس اور پچھتاوہ محسوس نہیں کیا تھا۔ شہنہ بھی کچھ انہی کی طرح زندگی میں آئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے آنے کا طریقہ جدا تھا۔ ہوسکتا

ہے، جانے کا طرز بھی الگ ہو ــــ لیکن بات یہ تھی کہ اب اس کا دل شہنہ میں وہ کشش اور جاذبیت قطعاً نہیں پا رہا تھا۔ ممی ڈیڈی پر کچھ زیادہ ہی فریفتہ ہو رہا تھا ــــ انھوں نے بھی تو کچھ پوچھا نہیں تھا جس صبح روانگی تھی۔ اس رات ممی ڈیڈی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ممی اصلی موضوع کی طرف آگئی۔ اس کی شادی کی بات کی تو وہ حیرت سے اُچھل پڑا۔

"تم جو حماقت کر چکے ہو، اس کے اثرات کیا ہوں گے، یہ نہیں جانتے۔ میں اس وقت کسی تفصیل میں نہیں جانا چاہتی۔ نہ ہی تم سے کوئی صفائی پیش کرنے کی بات کروں گی۔ تم چھ سات ماہ کے لیے باہر جا رہے ہو۔ اس لڑکی سے۔ جو تمھاری زندگی میں در آئی ہے ــــ تمھیں چھٹکارہ حاصل کرنا ہو گا۔"

"اُسے طلاق دو گے؟" ڈیڈی نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں دباؤ ڈالتے ہوئے کہا "چاہے وہاں سے بھیجو۔ چاہے یہاں آکر دو۔ بہر طور اس لڑکی کو طلاق دینا ہے تمھیں۔"

ایک لمحے کو تو عامر کا دل بھی بیٹھ گیا۔ شہنہ کی صورت نگاہوں میں گھوم گئی ــــ اُسے کس جُرم کی اتنی کڑی سزا دے گا وہ ــــ

لیکن اُس کی سوچوں پر تو ممی ڈیڈی کی گرفت تھی ــــ

ممی بولی "تم میری بھتیجی سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہو نہ سہی۔ میں تمھاری واپس تک اس سے بھی اچھی لڑکی تمھارے لیے تلاش کر کے رکھوں گی ــــ چھ ماہ بعد جب تم یہاں آؤ گے تو تمھاری شادی ہو گی۔ اسی شان اور ٹھاٹھ سے جس کے تم حقدار ہو۔ سمجھے؟"

ممی نے فیصلہ کیا ڈیڈی نے توثیق کی۔ عامر کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُسے امریکہ جانا تھا ــــ وہ اس وقت کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈیڈی کو اچھی طرح

جانتا تھا۔ اختلاف کی صورت میں وہ تو اُسے پلین سے بھی اتروا سکتے تھے۔

اس نے سر جُھکا دیا۔ ممی اور ڈیڈی نے اُسے باغی کی شکست سمجھا۔ دونوں اپنی کامیابی پر اترانے لگے

تین ماہ میں عامر کے صرف دو خط شہنہ کو ملے۔ پہلا خط اس نے امریکہ پہنچتے ہی لکھا تھا ــــ سیدھا سادا سپاٹ سا خط ــــ اس میں نہ تو محبت کی مہک تھی، نہ ذمے داری کا احساس ــــ شہنہ کا دل بجھ سا گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر جواب لکھا تھا۔ الفاظ میں اپنی ساری بے قراریاں بے تابیاں اور اداس تنہائیوں کا کرب سمو دیا تھا۔ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد تین چار خطوط کے جواب میں عامر کا تین چار سطروں والا خط ملا تھا جس میں اپنی مصروفیت ہی کا ذکر تھا۔

اس کے بعد کئی خط لکھنے کے باوجود عامر کا کوئی جواب اسے نہیں ملا تھا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ اس پریشانی میں اُس کی امّی بھی شریک تھیں۔ ماں بیٹی کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ ایک تو عامر کے یوں رفو چکر ہونے کا دُکھ تھا۔ دوسرے رشتہ داروں عزیزوں کی طنزیہ باتیں تھیں۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ غلطی شہنہ کی نہیں امّی کی ہے جس نے دولت کی چکاچوند دیکھی اور بِنا انجام سوچے بیٹی ایک غیر ذمے دار اور ماں باپ سے باغی شخص کے حوالے کر دی۔

"ایسی شادیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

"بہتیری عیش کر لی۔"

"زیور، نقدی تو دے ہی گیا ہے۔ یہی چاہیے تھا نا اُنھیں۔"

"ایسے بگڑے امیر زادے وقتی طور پر شوہر بن سکتے ہیں ہمیشہ کے لیے نہیں۔ امّی نے زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ یہ بات نہ سمجھ سکی۔ خود تباہ کیا ہے بیٹی کو۔ لالچ میں آکر۔

سوچا ہوگا خود بھی اس امیرزادے پر پڑ جاؤں گی، مستقبل اچھا ہو جائے گا لیکن کون بوجھ اٹھاتا ہے کسی کا۔ وہ بیٹی کو بھی چھوڑ بھاگا۔"

ماں بیٹی ایسے ایسے طنز سُنتیں اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں۔ کبھی کبھی تو امی سوچتیں۔ واقعی انھوں نے شہنہ کا ہاتھ عامر کے ہاتھ میں دے کر غلطی کی تھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بیٹی کو تسلیاں دیتیں تو اپنے صبر کے بند ٹوٹ جاتے۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند شہنہ کی بھی اڑ چکی تھی۔ رو رو کر بے حال ہو جاتی تھی لیکن پھر بھی جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ عامر کے آنے کی اُمید جینے کا حوصلہ دے رہی تھی، چھ سات ماہ بعد تو اس نے واپس آنا ہی تھا۔

لیکن پانچویں مہینے جو خط شہنہ کو ملا۔ اس نے اس کے حواس گم کر دیئے۔ اس نے لکھا تھا:

"میری واپسی کا انتظار نہ کرنا۔ میں واپس آیا بھی تو تمھارے پاس نہیں آسکوں گا — ممی ڈیڈی واپسی پر میری شادی اپنی پسند سے کر دیں گے۔ اس لیے"

شہنہ کی نگاہوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ امی بھی چکرا گئیں — وہ بھی تو عامر کی واپسی کی منتظر تھی۔

کئی لمحے شہنہ حواس باختہ سی رہی۔

پھر انھی گراں لمحوں نے اسے یکسر بدل دیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے آپ میں سے برآمد ہوئی ہے — نئی سوچ نئے عزم اور نئے ارادے کے ساتھ۔

"میں اپنے حق کے لیے لڑوں گی" — اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

امی روتے ہوئے بولی "سنگلاخ چٹانوں سے سر پھوڑنے کا کیا فائدہ — پہلے کیا کم ٹوٹی ہو جو اور —"

"تو آپ کا کیا خیال ہے امی — میں عامر کو چھوڑ دوں؟"

"عامر تمھیں چھوڑ چکا ہے۔"

"نہیں۔"

"یہ حقیقت ہے۔ غلطی ہماری تھی۔ اتنی اُونچی جگہ کمند پھینکی۔ منہ کے بل ہی گرنا تھا نا۔"

"اونچ نیچ کو میں نہیں جانتی — عامر نے مجھ سے شادی کی ہے۔ میں شادی کے تقدس کو پامال نہیں ہونے دوں گی۔"

"کیا کرو گی؟"

"میں کراچی جاؤں گی۔"

"کراچی؟"

"عامر کے ممی ڈیڈی کے پاس۔"

"جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس سے آنکھیں نہیں کھلیں —"

"وہ میرا گھر ہے — میرا سسرال ہے۔ میں وہاں جاؤں گی۔" وہ پختہ عزم سے بولی۔ امی اس کو جذباتی پن سمجھ کر چُپ ہو گئی۔ لیکن یہ جذباتی پن نہیں تھا۔ مستحکم ارادہ تھا۔ پہاڑوں اور سنگلاخ چٹانوں سے ٹکر لینے کا۔

حیرانگی کی بات تھی کہ عامر کی ممی جیسی عورت نے شہنہ کو قبول کر لیا۔ شہنہ نے اپنے حق کے لیے آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ زونی اور مونی سے بھی ملی تھی۔ عامر کے ممی ڈیڈی کے متعلق تھوڑی بہت معلومات ان سے حاصل کی تھیں۔ زونی کو اس کے یوں اُجڑنے کا بہت دُکھ تھا دل گرفتہ سی آواز میں بولی تھی۔

"شہنہ جب عامر ہی نے آنکھیں بدل لی ہیں تو تم اس کے ممی ڈیڈی کے پاس جا کر کیا کرو گی؟"

"اس نے آنکھیں نہیں بدلی زونی" شہنہ نے مستحکم لہجے میں کہا "میرا عامر ایسا نہیں ہو سکتا۔"

مونی نے دھیمے لہجے میں کہا "وہ ایسا ہی ہے شہنہ۔ امی نے تو اس شادی کی بڑی مخالفت کی تھی۔ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ فلرٹ کرنا اس کی ہابی ہے۔"

"مجھ سے اُس نے شادی کی ہے باجی ۔۔۔" شہنہ زور دے کر بولی۔

اس کی حالت کے پیش نظر زونی اور مونی نے کچھ زیادہ کہنا سننا مناسب نہ سمجھا شہنہ اُن سے مکمل پتا اور معلومات لے کر واپس آ گئی۔

اگلے دن وہ امی کی مخالفت کے باوجود کراچی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ بڑے ماموں بھی آ گئے۔ ممانی نے بھی باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن شہنہ کو تو پورا یقین تھا کہ کراچی جا کر وہ اپنی تقدیر بدل لے گی۔ ناکامی کا کوئی خوف اور وسوسہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

ماموں نے حالات کا رُخ دیکھا تو بولے "چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں ماموں" اس نے کہا "یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ میں خود نپٹوں گی۔"

امی نے کہا "ہرج کیا ہے۔ ماموں کو ساتھ لے جاؤ ۔۔۔ اکیلی ۔۔۔"

"میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ کسی غیر جگہ نہیں۔"

سب چپ ہو گئے۔ اس نے ماموں سے ٹکٹ منگوایا اور اگلے دن صبح کی فلائیٹ سے کراچی چلی گئی۔

ارادہ مضبوط ہو تو راہ میں حائل رکاوٹیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ عزم سے ٹکرانے کی ان میں جرأت ہی نہیں ہوتی ۔۔۔ شاید یہ بات سچ ہی تھی ۔۔۔ شہنہ پختہ

ا لیے اپنے سسرالی محل نما گھر میں داخل ہوئی تھی۔ بیرونی گیٹ کے ساتھ چھوٹے کمرے میں بیٹھا چوکیدار باہر نکل آیا۔

"کون ہیں آپ؟ کس سے ملنا ہے؟" اس نے پوچھا تو وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

"میں عامر صاحب کی بیگم ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ چوکیدار نے کے سراپا پر نگاہ ڈالی، پھر آہستگی سے بولا "میں بڑی بیگم صاحبہ کو مطلع کرتا ں آپ چل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔"

"مجھے سیدھا ان کے پاس لے چلو۔"

چوکیدار نے آگے بڑھ کر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے ساتھ لیے اندر نب چل دیا۔ شہنہ اس وقت اس عظیم الشان بلڈنگ سے مرعوب ہوئی۔ نہ اس کی سجاوٹ ے۔ وہ عامر کی ممی سے ملنے جا رہی تھی۔ ذہن میں صرف اور صرف اسی کا خیال تھا۔

ممی ایک نرم و گداز صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی

شہنہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کون؟" میگزین ایک طرف سرکاتے ہوئے ممی نے ویسے ہی لیٹنے کے انداز میں ٹے بیٹھے پوچھا۔

شہنہ ایک دم کچھ نہ کہہ سکی "میں ۔۔۔"

"آپ ۔۔۔"

"جی ۔۔۔"

دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو بے تکے انداز میں تکنے لگیں۔ پھر شہنہ نے جھکتے ہوئے انھیں بڑی تعظیم سے سلام کیا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے بھی اس نے تجسس سے شہنہ کو دیکھا۔

"آپ عامر کی ممی ہیں ۔۔۔؟" شہنہ ہولے سے بولی۔

"ہاں ——— کیوں؟" ممی اب بھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔ قدرے توقف کے بعد
جس نے اسے جھنجھوڑا ——— میگزین اس سے گر گیا۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے
ایکدم کہا "تم کون ہو؟"

"آپ کی بہو" شہنہ اور جھک گئی۔

"کیا کہا؟"

شہنہ اُن کے قریب صوفے کے کنارے پر خود ہی ٹک گئی۔ اسے اپنا مقام آپ ہی
بنانا تھا۔ پھر کیوں انتظار کرتی کہ ممی بیٹھنے کو کہیں۔

چند لمحے بڑے ہیجانی اور اضطرابی تھے۔ رُک جاتے تو قیامت آجاتی۔

لیکن لمحوں کی یہی صورت تو تسکین بخش تھی کہ انھیں رُکنا تھا نہ ٹھہرنا۔ بس گزرتے
چلے جانا تھا۔ سو یہ بھی گزر ہی گئے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اُن کا رُخ منفی سمت بھی ہو سکتا تھا لیکن نہیں ہوا رُخ
مثبت جانب ہی پھرا۔

ممی نے بازو بڑھائے اور شہنہ کو ان میں بھر کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

بات تھی تو حیرت ہی کی، لیکن شاید اک عورت نے عورت کا دکھ پہچان لیا تھا۔
اس وقت عامر کی امیر کبیر اور فیشن ایبل ممی کے بجائے سینے میں دردمند دل رکھنے والی
ماں بن کر سوچا تھا ——— جو کچھ بھی تھا، اُنھوں نے عامر کی بیوی کو اپنی بہو تسلیم کر لیا تھا
شہنہ اپنا نکاح نامہ بھی ساتھ لائی تھی۔ لیکن اُسے اپنا آپ تسلیم کروانے کی نوبت ہی
نہ آئی تھی۔

ممی نے اس وقت ملک صاحب کو فون کیا۔ فون پر یہی خوش خبری سنائی۔ وہ
بوکھلائے۔ لیکن اس نے بڑی محبت اور شفقت سے شہنہ کے متعلق اُنھیں مختصراً بتایا۔
وہ سارے کام چھوڑ کر اسی وقت گھر آ گئے۔

شہنہ ان کے دل میں بھی اتر گئی۔ انھوں نے اس کے سر پر بڑی محبت اور پیار سے
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ارے اُلّو ہے بالکل یہ عامر ——— اتنا اچھا انتخاب تھا۔ ہمیں بھی شامل
کر لیا اس خوشی میں تو کیا بات تھی؟"

"خوشی تو میں اب مناؤں گی" ممی نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

شہنہ اپنی کامیابی پر پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اسے ان سب لوگوں پر ہنسی آ رہی
تھی جو اسے تقدیر کے وار سہہ لینے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور
زور سے قہقہے لگائے، اتنے زور سے کہ لاہور بیٹھے لوگ اس کی آواز سن لیں ——— جان لیں
کہ تقدیر نے نہیں شہنہ نے تقدیر کا منہ توڑا ہے۔

"ہم عامر کو سرپرائز دیں گے"

"کیسا؟" ملک صاحب بولے۔

"اُسے کہا تھا نا کہ ہم اس کے آنے تک لڑکی کی تلاش کر لیں گے"

"ہاں ———"

"اسے خط لکھ دیتے ہیں۔ یاددہانی کروا دیتے ہیں کہ لڑکی ہم نے تلاش کر لی ہے۔
اُسے ہی شادی کرنا ہے۔ اُسے پتا نہ چلے کہ شہنہ ہی وہ لڑکی ہے"

"بات تو خوب ہے ——— لیکن ———"

"کیا؟"

"وہ آئے گا تو پتہ چل جائے گا اُسے"

"نہیں چلے گا"

"شہنہ یہیں ہوگی کیسے پتا نہیں چلے گا"

"شہنہ کو میں لاہور بھیج رہی ہوں"

"کب؟" ملک صاحب ایک دم سیدھے ہو بیٹھے ممی مسکرائی پھر بولی "میں نے سارا

پلان بنا لیا ہے۔"

ملک صاحب بے یقینی سے بولے "ارادے نیک ہی ہیں نا؟"

"بالکل ——— بالکل نیک ہیں۔ شہنہ کو میں نے دل و جان سے بہو ہی نہیں ب[illegible]
بھی بنا لیا ہے۔"

"شکر ہے۔" ملک صاحب صوفے میں پھیل سے گئے۔

پھر ممّی انھیں اپنا پلان بتانے لگیں۔ وہ مسکراتے ہوئے سنے جا رہے تھے۔ پلان
یوں تھا کہ ہم نے اس کے لیے ایک پیاری سی من موہنی سی لڑکی لاہور میں تلاش کی
ہے۔ اُسے لڑکی دکھانے لاہور لے جائیں گے۔ شہنہ کے لیے پہلے ہی ہوٹل میں کمرہ بک
کروا لیا جائے گا۔ وہ وہاں ہوگی۔ عامر سے کہیں گے فلاں کمرے میں لڑکی ہے جا کر
دیکھ لو۔

"پھر ———" ممّی جوشیلے انداز میں مسکرائیں ——— "پھر کیسا رہے گا۔"

"خوب ——— تم نے تو اچھی خاصی فلم کی کہانی بنا ڈالی۔"

"سرپرائز ——— یہی تو لطف کی بات ہوگی۔"

"شہنہ کو بتایا؟"

"بتایا بھی ہے سمجھایا بھی ہے ——— اور یہ بھی کہا ہے کہ اس بُدھو کے خوب
کان کھینچے۔ جس نے اُسے اتنی ذہنی اذیت دی ——— خبیث کہیں کا۔"

ملک صاحب سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مسکرائے گئے۔

اگلا ہفتہ ممّی نے شہنہ کے ساتھ شاپنگ کرتے گزارا۔ شہنہ کے لیے بیش قیمت
ڈریسز بننے دیے ——— زیورات کے کئی سیٹ خریدے۔ ڈائمنڈ کی کئی انگوٹھیاں لیں۔
لاکٹ اور آویزے لیے۔

کوٹھی کا اُوپر والا پورشن اس کے لیے نئے سرے سے ترتیب دیا۔ انٹیریئر ڈیکوریٹر

لایا۔ ساری سیٹنگ پھر سے کروائی۔ شہنہ کی پسند کو اوّلیت دیتے ہوئے سب کچھ
لایا۔

عامر کے آنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ پلان کے مطابق شہنہ واپس جانے
لیے تیار تھی۔

ممی نے سارا زیور اٹیچی کیس میں بند کر کے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا:
ساتھ لے جاؤ۔"

"نہیں ممّی ——— اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"عامر کے آنے پر دُلہن نہیں بنو گی۔" ممّی نے چھیڑا۔

وہ لجاتے ہوئے بولی۔ "آپ آئیں گی تو ساتھ لیتی آئیے گا۔ ڈریسز بھی اور زیور بھی۔"

"کچھ تو ساتھ لے جاؤ۔" ممّی نے کہا۔ پھر اٹیچی کیس کھولا اور اپنے ہاتھوں سے شہنہ
کی کلائیوں میں چوڑیاں، جڑاؤ کڑے اور انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں پہنا دیں۔ گلے
میں ڈائمنڈ کا لاکٹ ڈالا اور کانوں میں اسی کے ساتھ کے آویزے پہنا کر اس کی پیشانی
چوم کر کہا۔ "باقی سب زیور تمھاری امانت ہیں ——— میں ساتھ لیتی آؤں گی۔"

شہنہ کو ممی اور ملک صاحب ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے۔ بہت پیار کیا۔ ممّی بولی۔
"مجھ سے تو یہ آٹھ دن گزارنا مشکل ہوں گے۔"

"دو ہفتے ہی میں شہنہ کی اتنی عادی ہو گئیں تم۔" ملک صاحب مسکرائے۔

"آپ اپنی کہیے۔ جی چاہ رہا ہے شہنہ کو واپس بھیجنے کو؟"

"بالکل نہیں۔ تمہارے اس سرپرائز نے مجبور کیا ہے۔ ورنہ میں تو چاہتا ہی
نہیں کہ اب شہنہ واپس جائے۔" ملک صاحب نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

شہنہ ان کا پیار اور شفقتیں سمیٹتی دامن خوشیوں سے بھر کر پلین میں سوار ہو گئی۔

امی کو اس نے صورت حال سے مطلع تو کر دیا تھا۔ لیکن جب وہ خود گھر پہنچی تو
سے جیسے خوشیوں کا بار سنبھل نہ سکا۔ شہنہ کو گلے لگا کر بے اختیار ہو کر رو دیں تو خوشی
کے سوتے شہنہ کی آنکھوں سے بھی پھوٹ بہے۔

خوشی اور غم میں فاصلہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ آنسو خوشی میں بھی بہہ جاتے ہیں اور
غم میں بھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے خوشی اور غم کی حدیں سانجھی ہیں۔ جہاں خوشی
کی انتہا ہوتی ہے۔ وہاں سے غم کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

کچھ یہی بات شہنہ کے ساتھ بھی ہوئی۔

اس کی تقدیر کا یہ پلٹا اتنا خوش گوار تھا کہ جس نے سُنا پھولا نہ سمایا۔ زونی سُن کر
بھاگی آئی۔ شہنہ کو گلے سے لگا کر مبارک باد دی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی "اب تو ہم دونوں
پکی پکی سہیلیاں ہی نہیں رشتہ دار بھی بن گئی ہیں۔"

مونی بھی خوش ہوئی۔

ماموں اور ممانیاں بھی مبارک باد دینے آئے۔ ممانیوں کو تو حسد بھی محسوس ہوا
شہنہ کی کلائی کلائی بھر طلائی چوڑیاں اور چمکتے دمکتے ڈائمنڈ دیکھ کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر بولیں
"واہ بھئی نصیبہ ہو تو ایسا۔ ہم بھی اپنی بیٹیوں سے کہیں گے یوں پسند کے رشتے ڈھونڈیں"

شہنہ کی اپنی خوشیاں تھیں۔ کسی کے دکھ یا حسد کرنے سے اس کا کیا بگڑتا تھا۔ وہ
کسی کی پرواہ کب کرتی تھی۔ اپنے مقدر پر نازاں تھی۔ فخر کر رہی تھی اور یہ کہا جائے کہ مغرور
بھی ہو گئی تھی تو بے جا نہ تھا لیکن ——

خوشی اور غم کی حدیں شاید سانجھی ہوتی ہیں۔ خوشی کی انتہا غم کی دہلیز پر دم توڑتی
ہے۔ شہنہ ابھی خوشیاں اور غم سمیٹ بھی نہ پائی تھی کہ اسے ایک بھاری لفافہ بذریعہ
ڈاک ملا۔ اس نے لفافہ دیکھتے ہی عامر کی لکھائی پہچان لی رجسٹری کی سلپ پر دستخط
کرتے ہوئے وہ من ہی من میں مسکرا رہی تھی۔

"تم سے سمجھوں گی۔" اس نے زیرِ لب دہرایا۔

اور لفافہ لیے اندر آ گئی۔

"کیا ہے؟" امی نے باورچی خانے کے دروازے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

"عامر کا خط۔" اس نے لفافہ سینے سے لگاتے ہوئے ماں کو جواب دیا اور پھر
بےتابی سے کمرے میں چلی گئی۔

"دُکھ اور سُکھ کی کہانیاں لکھی ہوں گی۔" وہ لفافہ چاک کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ
دباتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اس نے لفافہ کھولا۔ کاغذات باہر نکالے۔

یہ دکھ سکھ کی کہانیاں ہی تھیں جو انجام کو پہنچ گئی تھیں

شہنہ کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ ہونٹ سپید پڑ گئے اور چند ثانیوں
کے لیے دل کی دھڑکنیں رُک گئیں۔

اس کے منہ سے اک چیخ سی نکلی۔

امی بھاگی آئیں۔

شہنہ پلنگ پر گری تھی اور اس کے ہاتھ میں طلاق نامے کے کاغذ تھے۔

عامر نے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی طلاق نامہ بھجوا دیا تھا۔

ایک حقیقت ایک کہانی

یقین اور بے یقینی بعض اوقات اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں کہ یقین سے کسی ایک کا سرا پکڑنا ممکن نہیں رہتا۔ یقین کرنا چاہیں تو بے یقینی اس کی نفی کر دیتی ہے اور بے یقین ہو جائیں تو یقین مستحکم ہونے لگتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ایسا ہوئے پورے ۴۰ سال گزر چکے ہیں۔ ان دنوں میری عمر سولہ سترہ برس تھی۔ اور میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ خاصا سمجھ دار تھا اور حالات و واقعات کو جانچنے پرکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میں اپنے چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اور اس بڑے ہونے کے ناتے چھوٹے بہن بھائیوں پر خوب رُعب تھا۔ اس رُعب کو نہ صرف بہن بھائیوں نے بلکہ امی ابا نے بھی تسلیم کر لیا ہوا تھا۔ اسی لیے دو منزلہ مکان کی بیٹھک کے ساتھ والا کمرہ میرے لیے مختص تھا۔ باقی پانچ بہن بھائی اُوپر والے دو کمروں میں امی ابا کے ساتھ ہوتے تھے۔ بیٹھک بھی زیادہ تر میرے ہی تصرف میں رہتی تھی۔ کبھی دوست آئے ہوتے اور کبھی ہمارا گھریلو ملازم جھانا میرے ساتھ وہاں بیٹھ کر گپ شپ لگاتا۔

بہن بھائیوں سے تو میں کچھ زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔ ہاں، جھانے سے میری خوب بے تکلفی اور دوستی تھی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ کام میں بہت تیز تھا۔ اس سلسلے میں اس نے امی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ صبح سے رات گئے تک کام میں کولھو کے بیل کی طرح جُتا رہتا ـــــ چھوٹے قد کا دُبلا پتلا جھانا مجھ سے عمر میں بڑا تھا۔ لیکن قد اور جسمانی ساخت ایسی تھی کہ عمر سے کئی برس کم ہی معلوم ہوتا تھا۔ چرب زبان بہت تھا۔ اور امی اس کی چرب زبانی ہی سے نالاں تھیں ـــــ اور وہ اسی وجہ سے کبھی کبھی امی سے ڈانٹ کھایا کرتا تھا۔ جب بہت ڈانٹ پڑتی تو وہ منہ بسورے میرے پاس چلا آتا۔

"کیا ہوا جھانے؟" میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی پوچھ لیتا۔

"ہونا کیا تھا۔ امی جی کو تو میں اچھا ہی نہیں لگتا ـــــ بلاوجہ ہی ڈانٹتی ہیں۔"

وہ میری امی کو امی ہی کہا کرتا تھا ـــــ بہت چھوٹا سا تھا جب ہمارے گھر میں ملازمت کے لیے آیا تھا۔

"ڈانٹ تو ہم سب کو پڑتی ہے جھانے ـــــ"

"آپ سب کو تو کسی وجہ سے پڑتی ہے۔ مجھے تو بلاوجہ ہی وہ ڈانٹتی رہتی ہیں۔"

"کیا ہوا ـــــ امی ہیں ـــــ"

"امی ہیں ـــــ اسی لیے تو میں بھی بُرا نہیں مانتا ـــــ"

منہ تو لٹکا لیتے ہو ـــــ"

"لو، اتنا بھی نہ کروں۔ تو وہ مجھے کبھی منائیں ہی نہیں۔"

"تو امی تمہیں ڈانٹنے کے بعد مناتی ہیں؟"

وہ باچھیں کھلا کر کہتا۔ اور نہیں تو کیا ـــــ منہ پھلائے پھرتا ہوں تو وہ خود ہی منا لیتی ہیں ـــــ"

"اسی لیے تم بہت سر چڑھ جاتے ہو ـــــ" میں کہتا تو وہ اپنی چھوٹی آنکھوں میں شوخی بھر کر مجھے دیکھتے ہوئے ہنس پڑتا۔

اس دن وہ بہت خوش ہوتا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ امی کے منانے سے اس کی پیار کی جبلّی خواہش پوری ہوتی۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ اور اس کی یادیں اس فطری پیار سے خالی تھیں۔ جو والدین کی طرف سے بچوں کا حق بن کر انھیں ملتا ہے۔ دوسرے

اس دن اسے فلم دیکھنے کی بھی اجازت ملتی تھی۔ وہ فلموں کا رسیا تھا۔ اِس کا بس چلتا تو گھر کی نوکری کے بجائے فلم کی خاطر سینما ہاؤس میں نوکری کر لیتا ـــــ اِس وقت ہمارے شہر میں صرف تین ہی سینما ہاؤس تھے۔ اور اسے ان تینوں سینما ہاؤسوں میں چلنے والی فلموں کے نام اور کہانیاں ازبر یاد ہوتیں، اداکاری کی پرکھ بھی اسے خاصی تھی اور اداکاروں پر اس حوالے سے تبصرہ بھی بڑی روانی سے کیا کرتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح تینوں سینما ہاؤسوں میں چلنے والی فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ ہمیں سینما دیکھنے کی کُھلی چھٹی نہیں تھی۔ کبھی کبھار کوئی اچھی فلم آتی تو آبا جی ہمیں دکھانے لے جاتے ـــــ ہاں، ہم جھلنے سے ہر فلم کی کہانی سُن لیتے تھے اور وہ کہانی اتنی باریک بینی سے سُناتا کہ لگتا ہم نے خود فلم دیکھ لی ہے۔

وہ بھی نچلی منزل کی پچھلی کوٹھڑی میں سوتا تھا۔ کام ختم کر کے جب وہ سونے کے لیے نیچے آتا تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ میرے پاس ضرور بیٹھتا ـــــ اِس عرصے میں وہ زمانے بھر کی باتیں کیا کرتا ـــــ میں اکثر کتاب رکھ کر بڑے شوق و تجسس سے اس کی باتیں سُنا کرتا ـــــ

کبھی میں اپنے کمرے ہی میں اسے بیٹھنے کو کہہ دیتا اور کبھی بیٹھک میں ہم دونوں جا بیٹھتے۔ وہ کسی دیکھی ہوئی فلم کی کہانی سنانا شروع کر دیتا۔ تو دو ڈھائی گھنٹے گزرتے پتا بھی نہ چلتا۔

وہ ہمیشہ فلم کا آخری شو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اسی لیے کہ دن بھر تو اسے کام کاج سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ اس کے لیے یہی وقت ہوتا تھا۔ نو بجے وہ سارے کام نپٹا کر فلم دیکھنے چلا جاتا اور رات بارہ ایک بجے واپس لوٹتا۔

میں چونکہ نیچے ہوتا تھا۔ اس لیے دروازہ کھولنے کی ذمّے داری میری ہوتی تھی۔ یہ ایک کڑی اور تکلیف دہ ذمے داری تھی۔ لیکن جھانا جتنی وفاداری سے ہمارے خاندان

کی خدمت کر رہا تھا۔ اس کی خوشی کی خاطر یہ ذمّے داری نبھانا ہی پڑتی تھی۔ اور یُوں بھی یہ ذمّے داری صرف سردیوں ہی میں اٹھانا پڑتی تھی۔ گرمیوں میں تو وہ مکان کے سامنے گلی میں سویا کرتا تھا۔ جانے سے پہلے چارپائی بستر باہر نکال کر برابر میں سونے والے مضو سے بستر کا دھیان رکھنے کا کہہ جایا کرتا تھا۔ بستر بھی کیا ہوتا ـــــ ایک پرانی دری اور تکیہ ـــــ محلے بھر سے اس کی دوستی تھی ـــــ اس لیے اس کا بستر کبھی کسی نے نہیں اُٹھایا ـــــ نہ ہی چارپائی چُرائی ـــــ ہلتے پایوں والی جھلنگا سی چارپائی کسی کو لے کر کرنا بھی کیا تھا۔

سردیوں میں البتہ دروازہ کھولنا بڑی کوفت دیتا تھا۔ کبھی تو میری آنکھ اس کے آنے سے پہلے ہی کُھل جاتی تھی ـــــ کبھی میں گلی میں اس کے قدموں کی آواز سے ہی جاگ جاتا۔ لیکن کبھی کبھی نیند اتنی گہری ہوتی کہ اس کے دروازہ پیٹنے پر بھی آنکھ نہ کُھلتی ـــــ اور اوپر والی منزل سے امی یا آبا کی آوازیں مجھے ہڑبڑا کر اُٹھنے پر مجبور کر دیتیں ـــــ اور بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا کہ ان کی آوازیں بھی میری غنودگی میں ڈوب جاتیں ـــــ اور آبا کو خود نیچے آ کر دروازہ کھولنا پڑتا۔

اس دن اسے آبا کی ڈانٹ ڈپٹ سُننا پڑتی۔

"میں تمہیں فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دوں گا ـــــ فلم دیکھنا ہی ہے تو باہر سویا کرو، مرو گے سردی میں تو تمہیں پتا چلے گا۔"

وہ اس دن مجھ سے ضرور اُلجھ پڑتا۔ "کیا گھوڑے بیچ کر سوتے ہو ـــــ دروازہ بھی نہیں کھول سکتے۔ میاں جی کو اس وقت نیچے آنا پڑا ـــــ یار، تم مرواؤ گے کسی دن مجھے ـــــ میاں جی نے فلم دیکھنا بند کروا دی تو یاد رکھنا، تم بھی نئی نئی کہانیاں سُن نہ پاؤ گے۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ آئندہ الارم لگا کر سویا کروں گا۔ تم اپنی بھڑک پوری کر لیا کرو۔"

"کہانی بھی تو تمہیں ہی سُناتا ہوں نا ـــــ"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم بے فکر رہو۔ تمہاری فلم بینی بند نہیں ہو گی۔"

"خوش رہو میرے یار۔ خوش رہو۔"

ہمارا مکان گلی کی نکڑ پر واقع تھا۔ گلی کشادہ تھی۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں برابر والی چھوٹی گلی میں کُھلتی تھیں۔ بھانا اکثر ان کھڑکیوں پر دستک دیا کرتا تھا۔ مَیں نے ہی اسے کہا تھا ——— چونکہ کھڑکیاں میرے بالکل سرہانے تھیں۔ اس لیے ہلکی سی دستک پر بھی آنکھ کُھل جاتی تھی۔ اس طرح ابا جی کے نیچے آکر دروازہ کھولنے والا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب مَیں ہی دروازہ کھولا کرتا تھا۔

اس رات بھی وہ فلم دیکھنے گیا تھا۔

"میرے آنے تک جاگتے رہنا ———" اس نے جانے سے پہلے کہا۔

"کیوں؟"

"بڑی لاجواب فلم ہے ——— کہانی سناؤں گا۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"یار مانی۔"

"کیا ہے؟"

"ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"فلم دیکھنے ——— بڑے غضب کی فلم ہے۔ اتنا رش لے رہی ہے کہ ———"

"تمہارا دماغ تو ٹھکانے ہے؟"

"کیوں ——— ؟"

"مَیں چلوں فلم دیکھنے؟ تمہارے ساتھ؟ ——— اس وقت؟"

"ہاں ———"

"کھال نہیں کھنچوانی ہے مجھے ———"

وہ رازداری سے بولا ——— "وہ سب لوگ تو سو جائیں گے۔ کسی کو کیا پتا چلے گا۔ باہر تالا لگا جاتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ میں امّی کو بتا دوں گا۔"

"نہیں جاتے تو نہ جاؤ ——— پکچر اچھی تھی۔ اس لیے کہہ دیا۔ معافی دے دو یار۔ آئندہ نہیں کہوں گا۔"

"جا چھٹ ——— ورنہ امّی سے کہہ کر اجازت کینسل کرا دوں گا ———" مَیں نے رُعب دیا۔ تو وہ ہاتھ جوڑتا بھاگ گیا۔

ان دنوں میرے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ میں رات دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ آج بھی میرا خیال تھا کہ بھانے کی واپسی تک میں جاگ رہا ہوں گا۔ لیکن رات بارہ بجتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سردی بھی اس دن بہت تھی۔ کمرہ انگیٹھی میں کوئلے جلنے سے خوب گرم تھا۔ مَیں جتنی دیر کرسی پر بیٹھ کر پڑھتا رہا۔ نیند آنکھوں سے دور رہی ——— لیکن جب گرم گرم بستر میں گُھسا تو نیند نے غلبہ پایا اور جاگنے کی کوشش میں بار بار پلکیں جھپکنے کے باوجود میں جلد ہی بے خبری کی نیند سو گیا۔ میرے لاشعور میں دروازہ کھولنے کی ذمّے داری کا احساس موجود تھا۔ شاید اس لیے میری آنکھ خود بخود کُھل گئی۔

مَیں نے گھڑی سرہانے سے نکال کر دیکھی ایک بجکر پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں

ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ــــ کیا جھانا آچکا تھا ــــ وہ اکثر ساڑھے بارہ پونے ایک بجے کے
درمیان واپس آجایا کرتا تھا۔ سینما ہاؤس ہمارے گھر سے میل سوا میل کے فاصلے پر تھا
اور جھانا اکثر پیدل مارچ کرتے ہی واپس آیا کرتا تھا۔ ایک بجے کے بعد تو وہ کبھی بھی
واپس نہیں آیا تھا۔ میں جلدی سے بستر سے نکلا ــــ شاید میری غفلت کی نیند تھی
جو دروازہ بجنے کی آواز نہ سُن پایا۔ یقیناً آج ابا جی نے دروازہ کھولا ہوگا۔ یا امی نیچے
آئی ہوں گی۔ جھانے کو آتے ہی جھاڑ پڑی ہو گی۔

مَیں بستر سے نکلا دروازہ کھول کر صحن میں آیا۔ پھر ڈیوڑھی کی بتی جلائی ــــ
بیرونی دروازے کی زنجیر چڑھی تھی ــــ یقیناً جھانا واپس آگیا تھا۔

میں نے واپس پلٹتے ہوئے جھانے کی کوٹھری طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ کھلا
تھا۔ اِتنی سردی میں وہ دروازہ کھُلا چھوڑ کر سو گیا؟ مَیں نے سوچا ــــ پھر دروازہ بند
کرنے کے لیے آگے بڑھا ــــ بتی جلائی، تو دیکھا جھانے کی چارپائی خالی تھی ــــ
اور اس کا لحاف ویسے ہی تہ کیا پڑا تھا ــــ

’تو کیا وہ ابھی واپس نہیں آیا ــــ؟

میں سوچتے ہوئے کمرے میں چلا آیا۔ اب میں قدرے تازہ دم تھا۔ اس لیے کرسی
پر ہی بیٹھ گیا، کمبل لپیٹ کر کتاب لی۔

’ہوسکتا ہے، فلم لمبی ہو ــــ اس لیے اس کے آنے میں دیر ہوئی ہو۔‘ یہ
سوچ کر میں اپنی کتاب پڑھنے لگا ــــ

آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔

اب دو بج چکے تھے، مجھے نیند پھر سے آنے لگی تھی۔

لیکن وہ ابھی واپس نہیں آیا تھا۔

جانے کیا بات تھی۔ مجھے فکر و تشویش ہونے لگی ــــ اتنی دیر تو اس نے کبھی
نہیں کی تھی۔

مَیں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اِس کا انتظار ضروری تھا۔

مَیں اسے دل ہی دل میں کوسنے لگا تھا۔ ایسی کی تیسی اس کی فلم بینی کے شوق
کی ــــ جانا بھی آخری شو دیکھنے ہے؛ مَیں نے دل میں سوچا کہ امی سے کہوں گا۔
اسے میٹنی یا شام کے شو دیکھنے کی اجازت دے دیا کریں۔ رات کو باہر جانا بالکل
بند کر دیں۔ رات کو دروازہ کھولنے کی ڈیوٹی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔‘‘

مَیں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اب میری آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔
جھانے پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔ ’’آج آلے ــــ‘‘ مَیں دانت پیستے ہوئے بڑبڑا رہا
تھا ــــ ’’بہت سر چڑھا رکھا ہے ہم لوگوں نے۔ سمجھوں گا آج اس سے ــــ بڑا آیا
فلم کا شوقین‘‘

جی چاہ رہا تھا، بستر میں پڑ جاؤں۔ اسے مطلقاً دروازہ نہ کھولوں، سردی میں باہر
ہی سڑتا مرتا رہے لیکن امی اور ابا جی کا خیال بھی آرہا تھا۔ میں نے دروازہ نہ کھولا
تو انھیں اُوپر سے اُٹھ کر آنا پڑے گا ــــ

مَیں جز بز ہو رہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو سوا دو بج چکے تھے۔ مَیں دل ہی دل میں جھانے
کو کوستے اور گالیاں بکتے بستر کی طرف بڑھا۔

لیکن

ابھی بستر میں گھُس بھی نہ پایا تھا کہ گلی میں کسی کے سرپٹ دوڑنے اور پھر دروازے
پر گرنے کی آواز آئی ــــ مَیں خوف زدہ سا ہوا ــــ اور بستر سے نکل کر ڈیوڑھی کی
طرف لپکا۔

’’مانی ــــ عثمان ــــ ما ــــ نی ــــ دروازہ ــــ کھو ــــ لو ــــ‘‘ یہ جھانے
کی آواز تھی ــــ چیختے ــــ ڈوبتے اُبھرتے اور انتہائی متوحش لہجے میں وہ مجھے پکارتے

ہوئے شاید بیہوش ہُوا جا رہا تھا۔

مَیں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

"جھانے ـــــ" مَیں نے جُھک کر اسے کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا۔

"مانی ـــــ" وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ تھر تھر کانپتے ہوئے مجھے اندر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بند ـــــ بند ـــــ بند ـــــ دروازہ"

مَیں نے اسے جلدی سے اسے اندر کیا اور دروازہ بند کر کے کُنڈی چڑھا دی۔

وہ بے حد متوحش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا ـــــ اور سر کے پچھلے حصّے سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیا ہُوا ـــــ تمہیں جھانے ـــــ" میں اسے اپنے کمرے میں لاتے ہوئے بولا "لڑائی کر آئے کسی سے ـــــ؟"

وہ دری پر گر گیا ـــــ ابھی تک اس کے حواس بجا نہیں تھے۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر پھر پوچھا "کسی سے مار کٹائی کی ہے ـــــ"

وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ تکتے ہوئے سر نفی میں ہلاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اور ہکلاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولا "در ـــــ دروازہ بند کر دیا ہے نا ـــــ؟"

"کیوں؟ ڈر کیوں رہے ہو۔ کوئی پیچھے لگا ہے؟" میں نے کہا۔ پھر اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے ذرا ملائمت سے کہا ـــــ "جھانے، تم گھر میں آچکے ہو۔ دروازہ بند ہے تم بالکل محفوظ ہو ـــــ بتاؤ تو ہُوا کیا ہے؟" اس نے ہاتھ سے اپنے سر کے پچھلے حصّے کو چُھوا جہاں سے خون رِس رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی خون آلود ہو گئی "اوہ ـــــ"

مَیں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ میز پر پڑا رُومال اُٹھایا اور اس کے سر کے زخم کو صاف کرنے لگا۔ اس کے سر پر زیادہ بال نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ سر منڈوایا کرتا تھا۔ زخم صاف دکھائی دے رہا تھا کوئی تیز چیز لگی معلوم ہوتی تھی۔ نیم ہلالی شکل میں خاصا بڑا زخم تھا۔

لیکن گہرا نہیں تھا۔ اُوپری جلد ہی کٹی تھی۔

میں نے اس کا زخم صاف کیا۔ اس وقت کوئی دوائی میرے پاس نہیں تھی میں نے نانی کو اکثر زخموں میں جالا بھرتے دیکھا تھا۔ جب بھی کسی بچے کو چوٹ آجاتی یا ہاتھ کٹ جاتا، وہ جلدی سے کونوں کُھدروں سے جالا اتار کر زخم میں بھر دیا کرتی تھیں ـــــ خون بند ہو جایا کرتا تھا ـــــ اور زخم بھی بھر جایا کرتا تھا۔

مَیں نے جلدی سے جالا ڈھونڈا ـــــ میرے کمرے کی دیواریں اور کونے صاف تھے۔ کل ہی میری بہن شمّو نے سارے جالے وغیرہ صاف کیے تھے۔ مجھے ڈیوڑھی کا خیال آیا۔ وہاں دروازے کے پیچھے مجھے جالا مل گیا۔

میں نے جھانے کی ٹُنڈ کے پچھلے حصّے میں لگے زخم میں جالا بھر دیا ـــــ خون واقعی بند ہو گیا۔ اب جھانا قدرے حواس میں تھا۔

مَیں نے پوچھا ـــــ "کیوں اُستاد کیا واردات کی ہے آج ـــــ؟ کسی کو قتل وتل تو نہیں کر آئے؟"

"مانی ـــــ" وہ خوف کی کپکپاہٹ میں بولا۔

"ہوں ـــــ"

"یہ بات نہیں یار ـــــ"

"لڑائی ہوئی کسی سے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو گر گئے تھے کہیں۔ یہ چوٹ ـــــ"

"او ـــــ نہیں مانی ـــــ" وہ گھگھیایا۔

"تو ہُوا کیا ـــــ؟" میں نے جلدی سے اسے دیکھا "نہ کسی سے لڑے جھگڑے نہ ہی مار کٹائی کی اور گرے بھی نہیں۔ پھر یہ چوٹ کیسے آئی ـــــ؟"

"اس نے ——— اس نے گلاس مارا ———" وہ کانپتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کس نے ——— کس نے گلاس مارا ———؟" میں دوزانو ہو کر اس پر جھک گیا۔

"اس نے ——— اس ——— نے" وہ آنکھیں بند کر کے سر اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ میں پریشان ہو گیا میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ جھانا اتنا خوف زدہ تھا کہ ٹھیک سے بات اس کے منہ سے نہ نکل رہی تھی ——— میں نے اسے تسلی دلاسا دیا، ہمت بندھائی ——— اپنا کمبل اس کے گھٹنوں پر ڈال دیا ——— اس وقت وہ نیلی پاپلین کا میلا سا جوڑا پہنے تھا۔ آباجی کا پرانا تھیلا سا کوٹ اور میری اُتری ہوئی سوئیٹر زیب تن تھی۔ جانے اسے سردی لگ رہی تھی۔ یا خوف کی کپکپاہٹ تھی۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا تھا۔

وہ کافی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد سنبھلا ——— تو میں نے اس سے رُوداد سنی ——— جس پر پہلے تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔ من گھڑت قصہ ہی لگا ——— لیکن

جھانے کی حالت اس کے سر کا زخم اور شلوار کے پائینچے کے اوپر سے اُڑا ہوا کپڑا ——— یہ سب چیزیں اس کی باتوں کا منہ بولتا ثبوت بھی تھیں ———

میں حیران و ششدر اس کا منہ تک رہا تھا ——— جو واقعہ اس نے سنایا تھا۔ اس کی صحت سے انکار و اقرار دونوں ہی جیسے میرے بس میں نہیں تھے۔

جھانا فلم کا شو ختم ہوتے پر سینما ہاؤس سے نکلا اور حسبِ معمول سڑک کے کنارے چلتے چلتے اس گلی میں آ گیا ——— جو کوچہ شہباز خاں کے پہلو سے نکلتی تھی۔ یہ گلی شارٹ کٹ تھی اور جھانا ہمیشہ ہی اس گلی کو عبور کر کے بڑی سڑک پر آیا کرتا تھا۔ وہاں سے دو فرلانگ چل کر بائیں ہاتھ کی کشادہ گلی آ جاتی تھی ——— جو ہماری گلی سے آ ملتی تھی۔

آج بھی وہ معمول کے مطابق اپنے راستے سے واپس آ رہا تھا کہ کوچہ شہباز خان کے قریب اس نے دیکھا ایک عورت سر پر بڑا سا گٹھڑ رکھے چلی آ رہی تھی۔ گٹھڑ شاید زیادہ وزنی تھا۔ اس سے اٹھائے نہ اٹھایا جا رہا تھا۔ اس کی گردن اِدھر اُدھر ہو رہی تھی۔

جھانا اس کے پیچھے پیچھے تھا ——— اتنی رات گئے اکیلی عورت کو یوں بوجھ اٹھائے جاتے دیکھا۔ تو اس کے دل میں ہمدردی نے سر اُبھارا ——— ایک عورت کی مدد کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا ——— وہ جلدی سے آگے بڑھا اور عورت کے سامنے آتے ہوئے اس پر نگاہ ڈالی۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی ——— چہرے مہرے سے غریب دکھائی دیتی تھی لباس بھی اس کی مالی حالت کی نشاندہی کر رہا تھا ———

"اماں" جھانے نے اسے پکارا۔

"ہوں" عورت رُک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"لاؤ ——— یہ گٹھڑ میں اٹھا لوں ———"

"نہیں بیٹے ——— میں خود ہی لے جاؤں گی"

"جانا کہاں ہے ———؟"

"کوچہ شہباز سے ہو کر اس کے آخری سرے والی گلی میں اَب تو نزدیک آ گیا ہے میرا گھر ———"

"لاؤ اماں ——— میں پہنچا آتا ہوں ——— تم سے تو گٹھڑ اٹھایا بھی نہیں جا رہا۔"

اس نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد کہا "اچھا بیٹے ——— لو ——— اٹھا لو۔ میں واقعی اسے اٹھا نہیں پا رہی ——— اتنا کہہ رہے ہو، تو پہنچا ہی آؤ مجھے گھر تک"

اس نے گٹھڑ جھانے کے سر پر رکھ دیا ———

جھانے نے ٹھیک سے گٹھڑ سر پر جمایا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گٹھڑ واقعی ا
خاصا بھاری تھا۔

وہ عورت اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

جھانے نے قدم ملا کر ساتھ چلتے ہوئے پوچھا "اماں ۔۔۔ آدھی رات ہو رہی ہے۔ تم اکیلی کہاں سے آ رہی تھیں ۔۔۔؟"

وہ بولی "سارے کام مجھے خود ہی کرنا ہوتے ہیں بیٹے ۔۔۔ میں گاؤں گئی ہوئی تھی وہاں سے یہ کھانے پینے کا سامان لانا تھا۔ میرا شوہر مر چکا ہے۔ بچے چھوٹے ہیں اس لیے سارے کام خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاری اڈے پر ہی رات گزار لوں۔ لیکن بچے گھر پر اکیلے تھے۔ اس لیے وہاں نہیں رکی ۔۔۔ چلی آئی ۔۔۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ ورنہ میری گردن تو جواب دے جاتی ۔۔۔ تمہیں خواہ مخواہ تکلیف اٹھانا پڑی۔"

"تکلیف کیسی اماں۔ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ میں آپ کے کام آیا ۔۔۔"

"بہت اچھے ہو تم ۔۔۔"

جھانا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر کا رستہ دکھا رہی تھی۔ کوچہ شہباز خان ختم ہوا تو وہ دائیں ہاتھ کی پہلی گلی میں مڑ گئی۔

جھانا بھی ادھر ہی گیا۔

کونے کا گھر چھوڑ کر وہ دوسرے گھر کے سامنے رکی ۔۔۔ اس گھر پر جلی حروف میں دو سو پندرہ کا ہندسہ لکھا تھا۔

"یہ ہے میرا گھر ۔۔۔" اس نے تھڑے پر پاؤں رکھ کر کہا۔ اور دروازہ کھولنے لگی۔

جھانے نے دیکھا وہ ایک نیا مکان تھا ۔۔۔ اور ہرے رنگ کا لکڑی کا دروازہ جس پر پیتل کے بولٹ لگے تھے عورت نے کھول دیا تھا۔

"آ جاؤ ۔۔۔" عورت نے کہا اور صحن کی بتی جلا دی۔

جھانا گٹھڑ اٹھائے بمشکل تھڑے پر چڑھا ۔۔۔ عورت نے گٹھڑ کو سہارا دیا۔ وہ اندر آ گیا۔

"یہاں رکھ دو۔" عورت نے دائیں ہاتھ پر بنے برآمدہ نما باورچی خانے میں چولھے کے قریب پڑی رنگین پیڑھی کے پاس گٹھڑ رکھنے کا اشارہ کیا۔

جھانے نے گٹھڑ وہاں رکھ دیا۔

"شکریہ۔" عورت نے کہا۔

جھانے نے سیدھا ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے عورت پر نگاہ ڈالی۔ وہ کچھ حیرت زدہ سا ہوا۔ وہ عورت ادھیڑ عمر کی نہیں تھی۔ اور نہ ہی غریب دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک جوان اور گٹھے جسم کی عورت کی تھی۔ لباس بھی ریشمی پھولدار پہنا ہوا تھا ۔۔۔ کانوں میں بالے تھے اور گلے میں کنٹھ مالا پہنے ہوئے تھی۔

جھانے نے بار بار پلکیں جھپکیں۔

پھر اسے خیال آیا۔ شاید گلی میں دھندلی روشنی تھی۔ اس لیے وہ ٹھیک سے اسے دیکھ نہ پایا تھا۔ خفت سے مسکراتے ہوئے اس نے عورت سے کہا "معاف کریں ۔۔۔ میں آپ کو اماں کہتا آیا۔ آپ ۔۔۔ تو باجی ہیں ۔۔۔"

وہ بڑے حسین اور دلنشین انداز میں مسکرائی "کوئی بات نہیں ۔۔۔ بیٹھو ۔۔۔"

"بیٹھو بھی ۔۔۔ کچھ کھا پی لو ۔۔۔"

"نہیں جی ۔۔۔ شکریہ ۔۔۔"

"میں ایسے ہی جانے تھوڑا دوں گی ۔۔۔ بیٹھ جاؤ ۔۔۔" وہ عورت پیڑھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ۔۔۔ جھانا ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چھوٹا سا صحن عبور کر کے سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔

جھانے نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے مکان کا جائزہ لیا۔ یہ غالباً ایک احاطے کا مکان تھا۔

نیا نیا تعمیر ہوا لگتا تھا۔ چھوٹا سا سُرخ پکّی اینٹوں والا صحن تھا۔ جس کے ایک کونے میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ بیرونی سبز دروازے کے قریب ایک کھونٹا سا تھا۔ جس کے ساتھ شاید کوئی جانور باندھا جاتا تھا۔ سامنے کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ اور کھڑکیاں صحن میں کھُلتی تھیں۔ اس وقت کھڑکیاں بند تھیں اور دروازہ کھول کر وہ عورت اندر گئی تھی۔ اس طرف پکّا برآمدہ تھا۔ دیوار کے ساتھ دو مٹّی کے چولھے بنے تھے ——— ایک چولھے پر دیگچہ پڑا تھا ——— نیچے سلگتی لکڑیاں تھیں۔ لگتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی کسی نے دیگچے کو دم پر رکھا تھا۔ چند برتن کارنس پر پڑے تھے۔ چولھے کے قریب چوکی پر مرچ مصالحوں کے ڈبے پڑے تھے۔ دو تین رنگین پایوں والی پیڑھیاں بھی پڑی تھیں۔ اور برآمدے کے آخری کنارے پر جالی دار لکڑی کی ڈولی بھی رکھی تھی۔ جس میں پھل اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں پڑی تھیں۔ جھانے نے گھر کے چتنے حصے کا جائزہ لیا۔ وہ صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز نئی اور چمکدار تھی۔ کارنس پر پڑے تانبے اور پیتل کے برتن چمچا رہے تھے۔ بجلی کا ایک بلب برآمدے میں بھی روشن تھا۔ صحن میں بتّی جل رہی تھی۔ صحن ڈھکا ہوا تھا۔ اُوپر کی منزل کو صحن ہی کے مغربی کنارے سے زینہ جاتا تھا۔ یہ زینہ لکڑی کا تھا اور نئی نئی پالش چمک رہی تھی۔

جھانے کو یہ گھر بہت اچھا لگا۔

وہ عورت کمرے سے باہر آئی۔ تو اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اس نے اُونی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اور گہرے فیروزی رنگ کا گرم جوڑا پہن رکھا تھا ——— پہلے اس کے کپڑے آتشیں گلابی رنگ کے تھے۔ جھانے نے لباس کی تبدیلی سے کوئی بات اخذ نہیں کی ——— یقیناً سفر میں اس کا لباس میلا ہو گیا ہوگا۔ صاف ستھرا رہنا اس کی عادت ہوگی ——— اس لیے لباس بدل لیا ہوگا۔

"ہاں تو ———" وہ چولھے کے قریب پڑی پیڑھی پر آ بیٹھی ——— "بھوک لگ رہی ہوگی؟"

"نہیں تو ہم لوگ نو بجے کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس وقت تو آدھی رات کا محل ہوگا ———" جھانے نے کہا۔

"پلاؤ بنا یا رکھا ہے کھاؤ گے؟" عورت نے پوچھا۔

پلاؤ جھانے کی کمزوری تھا ——— پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد بھی اسے پلاؤ دیا جاتا تو وہ رغبت سے کھا لیا کرتا تھا۔ پلیٹ دو پلیٹ یوں چٹ کر جاتا۔ جیسے دِنوں بھوکا ہو ——— ہم لوگ اسے کہا کرتے "کھائے پر کھا جاتے ہو۔ کسی دن پیٹ میں درد پڑے گا۔ ہیضہ ہوگا ——— مر جاؤ گے" لیکن جھانے پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا۔ کہا کرتا "پلاؤ دیکھ کر میں رہ نہیں سکتا ——— بھلے تکلیف ہو جائے۔ پر میں کھاؤں گا"

اور

اس وقت جو عورت نے پلاؤ کی بات کی، تو جھانے کی رال ٹپک پڑی۔ ہنس کر بولا "باجی، پلاؤ میری کمزوری ہے ——— مجھے بھوک نہ ہو تب بھی میں کھا لیتا ہوں اور اس وقت تو ——— مجھے ——— مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے ———"

"جاؤ ہاتھ دھو لو ——— میں کھانا نکالتی ہوں"

وہ اُٹھ کر صحن کے نل تلے ہاتھ دھونے گیا۔ عورت نے کارنس سے پیتل کا تھال اور گلاس اُتار کر پیڑھی کے قریب رکھ کر دیا۔ پھر دیگچہ کھول کر تھال میں چاول ڈالنے لگی۔ جھانا ہاتھ دھو کر کرتے کے دامن سے حسبِ عادت ہاتھ پونچھتا پیڑھی قدرے پرے کھسکا کر چولھے کے قریب ہو بیٹھا۔ پلاؤ کی خوشبو اس کی اشتہا کے لیے کھُلا چیلنج تھی وہ گرسنہ نظروں سے تھال کی طرف دیکھنے لگا۔ جو اس عورت نے بھر دیا تھا۔

"لو کھاؤ ———" عورت نے جھانے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ جھانے کو اس کی آنکھوں میں بڑی چمک نظر آئی ——— ایسی چمک جسے وہ اس وقت کوئی نام نہ دے سکا۔

تھال اس نے اپنے سامنے کر لیا۔ گرم گرم پلاؤ جھانے کی بھوک کو بڑھا رہا تھا ا
حالانکہ اس وقت کچھ کھانے کا عادی نہیں تھا۔ پھر بھی جانے کیوں شدت سے بھوک
لگ رہی تھی۔

اس نے نوالہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

عورت مسکراتے ہوئے بولی "بے تکلفی سے کھاؤ ــــ اپنا گھر ہی سمجھو"

جھانے نے بھی جواباً مُسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ایک دم ہی بہت اچھی لگنے
لگی تھی۔ نوالہ اُٹھانے سے پہلے وہ بولا "آپ بھی کھائیں نا باجی ــــ"

"میں بھی کھا لوں گی ــــ پہلے یہ سامان سمیٹ لُوں۔ تم کھاؤ ــــ"

وہ گٹھڑ کھولنے لگی۔

جھانے نے نوالہ منہ میں ڈالا ــــ پلاؤ بے حد لذیذ تھا۔

اس نے دوسرا نوالہ بنایا۔ بوٹی تلاش کرنے کے لیے اس نے چاول سامنے
سے اُلٹے پلٹے۔ اسے بوٹی نظر آئی ــــ جسے اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

لیکن

ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی ــــ بوٹی کے بجائے، اس کے ہاتھ میں ایک
انسانی ہاتھ تھا ــــ کٹا ہوا انسانی ہاتھ۔

خوف سے اس کی آواز گھُٹ گئی ــــ ہاتھ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

عورت نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر اس گٹھڑ پر پڑی جو عورت
نے کھول دیا تھا۔

اس میں

اس میں

بہت سے کٹے ہوئے ہاتھ تھے۔

جھانا چیخ مار کر اُٹھ بھاگا۔

"ٹھہرو ــــ" عورت نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

جھانا نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ اب انتہائی خوفناک روپ دھار چکی تھی ــــ ادھیڑ عمر، بدشکل اور غریب عورت
کا روپ۔

جھانا متوحش ہو کر بھاگا۔

عورت نے پیچھے سے پیتل کا گلاس کھینچ مارا ــــ جو اس کے سر میں لگا۔ لیکن وہ
رکا نہیں۔ ہاں، دروازے کے قریب لگے کھونٹے میں اس کا پائینچہ الجھا اور وہ منہ
کے بل گرا۔

عورت نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

وہ اس کے پیچھے دوڑی۔

لیکن

جھانا ــــ پتا نہیں کیسے ــــ اُٹھا ــــ بھاگا ــــ دروازے سے نکلا اور اندھا
دھند دوڑتے ہوئے گلی سے نکل گیا۔

عورت کی ہنسی میں اس کی آواز گونج رہی تھی "اپنے ہاتھ تو دیتا جا ــــ"

وہ بے تحاشا تیز بھاگتا

گلی پار کرتا سڑک پر آیا اور سرپٹ دوڑتا گھر آ پہنچا تھا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے
پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

ہاں، اس عورت کی کھنکتی ہنسی میں ڈوبے الفاظ "اپنے ہاتھ تو دیتا جا ــــ" سڑک
تک اس کا تعاقب کرتے رہے تھے۔

جھانے نے پُورے حواس میں مجھے یہ واقعہ سُنایا تھا۔

میں نے پوری کہانی سُنی ـــــ کچھ خوف زدہ بھی ہوا۔ لیکن جھانے کے ذہن سے خوف دور کرنے کے لیے ہنس کر بولا۔

"جھانے، پتا ہے یہ سب کیا ہے؟"

"کیا مانی ـــــ؟"

"خواب"

"خواب"

"ہاں ـــــ"

"نہیں یار، عجیب بات کرتے ہو، یہ خواب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ حقیقت ہے۔ مَیں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ـــــ"

"لگتا ایسے ہی ہے۔ لیکن ہوتا خواب ہے۔"

"کیا خواب جاگتے میں بھی نظر آتے ہیں۔ چلتے پھرتے بھی نظر آتے ہیں؟"

"بالکل ـــــ"

"تم تو پاگل ہو ـــــ"

"نہیں جھانے، یہ حقیقت ہے۔ پتا ہے کیا ہوا ہوگا؟"

"کیا؟"

"تمھیں زبردست نیند آ رہی ہو گی۔ لیکن گھر پہنچنے کی بھی جلدی ہو گی۔ اس لیے چل تو تم بے شک رہے ہو گے لیکن خواب بھی دیکھ رہے ہو گے۔"

"واہ ـــــ" وہ غصّے سے بولا ـــــ "خواب ہی میں گلاس بھی سر پر لگا اور خواب ہی میں سچ مچ کا خون بھی نکلنے لگا ـــــ"

مَیں اس بات پر کچھ لاجواب سا ہو گیا ـــــ واقعی اس کے سر پر زخم تھا اور یہ یقیناً اس پیتل کے تیز دندانے والے گلاس ہی سے لگا تھا۔ کیونکہ زخم نیم ہلالی نشان کا تھا۔

کچھ دیر مَیں قیاس آرائیاں کرتا رہا

جھانا میری ایک بات سے بھی اتفاق نہیں کر رہا تھا۔

چار بجے کے قریب مَیں نے اس سے کہا۔ "اچھا بھئی، اب بند کرو باتیں ـــــ صبح میرا ٹیسٹ ہے۔ تھوڑی دیر سو لینے دو ـــــ تم بھی جا کر سو جاؤ ـــــ صبح دیکھیں گے۔ جاؤ ـــــ اُٹھو ـــــ"

"مانی ـــــ" وہ درخواستی لہجے میں بولا۔

"کیا ہے؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہو تو یہیں پڑ رہوں ـــــ اپنی کوٹھری میں جاتے ڈر لگتا ہے ـــــ"

"بڑے بزدل ہو ـــــ چلو یہیں سو جاؤ ـــــ جاؤ اپنا لحاف لے آؤ" مَیں نے کہا ـــــ اصل میں ڈر مجھے بھی لگ رہا تھا۔ اور میں بھی چاہتا تھا، کہ وہ میرے کمرے میں ہی سوئے۔

وہ اپنا بستر اُٹھا لایا۔ اور میری چارپائی کے قریب دری پر بستر بچھا کر لیٹ گیا۔

وہ تو کچھ دیر بعد سو گیا۔

لیکن مجھے باقی ساری رات نیند نہ آئی۔ یہ واقعہ میرے اعصاب پر مسلّط ہو گیا تھا۔

صبح اس واقعے کی خبر سارے گھر کو ہو گئی ـــــ اباجی نے اسے جھانے کی بڑ قرار دیا بولے "یہ رنگا رنگ فلمیں دیکھنے کا اثر ہے۔ سپنس اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں اتنے شوق سے جو دیکھتا ہے۔"

امی کچھ خائف سی نظر آئیں ـــــ "اس میں لاکھ خرابیاں ہوں گی۔ لیکن یہ جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ یہ مَیں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ اٹھارہ بیس سال ہو گئے ہیں اسے اپنے پاس رہتے ـــــ یہ بات اس نے جھوٹی نہیں گھڑی ـــــ اور پھر سر میں زخم بھی تو آیا ہے۔"

"زخم گرنے سے بھی آسکتا ہے،" ابّا جی بولے۔

"ہائے جھانے ___" شمّو خوفزدہ ہو رہی تھی "جو وہ تیرے ہاتھ کاٹ لیتی تو ___"

"تو دوسرے دن پلاؤ بنا کر کسی اور کو کھلاتی ___" ابّا جی نے تمسخر سے کہا۔

"میاں جی ___" جھانا بڑی عاجزی سے بولا "میں نے کوئی بات دل سے نہیں گھڑی۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ___ یہ سب کچھ میرے ساتھ پیش آیا ہے میاں جی ___"

"یعنی انسانی ہاتھ ___ پلاؤ میں پکا ہوا تھا ___"

"جی میاں جی ___"

اور گھر میں بھی کٹے ہوئے انسانی ہاتھ تھے ___"

"جی ___"

"لگتا ہے، آج اس نے دیگچہ نہیں دیگ پکانا ہو گی انسانی ہاتھوں کی۔" ابّا جی نے پھر تمسخر سے بات اُڑائی۔ لیکن امّی کو جیسے جھانے کی باتوں کا سو فیصد یقین آ چکا تھا بولیں "آپ ایسے ہی جھٹلائے جا رہے ہیں بیچارے کو۔"

ابّا جی نے امّی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولے "تو تمھیں یقین ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے ___؟"

امّی چپ ہو گئیں۔

جھانا بولا ___ "میاں جی ___ میں جھوٹ نہیں کہتا ___"

"تمھیں وہ گلی یاد ہے جس میں رات گئے تھے ___؟"

"جی ___ بالکل ___ کوچہ شہباز جہاں ختم ہوتا ہے ___ وہ گلی ادھر ہی سے نکلتی ہے ___"

وہ گھر بھی یاد ہو گا ___؟"

"جی میاں جی ___ سبز دروازے والا نیا مکان ہے۔ اس کے دروازے پر دو سو پندرہ لکھا تھا ہندسوں میں ___"

"مکان کا نمبر بھی دیکھ لیا تھا ___؟"

"ہاں، میاں جی ___"

"تو ٹھیک ہے۔ آج چلتے ہیں وہاں ___"

"جھانا خوف سے کانپتے ہوئے بولا ___ "نہیں ___ نہیں میاں جی ___"

"کیوں نہیں ___ جا کر دیکھیں تو سہی ___ اس حسینہ کو جسے انسانی ہاتھ گوشت کی طرح پلاؤ میں پکانے کا شوق ہے ___"

"آپ تو مذاق کرتے ہیں ___ اچھا ہے کہ اس کی بات کی تصدیق کے لیے وہاں جائیں" امّی بولیں۔

"چلے چلتے ہیں ___" ابّا جی بولے۔

جھانے کو سب نے سمجھایا، کہ وہ ابّا جی کے ساتھ دو ایک معتبر لوگوں کو بھی ساتھ لے کر وہ گھر دکھائے، ہو سکتا ہے وہاں کوئی آدم خور رہتا ہو ___ اور چھپ چھپ کر انسانی ہاتھوں کی ضیافت اُڑاتا ہو ___

جھانا ڈرا تو بہت ___ لیکن سب کے کہنے پر رضا مند ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ابّا جی نے چچا حمید کو بھی ساتھ لیا ___ میں بھی کالج سے آ چکا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں جھانے کی رہنمائی میں اس عورت کے ہاں جانے کو تیار ہو گئے۔ امّی نے ہم پر قرآنی آیات پڑھ کر پھونکیں ___ ابّا جی اور چچا حمید مسکرا دیے۔ چچا حمید کو بھی یہ کہانی بے سروپا معلوم ہو رہی تھی ___ اور وہ بھی ابّا جی کی طرح بار بار جھانے کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے میرے ذہن سے بھی خوف کے سائے ہٹ رہے تھے۔

ہاں، جھانا اسی طرح ڈرا سہما اور خوف زدہ تھا۔

ہم کوچہ شہانہ خان میں پہنچے ـــــ یہ کوچہ بڑا آباد تھا۔ چوڑی گلی کے دونوں طرف پختہ مکان تھے۔ کچھ دو منزلہ کچھ تین منزلہ ـــــ گلی میں اس وقت خاصی رونق تھی۔ بچے گلی میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ لوگ آجا رہے تھے۔ کچھ عورتیں بھی نیم وا دروازوں کے پیچھے کھڑی ہمسائیوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ دو ایک ریڑھی والے بھی صدا لگا رہے تھے۔ جھانے نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔

یہ کوچہ جہاں ختم ہوتا تھا، وہیں سے دائیں بائیں گلیاں مڑتی تھیں۔

" اب کدھر جانا ہے مسٹر جھانے ؟" چچا حمید نے مذاقاً پوچھا۔

" اُدھر ـــ" جھانے نے ڈرتے ڈرتے دائیں گلی کی طرف اشارہ کیا۔

چچا اور اباجی آگے آگے تھے۔ وہ اس گلی میں مڑ گئے ـــ

" پہلا نہیں، دوسرا مکان ہے۔" جھانے نے کہا۔ "دو سو پندرہ نمبر ـــ"

اباجی اور چچا حمید دوسرے مکان کے سامنے رک گئے۔

" یہ ہے ؟" اباجی نے پوچھا ـــ "دو سو پندرہ تو لکھا ہے دروازے پر ـــ"

جھانے نے آہستہ آہستہ چلتے سر ہلایا۔

پھر وہ بھی اباجی کے قریب آ گیا۔

لیکن

اس نے حیران پریشان ہو کر دروازے اور مکان کو دیکھا۔ سر نفی میں ہلایا، گردن موڑ کر دائیں بائیں دیکھا اور مجھ سے چمٹ کر بولا ـــ "جگہ یہی ہے ـــ لیکن مکان ـــ"

" غائب ہو گیا" چچا بولے ـــ

" تُو تو کہتا تھا۔ نیا اور پختہ مکان تھا۔ یہ تو غالباً دو صدی پہلے نیا بنا تھا ـــ"

" میاں جی ـــ پکا لال اینٹوں والا مکان تھا ـــ"

جس مکان کے سامنے ہم کھڑے تھے ـــ وہ بوسیدہ مکان تھا۔ دروازہ لکڑی کا ہے اور کہیں کہیں سے سبز رنگ بھی دکھائی دے رہا تھا لیکن تھا بہت پرانا۔ نیم وا دروازے کے ایک بوسیدہ پٹ پر کالے روغن سے دو سو پندرہ لکھا ہوا ضرور موجود تھا۔ مکان کی بیرونی دیوار کچی تھی۔ کہیں کہیں سے اینٹیں بھی نکلی ہوئی نظر آئی تھیں۔ ٹوٹے پھوٹے خستہ مکان میں لگتا تھا، کوئی رہتا ہی نہیں ـــ

اباجی اور چچا حمید اب بھی سنجیدہ نہیں تھے ـــ لیکن میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ جھانا بہت متوحش نظر آ رہا تھا۔

" گھر یہی تھا پر بالکل نیا تھا۔ میاں جی ـــ دروازے کے پیچھے صحن ہے۔ دائیں ہاتھ پکا برآمدہ ہے جس میں مٹی کے چولہے ہیں۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ لکڑی کا زینہ ہے جو اُوپر جاتا ہے۔ باورچی خانہ نما برآمدے ہی میں پیڑھی پر میں بیٹھا تھا اور اس نے تھال میں چاول ڈال کر مجھے دیے تھے۔ دائیں ہاتھ کمرہ تھا۔ جس میں دو کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا۔ ادھر دوسرے کونے میں ہینڈ پمپ تھا۔ اس پر میں نے کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے تھے۔ دروازے کے قریب ہی کھونٹا تھا ـــ جس میں بھاگتے وقت میرا پائنچہ اُلجھا تھا ـــ"

جھانا جیسے مشینی انداز میں تفصیل دہرا رہا تھا ـــ

" ہو سکتا ہے، رات میں اُسے پرانا مکان پختہ اور نیا نظر آیا ہو ـــ" چچا حمید نے اب قدرے سنجیدگی سے کہا۔

" چلو اندر چلتے ہیں ـــ" اباجی بولے ـــ "گھر تو برسوں سے غیر آباد لگتا ہے، بہرحال دروازہ بجاؤ ـــ"

چچا حمید نے تھڑے پر پاؤں رکھ کر دروازے پر ہاتھ مارا۔

دروازہ کھلا تھا ___ اس کی کنڈی بھی نہیں تھی۔

چچا کھِلکھلا کر ہنس پڑے ___

"کیوں" ابا جی بولے۔

"ڈھاؤ ڈھیری مکان ہے ___" وہ قدم بڑھا کر اندر گئے۔ ابا جی بھی اندر گئے اور میں نے بھی قدم اندر رکھا۔ جھانا میرے ساتھ ساتھ اندر آیا۔

لیکن مکان کی ہیبت دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہم سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے "یہ ___ یہ سب کیا ہے ___؟"

"مکان کا نقشہ تو وہی ہے ابا جی ___" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "جو یہ رات سے بتا رہا ہے۔"

ابا جی بھی اب کچھ پریشان نظر آئے۔

ہم سب چھوٹے سے صحن میں کھڑے تھے۔ جس کے سامنے والے کونے سے چوبی زینہ جو جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اوپر کو جاتا تھا۔ دائیں ہاتھ کمرہ بھی تھا ___ جس کے دروازے کا ایک پٹ ٹوٹ کر گرا ہوا تھا۔ دو کھڑکیاں بھی تھیں۔ جن کی لکڑی اتنی پرانی اور بوسیدہ تھی کہ جگہ جگہ سے دراڑیں نظر آ رہی تھیں ___ کونے میں پرانا ہینڈ پمپ بھی تھا۔ جس کی ہتھی شاید لوگ اکھاڑ لے گئے تھے۔

دروازے کے قریب کھونٹا بھی تھا ___

بائیں طرف کچا برآمدہ بھی تھا، جس کی چھت میں سوراخ پڑے تھے۔ مٹی کی ڈھیریاں لگی تھیں۔ اور دو ٹوٹے ہوئے مٹی کے چولہے بھی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔

ہم سب حیرت و استعجاب سے اس ویران مکان کو دیکھ رہے تھے۔ جو جھانے کے نقشے کے مطابق تھا۔ لیکن نہ ہی نیا تھا نہ ہی کوئی سامان پڑا تھا۔ لگتا تھا برسوں سے

غیر آباد پڑا ہے۔

چچا حمید اور ابا جی حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

جھانا بدحواس سا تھا۔

"میں یہاں پیڑھی پر بیٹھا تھا ___" اس نے برآمدے میں ایک اینٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور جب میں بھاگا تو اس نے گلاس میرے سر پر دے مارا ___ میں ___"

اس کی بات پوری کرنے سے پہلے ہی ابا جی کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی ___ انھوں نے جھک کر اٹھائی ___ تو خوف سے ان کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا۔

یہ پیتل کا بالکل نیا اور تیز کنارے والا گلاس تھا۔

"یہ ___ یہی ___ یہی تھا ___" جھانا دہشت زدہ ہو کر باہر کی طرف بھاگا۔ ہم سب بھی اندر سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ جلدی سے باہر لپکے ___ دروازے کے قریب لگے کھونٹے پر میری نگاہ پڑی ___ تو مجھے اس میں نیلے نیلے کپڑے کا ٹکڑا نظر آیا۔

"یہ ابا جی ___ یہ ___" میں نے وہ چھوٹا سا ٹکڑا اُچک لیا اور جست لگا کر دروازے سے باہر آ گیا۔ یہ ٹکڑا جھانے کی شلوار کے پائنچے کا تھا ___ جو رات اس کے کھونٹے میں الجھنے سے پھنس گیا تھا۔

ہم سب متوحش اور حیران تھے۔

جھانے کی باتوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔

لیکن

تصدیق کے باوجود یقین سے سب کوسوں دور تھے۔

ابا جی نے دو ایک راہگیروں کو روک کر پوچھا "یہ مکان کس کا ہے ___؟"

"یہ تو محلے دار ہی بتا سکتے ہیں ___ ویسے برسوں سے خالی پڑا ہے۔ ڈھے رہا ہے ___ اب تو رہائش کے قابل بھی نہیں" ابا جی نے سامنے والے گھر کے دروازے پر دستک

دی۔ ایک مدبّر قسم کے آدمی باہر آئے۔ علیک سلیک ہوئی۔ آبا جی نے ان سے پوچھا

"یہ مکان کس کا ہے ـــــ؟"

کیوں، آپ خریدنا چاہتے ہیں ـــــ"

"جی نہیں ـــــ ویسے ہے کس کا ـــــ؟"

"اس کے مالک کراچی میں رہتے ہیں، کوئی خریدنا چاہے تو دے دیں گے"

"یہ ویران پڑا ہے"

"جی ہاں ـــــ اب تو رہنے کے قابل بھی نہیں ـــــ"

"اس میں جنّات تو نہیں رہتے ـــــ؟"

آبّا جی کی بات پر وہ آدمی ہنس پڑا پھر بولا "نہیں صاحب! ایسی کوئی بات نہیں، مکان غیر آباد اور ویران ضرور ہے لیکن ایسی کوئی بات ہمارے مشاہدے میں تو کبھی نہیں آئی۔ سارا دن یہاں بچے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ـــــ یقین کریں کسی سے پوچھ لیں ـــــ ڈر خوف والی کوئی بات نہیں۔ آپ نے خریدنا ہو، تو میں بات کرا دوں گا"

آبّا جی نے ان کا شکریہ ادا کیا ـــــ

اور ہم سب انھیں سلام کر کے لوٹ آئے ـــــ گلاس آبا جی کے ہاتھ میں ہی تھا ـــــ اور پائینچے سے اُڑا ہوا کپڑے کا نیلا ٹکڑا میں پکڑے ہوئے تھا ـــــ

اب کوئی جھانے کا مذاق نہیں اڑا رہا تھا، آبا جی اور حمید چچا حیران و پریشان نظر آ رہے تھے۔ مَیں بھی سوچوں میں گم تھا ـــــ

بات یقین کرنے کی بھی تھی۔ اور بے یقینی یقین کو جھٹلا بھی رہی تھی۔

بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ جن کی صحت سے انکار نہیں ہوتا۔ لیکن جن میں حقیقت کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی ـــــ یہ دنیا واقعی اسرار سے

بھری ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہونی باتیں کیونکر ہو جاتی ہیں ـــــ یہاں سائنس بھی بے بس نظر آتی ہے۔ حقائق اور دلائل سے کسی وجود اور شخصیت کو ثابت کرنے کا نام ہی تو سائنس ہے۔ لیکن یہ جو واقعہ جھانے کو پیش آیا، اسے حقائق و دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے ؟

لیکن

یہ بھی سچائی ہے، کہ یہ واقعہ اسے پیش آیا تھا۔

کچھ لوگوں نے سُنا تو کہا، کوئی آدم خور ہوں گے ـــــ لیکن بات یوں نہیں بنتی اگر اس غیر آباد مکان میں آدم خور تھے بھی تو کہاں گئے۔ چولھے ٹوٹے پھوٹے تھے۔ ان میں آگ جلے برسوں بیت گئے۔ پھر گرم گرم پلاؤ کا دیگچہ کیسے پکا۔ بہت سوں کا خیال تھا، کہ یہ جنّات کی کارروائی تھی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے ـــــ کہ جنّات کو اپنی شناخت کروانے کے لیے انسانی ہاتھوں کا پلاؤ پکا کر کھلانا کیوں پڑا ـــــ کسی اور طریقے سے بھی تو وہ اپنے موجود ہونے کا ثبوت دے سکتے تھے ـــــ پھر وہ نیا نکور پیتل کا گلاس ـــــ اور نیلا ٹکڑا ـــــ عقل بے بس ہو جاتی ہے۔ اور......

سوچ و فکر کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔

کچھ پلّے نہیں پڑتا ـــــ سوچتے ہیں ـــــ سوچتے ہیں۔

پھر بھی

کچھ پلّے نہیں پڑتا ـــــ

اِس واقعے کو برسوں بیت چکے تھے تب میں کم سن تھا۔ اب تو زندگی کے وسیع تجربے سمیٹ چکا ہوں ـــــ

لیکن

اس واقعے کو جب بھی یاد کرتا ہوں —— بالکل تازہ لگتا ہے۔ لیکن ابھی تک میں اس مسئلے کو سلجھا نہیں پایا —— میرے بچے اسے بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ ایک طلسماتی کہانی سمجھتے ہیں اسے، میرے پوتے پوتیاں تو فرمائش سے یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی مجھ سے سنتے ہیں۔

لیکن

میں ان سب کو کیسے بتاؤں۔ کیونکر سمجھاؤں کہ یہ کہانی نہیں —— ایک واقعہ ہے، ایک حقیقت ہے ایک سچائی ہے ——

میرے پاس اس واقعے، اس حقیقت اور اس سچائی کو ثابت کرنے کو کچھ ہے بھی تو نہیں۔

ٹھکانے

سیڑھیاں اُترتے اُترتے میرے قدم آپوں آپ رُک گئے۔ اور میرے کان کمرے سے آنے والی آوازوں پر کھڑے ہو گئے۔

میاں بیوی کی باتیں سننا خلافِ تہذیب اور غیر اخلاقی حرکت سہی۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میرا نام بار بار لیا جا رہا تھا۔ جھگڑا ہو رہا تھا۔ اور اس جھگڑے میں میری ذات ملوث تھی۔ میرے قدم آپوں آپ کیوں نہ رُک جاتے۔

فائزہ برملا کہہ رہی تھی "اس گھر میں میں رہوں گی یا تمہاری بہن۔ بہت سہہ لیا۔ برداشت کر لیا۔ مجھے بھی خودمختاری چاہیے۔ مجھ سے اس کی غلامی نہیں ہو سکتی۔" وہ بہت بھڑک گئی۔

میرا چھوٹا بھائی نسیم بیوی کی ڈانٹ سہتے ہوئے اسے آہستہ بولنے کو کہہ رہا تھا۔ "باجی ابھی نہیں گئیں۔ سن نہ لیں تمہاری بک بک۔ آہستہ بولو۔"

وہ چمک کر بولی "سُن لے تو اچھا ہی ہے۔ عقل مند ہو گی تو جان چھوڑ دے گی ہماری۔ ساس نہیں تھی۔ یہ نند سر پر چڑھی بیٹھی ہے۔"

"فائزہ"، نسیم نے پھر کہا۔

"میری بات کا جواب دو" وہ تیزی سے بولی۔ "ایک فیصلہ کر لو۔ بہن کو یہاں ہی رہنے دینا ہے تو پھر میرے لیے گھر کرائے پر لے لو۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ یہاں وہ رہے گی یا میں۔ نبیلہ خوش قسمت ہے چلی گئی۔ میں جلنے کڑھنے کو یہاں رہ گئی۔ بس اب میں کچھ

برداشت نہیں کرسکتی۔ پھر وہ بڑبڑ کرنے لگی۔ میرے کانوں نے جو کچھ اخذ کیا یہی تھا کہ
اسے میری چھوٹی بھابی اور بھائی شمیم کے دوبئی چلے جانے کا دکھ تھا۔ اس کا خیال تھا
کہ وہ دونوں مجھ سے جان چھڑا کر چلے گئے۔ اور یہاں اسے سزا بھوگنے کو رہنا پڑ رہا ہے۔
لڑائی جھگڑا نسیم اور فائزہ میں اکثر ہی ہوتا رہتا تھا۔ شادی کو تیسرا برس رہا تھا۔
بچہ بھی ہو گیا تھا۔

لیکن

وہ اکثر خاموش ہی رہتی تھی۔

اور

پچھلے سال جب شمیم ڈیپوٹیشن پہ دوبئی چلا گیا تھا۔ فائزہ کا لڑنا جھگڑنا بہت حد تک
بڑھ گیا تھا۔

میں نے اسے میاں بیوی کا معاملہ سمجھ کر کبھی دخل اندازی نہیں کی تھی۔

لیکن

آج

میں جو کچھ سن رہی تھی۔ لگتا تھا پگھلتی آگ میرے کانوں میں اتر رہی ہے۔ میں نے تو
کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کہ فائزہ مجھ سے اتنی نالاں ہے۔ مجھے اپنے اوپر اتنا گراں بار سمجھتی
ہے۔ اپنی خوشیوں اور آزادی کا قاتل گردانتی ہے۔

وہ بولنے بکے جا رہی تھی۔ اور نسیم چپ چاپ سنے جا رہا تھا۔ اسے ٹوکتا بھی
تو صرف یہی کہتا "آہستہ بولو۔ باجی سن نہ لیں"

وہ اس کی اس بات پر اور بھڑک جاتی تھی۔ غصے سے بل کھاتی تھی اور اس طرح
بولتی تھی۔ کہ مانو قینچی کترکتر کرتی چلی جا رہی ہے۔ آج وہ فیصلہ کرنے پہ تلی تھی۔ کہ اس
گھر میں وہ رہے گی یا میں۔

جب وہ کسی طور چپ ہونے میں نہ آئی۔ اور اس کی آواز اور بھی بلند ہونے لگی
تو نسیم نے شاید ہاتھ جوڑ کر کہا "خدا کی بندی چپ ہو جا اب تو۔ چلو تیری بات مان
لوں گا۔ الگ گھر کہو گی تو ایک گھر لے دوں گا۔ یہاں اپنا چولہا چوکا الگ کرنا چاہو گی تو
وہ الگ کر لیں گے۔ جیسے کہو گی ایسے ہی کروں گا۔ ٹھیک اب تو خوش ہو جا۔ فائزہ میں
تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری زندگی ہو جان ہو۔ سب کچھ تم ہی تو ہو۔ تم خوش
رہو بھلے باجی ناراض ہو جائے۔ میں کچھ پرواہ نہیں کروں گا۔ بس۔ اب تو مان جاؤ جان۔
خوش ہو جاؤ۔ مسکرا تو دو۔"

اور پھر
شاید نسیم اسے خوش کرنے اور مسکرانے پہ آمادہ کرنے کے لیے مردانہ حربے استعمال
کرنے لگا۔

میں چند لمحے وہیں پتھرائی سی کھڑی رہی۔

پھر بمشکل اپنا آپ گھسیٹتی سیڑھیاں دبے پاؤں واپس چڑھتے اپنے کمرے میں آ کر
بستر پہ گر گئی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا۔ اور میں جو چالیس سال کے لگ بھگ
ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ عورت تھی۔ اس کل کی لڑکی سے مات کھا کر بے حال ہونے
لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں نے ایسا کونسا تیر مارا ہے جو فائزہ کے جگر کے آر پار
ہو گیا ہے۔ میں نے تو اسے کبھی بھابی سمجھا ہی نہیں تھا۔ بہو بنا کر لائی تھی۔ اور بیٹی
بنا کر گھر میں رکھا تھا۔ حتی الامکان کوشش کی تھی کہ وہ سکھی رہے، خوش رہے۔ اس پر گھریلو
ذمہ داری نہیں ڈالی تھی۔ کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ اور تو اور اس کے بچے کو بھی میں
سنبھالتی تھی۔ میں کیا جانتی تھی۔ کہ میری یہی ہمدردی اور ذمہ داری اسے گراں گزر رہی
ہے۔ اور وہ میری ان ساری خدمت گزاریوں کو غلط مفہوم دے رہی ہے۔

میں سر تھامے سوچ رہی تھی۔ یہ ذہنی صدمہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔
میں نے تو ان سب کے لیے جو قربانی دی تھی۔ وہ شاید ہی کوئی دے سکتا ہو۔ میں

نے کیا کھویا تھا کیا پایا تھا۔ تپتے ذہن سے ہی تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر فائزہ ہی نے بک بک کی ہوتی تو شاید مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ مجھے تو دکھ نسیم کی باتوں سے ہوا تھا۔ بیوی کی خوشنودی کے لیے وہ بہن سے الگ ہونے کی باتیں کتنے سہل انداز میں کر رہا تھا۔ اس بہن سے جس نے اپنی زندگی کی ہر خوشی اس کے لیے تیاگ دی تھی۔

میں نے اس بات کو کبھی احسان نہیں سمجھا تھا۔ کبھی بار بھی نہیں جانا تھا۔ فرض سمجھ کر سب کچھ کیا تھا۔ کیا یہ میری قربانی نہیں غلطی تھی؟

میں سر تھامے بیٹھی تھی اور ماضی کا لمحہ لمحہ سرک سرک کر میری آنکھوں میں اُتر رہا تھا۔ سولہ سترہ سال کی بھولی بسری یادیں اور ذہن سے نوچ نوچ کر الگ کیے ہوئے لمحے نشتر بن کر من میں چبھنے لگے۔ تب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہر جوان جوڑے کی طرح میں اور عقیل بھی اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین جوڑا سمجھتے تھے۔ میرا تعلق ایک سفید پوش متوسط گھرانے سے تھا۔ میرے سسرال میں خوشحالی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس لیے کہ باپ سمیت تینوں بھائی برسرِ روزگار تھے۔ ایک ہی گھر میں سب مل جُل کر رہتے تھے۔ سارے نظام کا مرکز میری ساس تھی۔ تینوں بیٹے ساری کمائی ماں کی جھولی میں لا کر ڈال دیتے تھے۔ پھر ماں ہی انہیں اور ان کی بیویوں کو جیب خرچ دیا کرتی۔ اس کا طریق کار اور گھر کے لوگوں پر اتنی مضبوط گرفت تھی۔ کہ کمائی کرتے بیٹوں کو بھی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی۔ عقیل کی دو بہنیں ابھی کنواری تھیں، اور جب تک وہ بیاہی نہ جاتیں گھر کا سلسلہ اسی طرح چلنا تھا۔

میں خوش تھی۔ اپنے سے زیادہ خوشحال گھرانے میں آئی تھی۔ یہاں کسی چیز کی اگر بہتات نہ تھی تو کمی بھی نہیں تھی۔ دونوں نندوں کے جہیز بن رہے تھے میرے ماں باپ کی طرح جہیز بناتے بناتے یہ لوگ قرضے کے بار تلے نہیں دب رہے تھے۔ میں جانتی تھی کہ

[میـ]ری شادی کے لیے امّاں ابّا کو کتنی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا اور جو قرض انہوں نے اٹھایا ہے مہینوں تو کیا سال دو سال میں بھی اُتار نہ پائیں گے۔

لیکن پھر بھی میں خوش تھی۔ میرے والدین خوش تھے۔ میری شادی کر کے وہ اک بڑے فریضے سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

ابا جی خوشی سے جھوم کر اماں سے کہتے "بڑی بھاگوان ہو۔ بیٹی کی شادی کر دی۔ [جو]انی کرتے ہی اتنا اچھا رشتہ مل گیا۔"

"ہاں" اماں بھی خوشی کا اظہار کرتی "بروقت رشتہ مل گیا۔ جوان لڑکی کو گھر بٹھائے [ر]کھنا پڑتا۔ تو دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔"

ابا ہنس پڑتے "اب تو سکھ کی نیند سوؤ۔"

"بالکل" اماں کا لہجہ سکون بھرا ہوتا۔ "اب تو دس بارہ سال کے لیے بے فکر ہو گئی ہوں۔"

"سمیعہ ابھی آٹھ سال کی ہے۔"

"اور نسیم، شمیم۔ ان کی فکر نہیں؟"

"لڑکے ہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔ پھر وہ بھی تو ابھی چھوٹے ہیں۔ بارہ سال کا تو ہوا ہے نسیم۔ شمیم دس سال کا ہے۔ ان کی بھی ابھی سے کیا فکر کروں۔ ابھی پڑھیں لکھیں ربیعہ جوان تھی۔ خدا کا شکر ہے اپنے گھر کی ہو گئی۔"

میرا اور نسیم کا دس سال کا فرق تھا۔ میری پیدائش کے بعد اماں بیمار پڑ گئی تھیں کسی کو یقین نہ تھا۔ کہ وہ صاحب اولاد ہو سکیں گی۔ لیکن دس سال بعد خدا نے بیٹے سے نوازا اور یوں اوپر تلے تین بچے ہو گئے۔ سمیعہ دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ اور ان دنوں صرف آٹھ سال کی تھی۔

خوشیاں زندگی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کی شاید عادی ہوتی ہیں، پلک جھپک
آتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب بھی ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ان کے نظر آنے کا
وقفہ لمبا ہوتا ہے اور غائب ہونے کا تھوڑا۔ لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ
نظر صرف فریب نظر کی طرح آتی ہیں۔ اور زندگی میں اماوس کی راتوں کے اندھیرے
بکھیر کر اس طرح غائب ہو جاتی ہیں۔ کہ یقین ہی ٹوٹ جاتا ہے کہ کبھی اب پھر ان کے
دمکتے چمکتے چہرے دیکھ پائیں گے۔

ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہم ابھی خوشیوں کی پوری طرح شناخت بھی نہ کر
پائے تھے۔ ان سے نبھا کرنا بھی نہ سیکھا تھا انہیں سنبھالنا نہ آیا تھا کہ لگا بجلی کا
بٹن دباتے ہی جگمگاہٹیں غائب ہو گئی ہیں اور ایسا گھور اندھیرا چھا گیا ہے کہ ہاتھ کو
ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ رستے ڈھونڈنے اور اس سے چھٹکارا پانے کا تو خیال بھی محال تھا۔
ابا اور اماں کسی عزیز کی فوتیدگی پر دوسرے شہر گئے۔ واپس تو ہوئے لیکن اس
طرح نہیں جس طرح گئے تھے۔ بس کے حادثے نے ان کی لاشیں بھی مسخ کر ڈالی تھیں۔ دونوں میں
اعتماد اور پیار اس حد تک تھا کہ جیئے بھی اکٹھے اور مرے بھی اکٹھے۔ یہ اک ناگہانی صدمہ
تھا۔ جو مجھ پر اور میرے بھائی بہنوں پر ٹوٹا۔ اک کہرام بپا ہو گیا۔ قیامت ٹوٹ پڑی۔
صدمے نے میرا دماغ ماؤف کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائیوں اور کم سن بہن کو سینے سے
لگا لگا کر میں تڑپ تڑپ کر رو دی۔ اس وقت تو صرف بچھڑنے کا صدمہ تھا۔ جدائی کا دکھ
تھا۔ ناگہانی آفت کا رونا تھا۔ میں نے تو جانا ہی نہیں تھا کہ ان کی موت ہم پر کس طرح
اثر انداز ہوگی۔ زندگی کے رخ ہی بدل جائیں گے۔ سوچیں بھی بدل جائیں گی
متعین راستے ہی گڈمڈ ہو جائیں گے۔

مہینہ بھر تو گھر میں لوگوں کی بھرمار رہی اماں اور ابا کے رشتہ دار آتے جاتے
رہے۔ میرے سسرال والے ہمدردیاں جتاتے رہے۔ مجھے بالکل نہیں لگا کہ ہم لوگ اکیلے

بالکل تنہا رہ گئے ہیں، سہارے ٹوٹ گئے ہیں اور بار گراں سروں پر آن پڑا ہے۔ مجھے
تو سچی بات اتنے دنوں ہونے والے خرچے کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا کہ کس کس نے کیا
ہے۔ اماں ابا کے رشتہ داروں ہی نے ساری ذمہ داریاں نبھائیں۔ لیکن کب تک۔
چالیسویں کے بعد قریبی عزیز بھی اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ اور گھر کی ذمہ داریاں
میرے سپرد کیں تو مجھے لگا جیسے سارے گھر کی چھتیں مجھ پر آن گری ہیں۔ میں ان کے
نیچے دب گئی ہوں۔ کچھ اس طرح کہ نکلنا چاہوں بھی تو نکل نہ پاؤں گی۔

میں بے حد پریشان ہوئی، اتنی پریشانی کہ سوجھ بوجھ ہی نہ رہی۔ نسیم شمیم اور سمیعہ
تو اتنے چھوٹے تھے کہ ساری پریشانیاں ان کے لیے بے معنی تھیں۔ اماں ابا کو یاد کر
کے کسی وقت رو دیتے تو سارا وقت ہنستے کھیلتے بھی پھرتے تھے۔ ان کے ذہنوں نے
صدمے سے اثر تو لیا تھا۔ لیکن صدمے کی نوعیت کو نہیں سمیٹا تھا۔ وہ ابھی اتنے باشعور
کہاں تھے۔ شعور تو مجھے تھا۔ اور یہ شعور ہی ساری پریشانیوں اور دکھوں کا باعث تھا۔

میں سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگتی کہ اب کیا ہوگا؟

کیا بنے گا؟

ان چھوٹے بچوں کو کون سنبھالے گا؟

ان کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟

یہ پڑھیں لکھیں گے کیسے؟

پہنیں گے کہاں سے؟

کھائیں گے کدھر سے۔

ابا اماں تو اندر سے کھوکھلے میری شادی پر ہی ہو گئے تھے۔ نہ زیور کی صورت
گھر میں کچھ تھا نہ ہی نقدی۔ لے دے کر ایک گھر ہی تھا۔ لیکن اس پر بھی میری شادی
پر لیے گئے قرضوں کا بوجھ تھا۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ کتنا قرض ہے۔ قرض دار بھی

اماں ابا کے مرنے کے بعد چالیس دن ہی بشکل خاموش رہ سکے۔ اپنی رقموں کے ڈوب جانے کے خیال سے بے چین تھے۔ چالیسواں ہوتے ہی سب نے دھیمے دھیمے تقاضے شروع کر دیئے۔ میری پوزیشن بڑی نازک تھی۔ میں ان قرضوں کا کھل کر عقیل یا سسرال سے بھی ذکر نہ کر سکتی تھی کہ ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور میکے کا بھرم ٹوٹنا گوارہ نہیں تھا۔

عزت نفس اور انا بھی تو کوئی شے ہے۔

میں نے ماموں اور خالہ سے صلاح ومشورہ کیا۔ ساری سوچ بچار کے بعد اسی نقطے پر پہنچے کہ گھر کو گروی رکھ کر قرض داروں کے منہ بند کیے جائیں۔

"لیکن" یہ لیکن میرے دماغ کو داغ رہا تھا۔ میں رو رو کر بے حال ہو جاتی۔ قرض کچھ نہ کچھ ادا کر بھی دیا۔ تو ان بھائیوں اور بہنوں کا کیا کروں گی۔ ماموں خالہ پھوپھی چچا کوئی بھی یہ بار اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ مال و دولت ہوتا تو شاید یہ رشتہ دار بھی تحفظ کے لیے اپنے دامن پھیلا دیتے۔ مفت کے بوجھ اٹھانے کو کون تیار ہوتا۔ میں نے یہ ناپسندیدگی ان کی آنکھوں میں پڑھ لی تھی اور ایک نے تو دبے لفظوں میں اسے میری ذمہ داری بھی قرار دے دیا تھا۔

"شکر کرو۔ تم شادی شدہ ہو۔ بھائیوں اور بہن کا بار اٹھا سکتی ہو۔ تمہاری شادی نہ ہوئی ہوتی تب تو واقعی بہت مشکل تھا۔"

لیکن

میرے دل سے کوئی پوچھتا میرے لیے تو تب شاید اتنی مشکل نہ ہوتی جتنی اب تھی۔

عقیل بہت اچھے تھے۔ میرے دکھ کو سمجھتے تھے۔ مجھے تسلیاں دلاسے بھی دیتے تھے۔ چالیسویں تک وہ یہیں رہے۔ یہاں ہی سے دفتر چلے جاتے۔ اور واپسی پہ

گھر چند گھنٹے گزار کر رات پھر یہیں آجاتے میں ان سے لپٹ لپٹ کر روتی اور وہ مجھے تھپک تھپک کر تسلی دلاسے دیتے۔ میرا حوصلہ جی اٹھتا۔ گو ابھی تک ہمارے درمیان مستقبل کے لائحہ عمل کی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ان کی وجہ سے مجھے بڑی تسلی تھی۔

چالیسویں کے بعد عقیل گھر چلے گئے۔ شام کو چکر لگا جاتے۔ میرے سسرالی عزیز بھی آتے جاتے۔ ان کی تسلیوں تشفیوں سے مجھے بڑا سہارا ملا۔

میں نے چچا اور ماموں کو گھر گروی رکھنے کا کام سونپا۔ اور خود بچوں کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ بچے سکولوں سے غیر حاضر رہے تھے۔ نسیم کا تو نام بھی کٹ گیا تھا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس کا نام بحال کروایا۔ ان کی کتابیں اور یونیفارم درست کیے اور انہیں باقاعدہ سے سکول بھیجنا شروع کیا۔ ان سب چیزوں کے لیے میں نے پیسے کہاں کہاں سے بٹورے یہ ایک لمبی دکھ بھری کہانی ہے۔

بچے سکول جانے لگے اور میں گھر بار ٹھیک کرنے لگی۔

کچھ رشتہ داروں نے مجھے مشورہ دیا "ربیعہ جب تک بچے چھوٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری تمہارے کندھوں پر ہی ہے۔ اچھا کرو۔ تو عقیل کو کہو یہاں ہی آجائے۔ وہ وہاں رہ رہا ہے تم یہاں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

مشورہ میرے دل لگا۔ میں نے اسی شام جب عقیل آئے۔ تو ان سے کہا "آپ یہاں ہی آجائیں نا۔ جب تک بچے چھوٹے ہیں ان کی نگہداشت اور دیکھ بھال مجھے ہی کرنا ہے۔ اور کون ہے جو یہ بار اٹھائے گا۔"

عقیل نے ایک دم سے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیوں عقیل۔ کیا یہ ٹھیک نہ رہے گا۔ مجبوری ہے نا۔ کیا کروں۔"

"اماں سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

میں نے جلدی سے کہا "بے شک روز وہاں بھی ہو آیا کرنا۔ میں بھی جایا کروں گ

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر اماں سے پوچھے بغیر میں کیا کہوں۔"

"اماں سے میں منت کروں گی۔ وہ ضرور اجازت دے دیں گی۔ وہ بھی جانتی ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ کوئی ان بچوں کو سنبھالنے والا ہوتا تو یہ صورتحال نہ ہوتی۔" میں رو پڑی تو عقیل نے بڑے پیار سے مجھے تسلی اور دلاسہ دیا۔

دوسرے دن میں بڑے تجسس اور انتظار میں تھی۔ عقیل شام آئے تو میں نے آتے ہی کہا "بیگ میں کپڑے ہی لے آتے صبح ادھر ہی سے دفتر جانا ہے نا۔"

"کیوں۔"

"اماں نہیں مانتیں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عقیل کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا رہے تھے۔ میں کچھ نہیں بولی۔ عقیل تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے اور میرے لئے الجھنوں اور مسائل کے انبار چھوڑ گئے۔ میں سوچوں میں ڈوب گئی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ سوچتے سوچتے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

میرے لیے سب سے بڑی پریشانی روپے پیسے کی تھی۔ کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ اب تک جو کچھ خرچ ہوا تھا۔ وہ تو کسی نہ کسی طرح کر لیا تھا۔ کچھ ابا کے فنڈز ملے تھے۔ کچھ گھر گروی رکھ کر بچا تھا۔ قرضے نہ دینے ہوتے تو یہ پیسے کچھ دیر اور چل سکتے تھے۔ لیکن قرضوں کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔ میرے پاس جو پیسے تھے وہ بھی خرچ ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ عقیل یہاں آجاتے تو اپنی گھر گرہستی شروع ہو جاتی۔ بچوں کا بار بھی سمیٹ لیتی۔ لیکن انہوں نے کہاں آنا تھا اماں اتنی زور آور تھیں۔ کسی بچے کی کیا مجال جو ان کی حکم عدولی کر سکے۔

میں ساری رات بے یقینی اور پریشانی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ میں کونسی جہاندیدہ اور تجربہ کار تھی کہ سکون اور اطمینان سے تجربوں کی روشنی میں کوئی پلان بناتی۔ کبھی

جی چاہتا بچوں کو یتیم خانے داخل کرا دوں۔ کبھی سوچتی انھیں بھی سسرال لے جاؤں۔ کبھی غصہ آتا تو جی چاہتا ساس کا منہ نوچ لوں۔ کبھی عقیل پر تاؤ آتا کہ جھنجوڑ ڈالوں انہیں ان کی بے بسی پر۔

چند روز اسی الجھاؤ میں گزرے۔

اس شام میری ساس آگئیں۔ مجھے گلے سے لگایا۔ میرے ساتھ آنسو بہائے پھر تسلی دلاسے دیئے میری بہن بھائیوں کے سروں پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے بولی "بیٹی کب تک یہاں بیٹھی رہو گی۔ تمہارا گھر تمہارے بغیر سونا ہے۔ عقیل بھی تنہا ہو گیا ہے۔ اب گھر چلو۔ بچوں کو دوسرے چوتھے دیکھنے آجایا کرو۔ آخر کب تک تم اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑے ان کی ذمہ داریاں سنبھالو گی۔"

میں ہونقوں کی طرح ساس کا منہ تکنے لگی۔ غصے اور دکھ سے بولی "ان تینوں کو کس کے سہارے چھوڑ دوں۔ گلے گھونٹ دوں ان کے؟"

"آئے ہائے بہو۔ تم تو خواہ مخواہ ہی بھڑکنے لگیں۔ ان کا بندوبست کرو کوئی۔ کسی کے پاس چھوڑ دو۔ بھرا پرا کنبہ ہے تمہارا۔ ماموں ہے خالہ ہے۔ چچے ہیں۔ پھوپھیاں ہیں ان کی بھی تو کوئی ذمہ داری ہے۔"

ساس سے تکرار کرنا فضول تھا۔ میں نے سنجیدگی سے سوچا۔ ساس جاتے جاتے بڑی الٹی پلٹی باتیں کر گئیں مجھے اگر اپنا گھر بستا رکھنا تھا۔ تو ان بچوں کی ذمہ داری کسی اور رشتہ دار پہ ڈالنا ہی تھی۔

میں ماموں کے پاس گئی۔ روئی، منت سماجت کی۔ اپنی بربادی نہیں چاہتی تھی۔ ماموں کچھ پسیجے مامی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ان کے اپنے بھی تو پانچ بچے تھے لیکن میں بھی کیا کرتی۔

میں نے بچوں کو ان کے ہاں چھوڑا۔

اور خود عقیل کے ساتھ اپنے گھر آگئی۔

یہاں بھی مجھے سکون تھوڑا ملتا تھا۔ ہر وقت بچوں ہی کا دھیان رہتا۔ صبح و شام روتے گزرتے۔ ساس جھلا جاتی۔ نندیں منہ بناتیں اور اٹھتے بیٹھتے عقیل کو سناتیں کہ گھر کیا ہے ماتم کدہ ہے۔ ہم پر بھی خواہ مخواہ کی ڈپریشن طاری رہتی ہے۔ بھابی کو تو وہیں چھوڑ آؤ۔ یہاں اب ان کا جی نہیں لگتا۔

میں سب کچھ سنتی دل و دماغ پر آرے چلتے۔ مجبوراً برداشت کرتی۔

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا کہ مامی آگئیں۔ وہ بچوں سے بڑی نالاں تھیں۔ اور انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا۔

"ہمارے گلے مصیبت ڈال کر یہاں بیٹھی ہو۔ ہم انہیں نہیں رکھ سکتے۔ ناک میں دم کر دیا ہے کم بختوں نے کھلاؤ پلاؤ الگ اور دردسری مول لو الگ۔"

میں مامی کے ساتھ ہی ان کے گھر آئی۔ بچے مجھ سے لپٹ گئے۔ تینوں چیخ چیخ کر رونے لگے "ہمیں اپنے ساتھ لے چلو باجی۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔" وہ بلک بلک کر کہہ رہے تھے۔ بچوں کے کپڑے انتہائی غلیظ تھے۔ منہ ہاتھ بھی شاید نہیں دھوئے تھے۔ سمیعہ کے نرم و ملائم بال تو مٹی سے اٹے تھے۔ اس کی سرخ و سپید رنگت مٹیالی ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر سسک رہی تھی۔ میرا جی بھر آیا۔ میں بہت روئی۔ ماموں تو گھر پہ نہیں تھے۔ مامی ہی انہیں کوسے جا رہی تھی۔

میں جذباتی ہو گئی۔ مامی کی باتوں کا رندھے گلے سے تلخ تلخ جواب دیتے ہوئے میں نے بچوں کی چیزیں سمیٹیں۔ اور انہیں ان کے گھر لے آئی۔ بچوں پر جو سختی اور زیادتی مامی نے کی تھی۔ ان کی زبانی سن سن کر میرا دل دہل دہل گیا۔ میں سب کو گلے لگا کر روتی رہی۔

لیکن رونے دھونے سے مسئلے حل ہونے لگیں تو دنیا آنسو بہا بہا کر سیلاب

لے آئے۔ اس وقت ہوش مندی اور دانش مندی سے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

لیکن میری رہبری کرنے والا کون تھا؟

میں بچوں کو لے کر سسرال آگئی۔

اور عقیل کی موجودگی میں ساس سے دوٹوک انداز میں کہا۔ "خدا نے یہ مصیبت اور آزمائش مجھ پر ڈالی ہے۔ یہ میری ذمہ داری بن گئے ہیں۔ جب تک نسیم اس قابل نہیں ہو جاتا کہ دونوں بہن بھائی کا بوجھ اٹھا سکے۔ انہیں میری ضرورت ہے۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ چاہیں تو انہیں میرے ساتھ یہیں رہنے کی اجازت دے دیں۔ نہیں تو عقیل کو میرے ساتھ اس گھر میں جانے دیں۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میری ساس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔" بوجھ تو بہت ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں میں اپنے بیٹے کا گھر بستے ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ جیسے تیسے ان کی بھی گزر ہو جائے گی۔ بچوں کو اپنے پاس یہیں رکھ لو۔"

میں اپنی ساس کی وسعت قلبی سے بے حد متاثر ہوئی۔ جی چاہا ان کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ میں نے روتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اور بچے میرے ساتھ اسی گھر میں رہنے لگے۔ لیکن میں نے جلد ہی محسوس کر لیا۔ کہ چیز اپنے ٹھکانے پر ہی بھلی لگتی ہے۔ بچوں کے گھر میں آنے سے گھر کا کوئی فرد خوش نہ تھا۔ میری جٹھانیاں اور نندیں تو بہت جلد بیزار ہو گئیں۔ ہر وقت ناک بھوں چڑھائے کچھ نہ کچھ کہتی رہتیں۔ میں بچوں کو ڈانٹتی۔ مارتی۔ برا بھلا کہتی۔ انہیں چٹکیاں کاٹ کاٹ کر ان کے جسم نیلے کر دیئے لیکن وہ بچے تھے۔ کیا سمجھتے۔ انہیں کھانا بھی چاہیے تھا۔ کھیلنے کی بھی ضرورت تھی۔ دوسرے بچوں کے کھلونے اور سائیکلیں ان کے لیے بھی کشش رکھتی تھیں۔

میں سخت اذیت اور ذہنی عذاب سے گزر رہی تھی۔ بچے باغی ہوتے جا رہے

تھے۔ ان سے بالکل نوکروں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ جھڑکیاں پڑتی تھیں۔ مار کھاتے تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ کیسے برداشت ہوتا۔ یہ بچے اماں ابا کے کتنے لاڈلے تھے۔ میں جانتی تھی۔ ایک دم جو کایا پلٹی تو بیچارے بدحواس ہو گئے تھے۔

میں نے دلجمعی سے سوچا۔ سسرال والے بھی کسی حد تک حق بجانب تھے۔ پرائی بلا کون خوشی سے اپنے گلے ڈالتا ہے۔ خرچہ بھی واقعی بڑھ گیا تھا۔ گھر کے سکون میں بھی بچے مخل تھے۔

میں نے سوچا کیوں نہ نوکری کر لوں۔ کم از کم ان بچوں کے لیے تو پیسے کما ہی لوں گی۔ میری ایک سہیلی کے ابو ایک بہت بڑے بنک کے بہت بڑے افسر تھے۔ اسی نے بتایا تھا کہ مقامی بنک میں ایک خاتون کی آسامی خالی ہے۔ یہ نوکری مجھے بآسانی مل سکتی تھی۔

میں نے عقیل سے بات کی۔

وہ حیرانگی سے بولے "تم نوکری کرو گی؟"

"ہاں"

"کیوں بچوں کے لیے نوکری کرنا ہے عقیل؟"

عقیل انتہائی بے رحمی سے بولے "اوہ۔ یہ بات ہے۔ بھئی بچے تو تم جہیز ہی میں لے آئیں۔ اپنے تو جب ہوں گے ہوں گے۔ ان بچوں کی خاطر تم؟"

"عقیل" میں رک گئی۔

"سچی بات کہوں رہبر۔ میں تو اپنی شادی سے پریشان ہوں۔ کیا اسی لیے شادی کی تھی میں نے۔ کہ بیگم صاحبہ توجہ دیں نہ کسی قسم کی دلچسپی لیں۔ تمہیں ہر وقت اپنے بہن بھائیوں ہی کا خیال رہتا ہے۔ میں تو جیسے کچھ ہوں ہی نہیں۔ میں ایسی ازدواجی زندگی سے قطعاً مطمئن نہیں ہوں۔ یہ بات ذہن میں رکھ لو۔ اس پر اب نوکری؟"

وہ بڑبڑ کرتے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور میرا سر چکرانے لگا۔ اس دن میں نے ...یعہ کو بلا وجہ خوب مارا نسیم اور شمیم کے بھی لتے لیے۔ بیچارے سہم کر کونوں میں دبک گئے۔

عقیل مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ہر وقت غصے میں رہتے۔ بچوں سے پیار ...ے بولنا چالنا تو کیا انہوں نے تو کبھی ان کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ سسرال والے بھی ...وں سے نالاں تھے۔ حالانکہ سب ان سے نوکروں کی طرح کام لیتے۔ کمروں کی جھاڑ ...نچھ۔ جوتے پالش کرنا۔ موٹر سائیکلیں صاف کرنا۔ بازار سے چھوٹا موٹا سودا لانا سب ...ام انہی سے لیے جاتے۔ پھر بھی سو سو باتیں سننا پڑتیں۔ میں روتی رہتی۔ غصہ ان بے گناہوں ...نکالتی۔ انہیں مارتی پیٹتی بددعائیں دیتی۔ کسی وقت تو لگتا میرا ذہنی توازن بگڑنے ...لا ہے۔

میری دوست نے مجھے سمجھایا۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ہمت دلائی۔

"دونوں میں ایک کو چن لو۔ یا تو بچوں کو پالو پوسو ان کی زندگی بناؤ۔ یا اپنی ازدواجی ...زندگی نبھاؤ۔ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔ بچے یہاں الٹی حالات میں رہے۔ تو ان کا ...ر تباہ ہو جائے گا اور تم بھی کسی مینٹل ہاسپٹل میں پہنچ جاؤ گی۔ یا تو ان بچوں کے لیے قربانی دے ڈالو۔ یا انہیں قربان کر ڈالو۔"

فیصلہ آسان نہیں تھا۔

میں کئی دن کشمکش و پیچ میں رہی۔

"بچے یہاں نہیں رہ سکتے" ایک دن میری ساس نے کہہ ہی دیا۔ "جہاں چاہو ...انہیں رکھو۔ یہاں سے لے جاؤ۔ سارے رشتے دار جیتے جاگتے ہیں۔ کہیں چھوڑ آؤ۔ ...ہمیں کیا پڑی ہے یہ مصیبت گلے ڈال رکھی ہے۔ گھر کا سکون ہی برباد ہو گیا ہے۔"

میں نے بچوں کو لیا اور گھر سے نکل آئی۔ دکھ اذیت اور پریشانی میں کچھ سوجھا ہی

نہیں۔ میں خالہ کے ہاں آ گئی۔ ماموں اور پھوپھو کے گھر پہنچی۔ چچا کی منّت سماجت کی لیکن نہ تو بچے کہیں رہنے پہ آمادہ تھے نہ ہی کوئی انہیں پاس رکھنے کو تیار تھا۔ میں گھر آ گئی۔ اور پھر ایک دم ہی فیصلہ کر ڈالا۔ ان بچوں کی خاطر میں ہر قربانی دینے کو تیار ہو گئی۔ میں نے اپنی دوست کی وساطت سے بنک میں نوکری حاصل کر لی۔ یوں مالی مسئلہ حل ہو گیا بچوں کو میں نے سکولوں میں بھیجا۔ اور یوں ماں اور باپ بن کر ان کی پرورش کرنے لگی۔ میں بے حد دکھی تھی۔ لیکن بچے خوش تھے مطمئن تھے۔ اپنا گھر اپنا ماحول مل گیا تھا۔ ماں باپ کا کھویا پیار مجھ سے کشید رہے تھے۔

"اب تو ہم کہیں نہیں جائیں گے نا باجی۔ یہیں رہیں گے نا۔ آپ بھی ہمارے پاس ہی رہیں گی نا" بچے مجھ سے لپٹ لپٹ کر پوچھتے۔

"ہاں" میں ان کے سر منہ چوم کر جواب دیتی "اب ہم سب یہیں رہیں گے۔ کہیں نہیں جائیں گے۔"

عقیل دو چار دفعہ آئے۔ میری نوکری پر اعتراض کیا۔ ساتھ چلنے کو کہا۔

"میں ان بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" میرا جواب تھا۔

"ان کی خاطر مجھے چھوڑ دو گی"

"چاہتی تو نہیں۔"

"پھر"

"ایک صورت ہے"

"کیا؟"

"آپ یہاں آ جائیں۔"

"میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

"یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے۔"

"جو بات مناسب ہو وہی کرنا چاہیے۔"

"بعض باتیں حالات کے تابع ہوتی ہیں عقیل۔ میرے حالات سے آپ بے خبر نہیں ان بچوں کی زندگی داؤ پر نہیں لگائی جا سکتی۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں۔ مجبوری ہے۔ جب تک نسیم سمجھدار نہ ہو جائے میری ذمہ داری ہیں۔"

"ان کی خاطر اپنا گھر برباد کر رہی ہو۔"

"شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ آپ اپنے فیصلے میں ذرا لچک پیدا کر لیں تو شاید حالات بہتر ہو جائیں۔" عقیل جب بھی آتے یہی بحث ہوتی۔ میرے فیصلے میں تبدیلی کا سوال ہی نہ تھا۔ عقیل بھی سمجھداری سے کام نہیں لے رہے تھے۔

پھر انہی دنوں اک نئی پریشانی نے مجھے آن گھیرا۔ مجھے اپنے اندر تبدیلی کا احساس تھی میں ماں بننے والی تھی۔ ماں بننا دنیا کی سب سے بڑی خوشی اور تفاخر کا خوش کن احساس ہے۔ میں خوشی سے باؤلی سی ہو گئی۔ میرے اور عقیل کے درمیان یہ اٹوٹ بندھن تھا۔ گھٹی زنجیر تھی جو ناساعد حالات میں بھی ہمیں باندھ رکھتی۔ میں یہ خوشخبری عقیل کو سنانے کے لیے بے تاب تھی۔

"اب تو وہ یہاں رہنے پر آمادہ ہو جائیں گے" میں نے سوچا۔ اور عقیل کے آنے کا بے تابی اور بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔

لیکن

وہ نہیں آئے۔ ہاں میرے جہیز کا سامان ان کے ہاں سے آ گیا۔

میں چکرائی۔ بوکھلائی۔ قطع تعلق کا یہ تازیانہ بڑا شدید تھا۔

میں بھاگم بھاگ اپنے سسرال پہنچی۔ جہیز واپس بھیجنے کے متعلق استفسار کیا تو ساس اپنی کاٹ دار آواز میں بولی "جہیز ہم نے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ہمارے

پاس۔ پھر یہ کمرے بھی تو خالی کرنا تھے۔ بہو کا جہیز بھی تو آنا ہے۔"

"بہو کا؟"

"ہاں۔ میں عقیل کی شادی کر رہی ہوں۔ میں اپنے بچے کو تباہ حال نہیں دیکھ سکتی۔"

مجھ پر جو بیتی وہ میں ہی جانتی ہوں۔ میں عقیل سے جُدا ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن جُدا کر دی گئی۔ مجھ پر دباؤ ڈالا گیا اور دوسری شادی کی اجازت حاصل کر لی گئی۔

میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ کئی دن تو حواس ہی بجا نہ ہوئے۔ رشتہ داروں نے ستا تو زبانی ہمدردی جتانے آئے۔ میں نے کسی کو نہیں بخشا۔ کسی سے لڑ پڑی، کسی سے الجھی، کسی کا منہ نوچ لیا۔ کسی کے بالوں پر جھپٹ پڑی۔ ان سب سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ نفرت، شدید نفرت۔

ان حالات میں بھی میری دوست ہی نے مجھے سہارا دیا سنبھالا، اور حالات سے مفاہمت کر لینے کی ہمت دلائی۔

میں قدرے سنبھلی تو مجھے اپنی کوکھ میں پلنے بڑھنے والے وجود کا احساس ہوا۔ عقیل کی یہ نشانی تو تھی میرے پاس۔

"میں اس کے سہارے زندگی کے دن گزار لوں گی" ایک دن میں نے دکھ سے کہا تو میری دوست پریشانی سے بولی "یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے ربیعہ۔"

"ہے تو۔"

"کیوں؟"

"تم نے اس کے متعلق عقیل کو بھی نہیں بتایا۔"

"موقع ہی کب ملا۔"

یہی تو غلط بات ہوئی ہے۔ تمہارے سسرال والے پہلے ہی کچھ کم باتیں تو نہیں بنا رہے۔"

"بناتے رہیں۔ سن کر چپ ہو رہنے کے سوا چارہ ہی نہیں۔"

"اس بچے کے متعلق بھی وہ باتیں بنائیں گے۔"

"کیوں؟"

اس کیوں کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا۔ میں دل برداشتہ سی ہو گئی۔ عقیل کو میں نے دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی، لیکن خود طلاق تو نہیں لی تھی۔ میں اب بھی اس کی بیوی تھی اور یہ بچہ عقیل کا تھا۔ لیکن حالات نے جو رُخ اختیار کر لیا تھا وہ بھی سوچ طلب تھا۔

مجھے نوکری کر کے اپنے بہن بھائیوں کا پیٹ پالنا تھا۔ انہیں پڑھانا لکھانا تھا۔ ان پر اپنا آپ صرف کرنا تھا۔ پھر یہ بچے کی ذمہ داری۔ ؟؟

"ہو سکتا ہے دوسری بیوی تمہیں طلاق ہی دلوا دے" ایک دن میری دوست نے باتوں کے دوران کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کا کیا کرو گی۔ پیدا کرو گی جان جوکھوں میں ڈال کر اسے پالو گی لیکن سر پر عقیل کی تلوار لٹکتی رہے گی وہ جب چاہے گا بچہ تم سے لے لے گا۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا کلیجہ نکال کر مسل دیا ہو۔

"پھر دیکھو تو۔ تمہارے اوپر ذمہ داریاں بھی کتنی ہیں: بچہ ہو جانے سے ان سے نبھاہ کر پاؤ گی۔ تم پہلے ہی اتنی کمزور ہو رہی ہو۔ نوکری کر رہی ہو۔ گھر کا کام کاج کرنا پڑتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہی کہ یہ بچہ جو تمہارے مصائب میں اضافہ کر دے گا نہیں ہونا چاہیئے۔"

"کیا؟"

"ہاں ربیعہ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ ابھی کچھ نہیں گیا۔ تم اس ذمہ داری اور پابندی سے آزاد ہو سکتی ہو۔ جذباتی نہ ہو۔ اطمینان سے جائزہ لو۔ سوچو۔ اور پھر عمل کرو۔"

میں پہلے تو بڑی جذباتی ہوئی۔ بڑا بھڑکی۔

لیکن

جب سکون اور دلجمعی سے سوچا۔ تو مصلحت اسی میں نظر آئی۔ جب گھر بار ہی لٹ گیا۔ ازدواجی زندگی ہی ختم ہو گئی تو پھر اس مصیبت سے نجات پانا ہی بہتر تھا۔

میں یہ بھی کر گزری۔

بہت روئی۔ اپنے آپ کو اپنی تقدیر کو۔ حتی کہ اپنے مرنے والے والدین کو بھی خوب کوسا۔ نہ وہ مرتے نہ میرا گھر اجڑتا۔

لیکن کیا کر سکتی تھی میں۔ تین زندگیوں کا سوال تھا۔ ان چراغوں کو روشن کرنے کے لیے میں نے اپنے چاروں اور اندھیروں کی دبیز تہیں چڑھائی تھیں۔

یوں

میں نے اپنی پرمسرت زندگی برباد کر کے

اپنی کوکھ اجاڑ کے

اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اپنا آپ وقف کر دیا۔ اب میں بہن نہیں تھی۔ سمیعہ تھی شمیم تھی نسیم تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ بچے تعلیمی مدارج طے کرتے گئے۔ شمیم پڑھائی میں کچھ زیادہ تیز نہیں تھا۔

بمشکل بی اے کر سکا۔ ہاں نسیم نے ایم بی اے کر لیا۔ سمیعہ بھی ایف اے میں پہنچ گئی۔

یہ تینوں اب میرے بہن بھائی نہیں بچے تھے۔ میں نے ہمیشہ اسی رنگ میں سوچا۔

نسیم کو ایک اچھی جاب مل گئی۔ شمیم بھی ایک پرائیویٹ فیکٹری میں ملازمت کرنے لگا۔

دونوں بھائی میرے بڑے فرمانبردار تھے۔ جان چھڑکتے تھے مجھ پر۔ سارے فیصلے مجھ پہ چھوڑ دیتے اور میرے کیے ہوئے فیصلوں کو سر آنکھوں پر رکھتے۔ تب مجھے یوں لگتا جیسے ساری عمر کی محنت کا ثمر مجھے مل گیا ہے۔

سمیعہ کے لیے رشتے آ رہے تھے۔ نسیم اور شمیم سے پہلے میں اس کی شادی سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی۔ اب ہم گھر میں ایک کی جگہ تین کمانے والے تھے۔ اس لیے مالی مسائل کچھ زیادہ نہیں تھے۔

"سمیعہ کی شادی اب کر ہی دیں تو اچھا ہے" ایک دن میں نے دونوں بھائیوں سے کہا۔

"باجی، وہ تو ابھی چھوٹی سی ہے" نسیم پیار سے بولا۔

"اتنی چھوٹی بھی نہیں" میں نے کہا۔ اٹھارہ سال کی ہو جائے گی اس دسمبر میں"

"لیکن مجھے تو ابھی چھوٹی ہی لگتی ہے"

"رشتہ اچھا ہے۔ میری بہت پرانی دوست کا بیٹا ہے۔ فوج میں کیپٹن ہے۔ گھرانہ اچھا ہے۔ اور لوگ بھی خواہشمند"

"ٹھیک ہے جو فیصلہ آپ کریں ہمیں منظور ہے"

"سمیعہ کی شادی سے فارغ ہو کر تمہارے لیے رشتے تلاش کروں گی۔"

"ہماری فکر نہ کریں باجی"

"فکر تو کرنا ہی بھائی۔ سمیعہ کی شادی کر لوں۔ تو پھر تم دونوں بھائیوں کے گھر بھی آباد کر دوں گی۔

اب اپنے اپنے بار تم لوگ خود ہی اٹھاؤ۔

نسیم اور شمیم نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ مجھے پیار کرتے ہوئے نسیم بھرائی

ہوئی آواز میں بولا "باجی آپ نے ہمارے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔ کہ شاید ماں باپ ہوتے تو وہ بھی نہ کرتے۔"

"یہ میرا فرض تھا۔"

"اور اب ہمارا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کریں۔" شمیم بولا "باجی آپ نوکری چھوڑ دیں۔ اب ہم دونوں کمانے والے ہیں نا۔"

میں ہنس پڑی "نوکری کیسے چھوڑ دوں۔ اچھا بھلا وقت گزر رہا ہے۔ پیسہ بھی ملتا ہے اور وقت بھی اچھا کٹتا ہے۔"

"پیسہ ہم کما رہے ہیں۔ آپ اب آرام کریں۔"

"چلو، چلو۔ میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی۔ کہ گھر پہ کھاٹ پکڑ کر پڑ رہوں۔"

دونوں بھائیوں نے بہت زور لگایا۔ قائل کرنے کی کوشش کی۔

لیکن

میں نوکری چھوڑ کر کیا کرتی۔

سمیعہ کا رشتہ طے کر کے میں شادی کی تیاریوں میں جٹ گئی۔ زیور بنوایا کپڑے سلوائے فرنیچر خریدا الیکٹرک کی چیزیں لیں۔ معقول سا جہیز دنوں ہی میں تیار کر لیا سمیعہ بے حد خوش تھی۔ میں اس کی خوشیوں کی ہمیشگی کے لیے دعا گو تھی۔ ان دنوں میرا اپنا آپ اندر سے بکھر بکھر گیا۔ مجھے اپنی شادی کی تیاریاں ہنگامے اور بربادی کے سانحے بے طرح یاد آتے رہے۔

لڑکیاں کیسے حسین خواب بنتی ہیں۔ کتنے البیلے ارمان سجاتی ہیں۔ کتنی سحر خیز دنیا میں جینے لگتی ہیں۔ کیا سوچتی ہیں۔ کیا کچھ چاہتی ہیں؟ میں سب جانتی تھی۔

لیکن

کبھی کبھی انجانے حادثے ان دیکھے آلام اس سہانی دنیا کو کیسے تہس نہس کر دیتے

ہیں۔ زندگی پھولوں لدی جھولتی شاخوں سے ایکا ایکی ٹنڈ منڈ درخت بن جاتی ہے۔ جس پر کبھی کوئی کونپل نہیں پھوٹتی۔ برگ و گل نہیں کھیلتے۔ مجھے اس بات کا بھی تلخ ترین تجربہ تھا۔ اسی لیے میں سمیعہ کی خوشیوں کے لیے ہر لمحہ دعا گو تھی۔

سمیعہ اپنے گھر کی ہو گئی۔ اسے خوش و خرم دیکھ کر مجھے لگتا میری محرومیاں سیراب ہو گئی ہیں۔ سمیعہ کی شادی کے بعد میں نے دونوں بھائیوں کے لیے رشتے تلاش کرنا شروع کیے۔ اب ہماری مالی پوزیشن خاصی مستحکم تھی لڑکے شریف تھے اچھے اچھے گھرانے مجھ سے رابطہ کر رہے تھے۔

میں نے خاصی جانچ پڑتال اور دیکھ بھال کے بعد فائزہ کو نسیم اور نبیلہ کو شمیم کے لیے منتخب کیا دونوں لڑکیوں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا۔ قبول صورت بھی تھیں اور سمارٹ بھی۔ میں نے بھابھیاں نہیں بہوئیں تلاش کی تھیں۔ بہوئیں بنا کر ہی انہیں گھر لائی تھی۔ اور بیٹیاں بنا کر رکھا تھا۔

نبیلہ تو پچھلے سال شمیم کے ساتھ دوبئی چلی گئی تھی۔

فائزہ یہیں تھی۔

نسیم کی نوکری یہیں تھی۔ اس لیے اسے یہیں رہنا تھا۔

میں نے تو کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ بھرے پرے اکیلے گھر میں فائزہ کا دم میری وجہ سے گھٹے گا۔ وہ ناآسودہ ہو گی اور میری ذات اس کے لیے بار بنے گی اور میرا بھائی۔ جس کے لیے میں نے اپنی ذات کے ہر پہلو کی سولہ سترہ برس نفی کی ہے۔ بیوی کو خوش کرنے کے لیے اس ذات سے چھٹکارا پانے کے لیے قدم اٹھانے کو تیار ہو جائے گا۔

میں بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ میرے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ قیامت کی ہلچل مچی تھی۔ میں نے جو کچھ اپنے کانوں سے سنا تھا۔ کسی اور نے مجھ سے کہا ہوتا۔ تو میں اس

کا منہ نوچ لیتی۔ کبھی یقین نہ کرتی۔

لیکن

اب جبکہ سیال آگ میرے کانوں میں براہ راست ٹپکی تھی۔ یقین نہ کرتی۔ یقین نہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

ہاں ایک سوال پوری .... جانداری سے اُبھر رہا تھا۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟

فائزہ اور نسیم یہ گھر چھوڑ کر کسی دوسرے گھر میں بس جائیں۔ تو یہ میری سولہ سترہ سالہ محنت اور قربانی کی سبکی تھی۔ انہیں یہیں رہنا چاہیے تھا۔

لیکن

بس، میں کہاں جاؤں، میرا ٹھکانہ کونسا تھا کہاں تھا۔ اپنے ٹھکانے تو میں نے ان بھائی بہنوں کے لیے اُجاڑ ڈالے تھے۔ شوہر کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ کوکھ میں آگ لگا دی تھی۔

عورت کے یہی تو دو ٹھکانے ہوتے ہیں۔ شوہر کا در یا اولاد کا گھر۔

میرا دماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا ہے۔ نسیں چیخ رہی ہیں۔ دل دھواں دھواں اور کوکھ جل رہی ہے۔ میں جانتی ہوں ہر چیز اپنے ٹھکانے پر ہی اچھی لگتی ہے۔

لیکن میرے ٹھکانے

میں سوچ رہی ہوں۔ کیا اپنے ٹھکانے جلا کر میں نے غلطی کی تھی؟

جیت

میجر نثار اس کا عزیز ترین دوست تھا۔ دونوں کا بچپن ایک ہی قصبے میں گزرا تھا۔ میٹرک تک دونوں نے تعلیم بھی اکٹھے ہی حاصل کی تھی۔ نثار نے گجرات کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ لاہور چلا آیا تھا..... یہیں سے ان کے مستقبل کے راستے جدا ہو گئے تھے۔ نثار فوج میں چلا گیا تھا۔ اور وہ ایم بی اے کرنے کے بعد لاہور ہی میں سیٹل ہو گیا تھا۔ قصبے والی جائیداد بیچ کر یہاں ہی کوٹھی بنوالی تھی۔ جس کے عقب میں چھوٹی سی انیکسی بھی بنوائی تھی..... معقول کرائے پر اٹھی رہتی تھی۔ یوں بھی اس نے نوکری کی بجائے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا تھا۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہو گئی تھی، اب اس کا شمار اچھے بزنس مینوں میں ہوتا تھا۔ دونوں بہنوں کی شادیاں اس نے دھوم دھام سے کی تھیں۔ اب امی کے ساتھ یہاں رہ رہا تھا۔ شادی ابھی نہیں کی تھی۔ پہلے بزنس کے چکروں میں اُلجھا رہا۔ اب کچھ آزادی ملی تھی۔ دور پار کی کزن پنکی سے نسبت بھی ٹھہر گئی تھی..... پنکی اسے پسند بھی تھی۔ دونوں آزادانہ ملتے جلتے بھی تھے۔ ماں شادی جلد کرنے کی خواہشمند تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی۔ کہ یہ معاملہ التوا میں ڈالنا پڑتا.....

نثار ملازمت کے سلسلے میں جگہ جگہ گھوم رہا تھا۔ چھ ماہ پہلے اس کی پوسٹنگ لاہور ہوئی تھی۔ اتفاق ہی سے دونوں کی ملاقات ایک سٹور میں ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اس دفعہ دونوں پورے دو سال بعد ملے تھے۔ اس نے نثار سے گلہ کیا۔

" تو یہ یار زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے۔ کہ کچھ نہ پوچھو..... رابطہ رہے یا نہ رہے ہم

ایک دوسرے کو بھول تو نہیں سکتے نا.....“

”بس بس باتیں نہ بناؤ..... کہو کیسے ہو؟“

”بس ٹھیک ٹھاک.....“

”یہاں کیسے آئے؟“

”پوسٹنگ ہو گئی ہے.....“

”بھابی اور بچے؟“

”میس میں ٹھہرے ہیں۔ ہم لوگ..... یار یہاں گھر ملنا مشکل ہے۔ کوئی مدد کرو نا... عذرا کو میں پنڈی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا.... گھر تو دو ماہ تک اور رکھ سکتا تھا وہاں، لیکن اکیلی کو بچوں کے ساتھ.....“

”گھر کا کوئی مسئلہ نہیں..... آج کل ہماری انیکسی خالی ہے۔“

”سچ.....“

”ہاں۔ تم بے دھڑک آ سکتے ہو.....“

”نوید تم نے تو میری بڑی پریشانی دور کر دی۔ دراصل ان دنوں حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ ہماری ڈیوٹیاں کبھی کہیں لگتی ہیں کبھی کہیں..... ہو سکتا ہے محاذوں پر ہی جانا پڑے۔ میں عذرا اور بچوں کی وجہ سے بہت پریشان تھا..... جب تک ابا جی زندہ تھے..... کوئی مسئلہ نہیں تھا..... وہ عذرا کے پاس ہوتے تھے۔ لیکن ابا جی کے فوت ہونے سے.....“

پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ انیکسی اتفاق ہی سے خالی ہے۔ آج ہی شفٹ کر سکتے ہو۔ پھر جہاں جی چاہے جاؤ۔ بھابی اور بچوں کی تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ میں ہوں امی ہیں۔ بھابی اور بچے ہمارے بھی تو کچھ لگتے ہیں۔ دیکھ بھال کی پوری ذمہ داری ہماری.....“

خوش رہو دوست.....“

نوید نے انیکسی نثار کو دے دی تھی۔ دوستی کا تقاضا تو یہی تھا کہ کرائے کا سوال ہی نہ اُٹھے۔ لیکن نثار بضد تھا......

”جب مجھے کرایہ ملتا ہے گورنمنٹ سے تو پھر میں مفت میں کیوں رہوں۔ یہ کرایہ تمہیں لینا ہی پڑے گا..... ورنہ میں اپنا بوریہ بستر گول کر کے پھر میس میں چلا جاؤں گا.....“

”اچھا تو نہیں لگتا۔ لیکن تمہاری مرضی.....“

”میرے لیے اتنا ہی بہت ہے یار کہ تم اور خالہ میری بیوی اور بچوں کی نگہداشت کرو گے۔ میں بے فکر ہو کر جہاں بھی رہا رہوں گا.....“

نثار کو اکثر ہفتے عشرے کے بعد دو چار دن کے لیے ادھر ادھر جانا پڑتا..... اب اسے قطعاً کوئی فکر نہ ہوتی..... اسے یوں لگتا عذرا اور بچے اس کے بھرے ہوئے گھر میں رہ رہے ہیں۔

ان دنوں ملکی حالات اچھے نہیں تھے۔ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ میجر نثار بھی اپنی یونٹ کے ساتھ ان دنوں کسی بارڈر پر تھا..... اسی لیے اس دفعہ اتنی دیر کے بعد گھر آیا تھا۔ نوید اس سے ملنے اور کچھ جنگ کی امکانی صورت پر بات چیت کرنے کے ارادے سے برآمدے سے نکل کر انیکسی کی طرف جا ہی رہا تھا کہ نثار لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف آ گیا۔ وہ وردی پہنے ہوئے تھا۔ دونوں بڑے تپاک سے گلے ملے.... پھر نوید مصافحہ کرتے ہوئے اسے سر تا پاؤں دیکھ کر بولا یار وردی ہی میں سوئے تھے کیا؟

”کچھ ایسی ہی بات ہے“ وہ بھی مسکرایا.....“ ابھی جا رہا ہوں واپس..... تم سے ملنے.....“

”آئے کب تھے؟“

”رات ایک بجے۔“

” ایک بجے اور ابھی واپس جا رہا ہوں.....“

” دونوں ملکی حالات کی باتیں کرنے لگے..... پھر نثار بولا.....“ خالہ کو سلام کرا دو، پھر جانے کب آنا ہو..... ڈیوٹی پر جا رہا تھا..... موقع مل گیا..... چند گھنٹے گھر گزار لیے.....“

” دونوں اندر چلے آئے..... نثار نے نوید کی امی کو سلام کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں۔ وہ چند لمحے رُکا..... آتے آتے بولا ” خالہ خدا کے بعد عذرا اور بچوں کو آپ کی حفاظت میں چھوڑ کر جا رہا ہوں.....“

” تم بالکل بے فکر رہو بیٹا..... عذرا مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے..... تمہارے بچے ہمارے بچے ہیں.....“

” میں آپ کا بیحد ممنون ہوں.....“

” جاؤ..... خدا حافظ.....“

” خدا حافظ.....“

” نثار ٹیکسی کی طرف آیا۔ عذرا برآمدے میں کھڑی تھی۔ ببلو اور نمو باپ سے لپٹ گئے۔ اس نے دونوں کو پیار کیا..... عذرا سے کچھ باتیں کیں اور جیپ کی طرف چلا آیا۔ جیپ چلی تو بچے لپک لپک کر ادھر آنے لگے۔ ببلو نے تو واویلا مچا دیا..... نثار بیوی بچوں کو بظاہر تسلی دیتے گاڑی نکال لے گیا۔ لیکن کچھ دلگرفتہ سا نظر آ رہا تھا۔

دونوں لمبی ڈرائیو پر گئے تھے۔ موسم خاصہ ٹھنڈا تھا..... آسمان پر بادل گھر گھر آ رہے تھے۔ اور ہوائیں بھی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔

” شام اُترنے لگی تو پنکی نے اپنی کلائی پر بندھی نازک سی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

” نوید..... اب واپس چلیں.....“ وہ جلدی سے بولی۔

” کیوں..... زیادہ دیر تو نہیں ہوئی.....“

” مجھے لینے ممی آنے والی ہی ہوں گی.....“

تو کیا ہوا..... تمہاری ممی میری امی سے کچھ دیر باتیں کر لیں گی۔ ہو سکتا ہے۔ ہمارے مسئلے کا حل ہی تلاش کر لیں“ وہ ہنس کر شوخی سے بولا.....“

” پنکی نے حیرانی سے اسے دیکھ کر پوچھا“ ہمارا مسئلہ؟“

” ہاں بھئی ہماری شادی مسئلہ ہی بنی ہوئی ہے نا.....“

” ممی یہی کہیں گی کہ تمہارے پپا دسمبر میں نہیں آ سکتے۔ چھٹی نہیں ملے گی انہیں..... ابھی چند ماہ پہلے تو یہاں سے ہو کر گئے ہیں.....“

” ٹھیک تو ہے۔ امریکہ سے آنا آسان تو نہیں۔ جب پپا آئے۔ تو تمہاری امی یہاں نہیں تھیں ثروت آپا کے پاس مسقط جا چکی تھیں.....“

میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ میرا الٹی میٹم ہے.....“

” الٹی میٹم“ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی.....“ شادی کرنی ہے۔ کہ جنگ کرنے جا رہے ہو؟“

” کچھ سمجھ لو.....“

” ویسے نوید مجھے لگتا نہیں۔ کہ دسمبر میں بھی ہماری شادی ہو سکے گی.....“

” ملکی حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں نا..... کوئی پتہ کب جنگ چھڑ جائے.....“

” امکان تو بہت ہے..... لیکن میں بتا دوں تمہیں۔ میں نے دسمبر میں شادی ضرور کرنی ہے۔

” جنگ چھڑے نہ چھڑے۔ یہ شادی ہو گی سمجھیں.....“

” وہ ہنستے ہوئے بولی“ گولیوں بموں کی بوچھاڑ میں شادی کرنا اچھا لگے گا۔

بالکل“۔

"ہائے..... کیسی باتیں کرتے ہو نوید....."

"جیسی کرنی چاہئیں....."

"مجھ سے تو نہ کرو۔"

"اور کس سے کروں۔"

"اپنی امی سے..... یا پھر میری ممی سے....."

"ٹھیک ہے آج ہی گھر جا کر کروں گا دونوں سے.....

"پنکی شوخ ادائی سے اسے دیکھتے ہوتے بولی" صرف باتیں کرنا..... الٹی میٹم نہ دینا....."

"وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیا....."

"ہیلو" نوید نے نثار کو برآمدے میں دیکھا تو لپک کر اس کی طرف آیا۔ لگتا ہے ابھی ابھی آئے ہو....."

"ہاں" وہ اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا..... "دوپہر میں آیا تھا....."

"آج بھی ڈیوٹی پر جاتے ادھر کھسک آئے۔"

"نہیں یار..... پوسٹنگ ہو گئی ہے۔"

"کہاں؟"

"ایسٹ پاکستان۔"

نثار نے ایک گہری ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے نوید کی طرف دیکھا۔

"آؤ بیٹھو تو....." نوید نے برآمدے میں پڑی ایزی چیئر کی طرف اشارہ کیا پھر اس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ یہ تو بُری خبر سنائی تم نے....."

"بُری کیسے..... سپاہی کی جہاں ضرورت پڑے اسے جانا ہی پڑتا ہے۔

"پھر نوید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا" خاصے پریشان نظر آ رہے ہو..... جنگ کے

امکان بہت بڑھ گئے ہیں نا..... ایسٹ پاکستان میں تو مکتی باہنی سے بھی نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے اور سرحدوں پر بھی خطرہ بڑھ رہا ہے۔

"جنگ ناگزیر ہے نوید۔ لیکن میں پریشان جنگ لڑنے سے نہیں ہوں" اس نے دونوں ہاتھ سر تلے باندھ کر کرسی کی پشت پر سر ٹکا رکھا تھا۔

"تو پھر....."

"صرف عذرا اور بچوں کا خیال آتا ہے....."

"انہیں چھوڑتے ہوئے یقیناً دل پریشان ہوگا....."

"یہ بات بھی نہیں....."

"تو پھر....."

"سوچتا ہوں۔ میں واپس نہ آسکا تو ان کا کیا ہوگا۔

"نثار....."

"ہاں دوست..... میں ایک بے سہارا خاندان کا سربراہ ہوں، تم جانتے ہو، نہ میرا کوئی قریبی عزیز ہے۔ نہ عذرا کا۔ ابا جی زندہ ہوتے تو کوئی پریشانی نہ تھی۔ جب تک زندہ تھے۔ میں عذرا اور بچوں کی وجہ سے کبھی متفکر نہ ہوا تھا۔

"لیکن اب..... اگر....."

"اگر کیا....."

"اگر میں شہید ہو گیا..... تو ان کا کیا بنے گا۔ کس کے سہارے جئیں گے..... میرے بچے اور عذرا....."

"اس کی آواز بھرا گئی..... نوید کا دل بھی ہول رہا تھا۔ وہ چپ رہا..... چند لمحوں بعد نثار خود ہی بولا....." جنگ سے پریشان نہیں ہوں۔ نہ ہی بزدل ہوں۔ گھر آیا ہوں۔ تو عذرا کے شوہر اور بچوں کے باپ کی حیثیت سے سوچ رہا ہوں۔ جب سپاہی میدان

جنگ میں ہوتا ہے تو وہ اس وقت صرف اور صرف مادر وطن کا بیٹا ہوتا ہے۔ اس کے تحفظ کا سوچتا ہے اور لڑتا ہے۔ بیوی بچے بھائی بہن ماں باپ کوئی یاد نہیں رہتے۔"

" تو..... تو پھر تم پریشان....."

" وہ سیدھا ہوتے ہوئے اداس سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا..... کہا ہے نا گھر آیا ہوں، تو ان سب کو دیکھ کر خیال آیا ہے۔ کہ اگر میں واپس نہ لوٹا تو یہ سب کیا کریں گے، میرے پاس تو ان کا مستقبل سنوارنے کے لیے کوئی بڑا مالی سہارا بھی نہیں۔ ایک مکان تک اپنا نہیں مجھے کچھ ہو گیا تو یہ کیا کریں گے۔ کہاں سر چھپائیں گے بچے....."

" نثار..... خدا کرے تم زندہ و سلامت لوٹ آؤ..... گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

" وہ مسکرا کر بولا....." چھٹی حس ہوتی ہے نا..... وہ مجھے اکسا رہی ہے" کہ ان کا کچھ کر کے جاؤ..... شہادت کا مرتبہ بڑا عظیم ہے۔ یہ قسمت والوں کو ملتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں، لیکن پتہ نہیں کیوں؟ پتہ نہیں..... کیوں"

نوید دل گرفتہ سا نظر آنے لگا۔ چند لمحے بوجھل سی خاموشی رہی... پھر نثار بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے بولا..... میں کتنا بے وقوف ہوں۔ تمہیں خواہ مخواہ پریشان کر دیا....."

" نوید اداس لہجے میں بولا" نثار تم مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہو..... تم پریشان ہو گے تو کیا مجھے کچھ محسوس نہیں ہو گا" چلو چھوڑو یار... کوئی اور باتیں کرو.... سنا ہے پنکی آئی ہوئی تھی۔ کب تک گھر بسا رہے ہو....."

" نوید اس کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے بولا...." نثار..... تم بیوی بچوں کی بالکل فکر نہ کرو۔ بے غم ہو کر جاؤ۔ امی ہیں..... میں ہوں۔ ان کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے؛

وہ دکھ سے ہنس کر بولا....." وہ تو تم کر ہی رہے ہو.... لیکن یہ دیکھ بھال عمر دراز کا معاملہ بن گئی تو کیا کرو گے۔

" تم اندر سے بے انتہا مایوس ہو....." سچ پوچھو تو دل کہتا ہے، شہادت کا رتبہ

پاؤ گے؟

نوید چند لمحے چپ رہا.... پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا...." نثار خدا کرے تم زندہ و سلامت واپس آؤ..... لیکن..... اگر..... خدانخواستہ....."

" ہوں"

" خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو بھی گیا نا..... تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں.... عذرا بھابی اور بچوں کی ساری عمر دیکھ بھال کروں گا....."

" نثار نے دکھ سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولا" ایسا وعدہ نہ کرو نوید....."

" نوید جب وعدہ کرتا ہے تو اسے نبھاتا بھی ہے۔ یہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو....."

" نثار چپ رہا....."

" نوید خود ہی بولا....." ہاتھ ادھر کرو....."

" نثار نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا..... نوید نے اس کا ہاتھ، ہاتھ میں لیا اور خدا کو حاضر ناظر جان کر سچے دل سے وعدہ کیا....." اب تو یقین کرو گے....."

" خوش رہو دوست..... میرے دل کا بڑا بھار تم نے ہلکا کر دیا... اب میں اطمینان اور سکون سے اپنا فرض انجام دے سکوں گا.... شہید ہو گیا تو بھی....."

" نوید نے اس کی بات کاٹی اور ہنسنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا" تم جیسوں کو شہادت نصیب نہیں ہوتی....."

" پھر دونوں دیر تک سنجیدگی سے باتیں کرتے رہے۔ نوید نے نثار کے بیوی بچوں کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے کر نثار کے دل کا بار ہلکا کر دیا۔

نثار کی شہادت کی خبر عذرا نے جس سکون اور حوصلے سے سنی۔ امی اور نوید ششدر رہ گئے۔ لیکن وہ باہر سے جتنی مضبوط اور فولادی تھی اندر سے اتنی ہی کمزور و ناتواں۔ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی..... کئی دن تو حواس ہی بجا نہ رہے۔ بچوں کا ہوش رہا نہ گھر کا.....

وہ تو نوید اور امی تھے جنہوں نے بچوں کو سینے سے لگایا..... اور عذرا کی دیکھ بھال کی ..... دوست احباب ساتھی سبھی عذرا کے دکھ میں شریک ہوئے..... اور پھر اپنی مصروف زندگی کی طرف لوٹ گئے..... نوید کو اپنے بہترین اور عزیز دوست کے بچھڑنے کا بیحد افسوس تھا..... وہ تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا..... اس کی باتیں یاد کر کے تڑپتا تھا..... اسے بہت دکھ تھا..... اتنا دکھ کہ پنکی جب اس سے ملنے آئی تو وہ اس سے بھی نثار ہی کی باتیں کرتا رہا.....

پنکی کو دوست کی خاطر نوید کا اتنا اداس اتنا پریشان ہونا کچھ اچھا نہ لگا۔

"وہ سپاہی تھا نوید۔ اور سپاہی وطن کی حفاظت کے لیے جان دیتا ہی ہے۔ وہ شہید ہوا ہے۔ تمہیں یہ سوچ کر خوش ہونا چاہیے۔ تم تو عورتوں سے بھی بڑھ کر اس کا ماتم کر رہے ہو....."

"پنکی..... تم نہیں جانتیں..... میرے دل میں اس کی کتنی محبت کتنی وقعت ہے۔"

"اب کیا کر سکتے ہو..... وہ جی تو نہیں اٹھے گا تمہارے اس طرح نڈھال اور بے حال ہونے سے۔"

"یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔"

"پھر..... اپنے آپ میں آؤ..... چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ لگتا ہے تم نے اتنے دنوں سے ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا....."

"لقمہ حلق سے نیچے جاتا ہی نہیں....."

"او..... بس بھی کرو..... اُٹھو تیار ہو جاؤ..... تم نے تو کاروبار کی طرف بھی اتنے دنوں سے کوئی دھیان نہیں دیا..... اس طرح اپنا ہی نقصان کر دو گے....."

"مجھے نثار کی جدائی سے بہت صدمہ ہوا ہے پنکی..... وہ میرا دوست نہیں بھائی تھا..... بچپن کا ساتھی تھا....."

"جانتی ہوں..... پر اب کیا ہو سکتا ہے..... اٹھو تیار ہو جاؤ....."

"وہ اسے اپنے ساتھ باہر لے گئی....." گھمایا پھرایا۔ کھانا کھلایا..... ادھر ادھر کی باتیں کر کے دل بہلایا۔ پھر اسے چھیڑنے کی خاطر بولی" نوید..... تم دسمبر میں شادی کے خواہاں تھے نا..... دسمبر جنگ کی نظر ہو گیا۔ میرے خیال میں بات مارچ اپریل تک جا پڑے گی۔ تب ڈیڈی بھی آجائیں گے....."

"نوید نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن صدمے سے ماؤف سا تھا.....

نوید اور امی نے عذرا اور بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا..... عذرا ذرا سنبھلی تو اسے مستقبل کی فکر ستانے لگی..... سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا..... کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔

نوید نے دوڑ دھوپ کر کے نثار کی پنشن اور دیگر واجبات اسے دلا دیئے تھے۔ وہ خود ایف اے تک پڑھی تھی۔ لیکن چھوٹی موٹی نوکری مل سکتی تھی....."

اسی دن امی اور نوید آئے ہوئے تھے..... عذرا کی دلجوئی کی باتیں کر رہے تھے۔

"جس چیز کی ضرورت ہو بے دھڑک کہہ دیا کرو بیٹی..... کسی قسم کی غیریت کا احساس نہ کرنا..... مجھے اپنی ماں ہی سمجھو....."

"ہاں عذرا بھابی....." نوید بولا..... "نثار میرا جگری دوست ہی نہیں بھائی بھی تھا..... آپ ہمیں اپنا ہی سمجھیں..... کوئی ضرورت ہو بلا جھجک کہہ دیا کریں....."

"نوید بھائی..... مجھے کوئی چھوٹا سا کرائے کا گھر دلا دیں..... میں....."

"عذرا بیٹی" امی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا..... کیوں غیروں کی سی باتیں کر کے میرا دل دکھاتی ہو۔"

"امی..... آپ کی انیکسی....."

" ہماری نہیں، یہ تمہاری ہے.... امی بولیں....."

" نوید جلدی سے بولا" نثار زبردستی کرایہ دیتا تھا۔ اسے ہاؤس رینٹ ملتا تھا، لیکن اب کرائے والی بات نہیں۔ آپ اس کو اپنی جگہ سمجھیں..... ایسی بات دوبارہ زبان پہ لائیے گا بھی نہیں۔ آپ میرے بھائی کی بیوہ ہیں۔ آپ کی ساری ذمہ داریوں کا بار اب مجھ پر ہے۔ خدا کا فضل ہے، میں آپ اور آپ کے بچوں کا خرچہ اٹھا سکتا ہوں۔

" نہیں بھائی.... ان کا خرچہ..... نثار کی پنشن..... اور..... اور پھر.... میں خود بھی نوکری کر لوں گی۔

" نہیں عذرا بھابی..... نوید نے کہا" نوکری کا سوچیئے گا بھی نہیں... نثار سے میں نے وعدہ کیا تھا..... میں اس وعدے سے منحرف نہیں ہوؤں گا.... نثار نے آپ کو بھی تو بتایا ہوگا....."

" عذرا ہمدردی اور خلوص پاکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... امی نے اسے سینے سے لگا لیا..... نوید بہت بے چین اور پریشان نظر آنے لگا....."

" دیکھو نوید"

" ہوں"

" میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ....."

" بار بار تمہیدیں کیوں باندھ رہی ہوں۔ کہہ کیوں نہیں پاتیں..... کوئی خاص بات ہے۔"

" ہاں....."

" کہو...."

" تم انیکسی خالی کروا لو....."

" پنکی....."

" ہاں.... عذرا کا.... یہاں رہنا... مناسب نہیں....."

" پنکی.... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا....."

" عذرا یہیں رہی تو یقیناً خراب ہو جائے گا"

" تم کہنا کیا چاہتی ہو....."

" وہی جو لوگ کہہ رہے ہیں....."

" لوگ؟ کیا کہہ رہے ہیں لوگ....."

" جو کہنا چاہیئے....."

" سیدھی طرح بات کرو.... میں سمجھ نہیں پا رہا....."

" نوید.... تم اتنے بچے بھی نہیں ہو.... لوگ تمہارے اور عذرا کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ تم جانتے نہیں کیا.... باتیں کرنا بھی چاہئیں، ایک جوان عورت سے اتنا میل ملاپ....."

" پنکی.... زبان سنبھال کر بات کرو.... تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ عذرا بیوہ ہے۔ اس کے بچے یتیم ہیں، کیا بیوہ اور یتیموں کا خیال رکھنا گناہ ہے....."

" وہ تمہارے لگتے کیا ہیں، جو تم ان پر اتنے مہربان ہو رہے ہو۔

" وہ میرے دوست اور میرے بھائی کے بیوی بچے ہیں، جو شہید ہو چکا ہے اور جن کی ذمہ داری میرے ذمہ ہے۔

" ہونہہ...." پنکی نے حقارت سے ہنکارا بھرا اور پھر بولی" تم بھی کان کھول کر سن لو.... میں شادی اس وقت تک نہیں کروں گی..... جس وقت تک عذرا اس انیکسی میں ہے۔ اسے یہاں سے چلتا کرو گے تو شادی بھی ہو گی.....

"تو پھر میرا بھی فیصلہ تم نے سن لیا ہے۔ عذرا اور بچے یہیں رہیں گے۔ ان کا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ بے سہارا عورت اور یتیم بچے کہیں نہیں جا سکتے۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ نہیں جا سکتے تو سینے سے لگا کر رکھو انہیں۔۔۔۔ میں تو جا سکتی ہوں نا"

"وہ غصے سے پھنکارتی اٹھ کر چلی گئی۔۔۔۔"

"نوید غصے اور پریشانی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا پھرا۔

عذرا بھی بہت پریشان تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اڑتی اڑتی اس کے کانوں میں بھی پڑتی تھی۔ پنکی اور نوید کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ یہ بھی اسے پتہ چلا تھا۔ اس کی ذات ان کی خوشیوں کے آڑے آ رہی تھی۔ اس نے انیکسی چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے آہستگی سے یہ بات نوید کی امی سے کہی۔

"جاؤ گی کہاں بیٹی"

"خدا کی دنیا بڑی وسیع ہے امی۔۔۔۔"

"لیکن جوان عورت اکیلی رہے کیسے۔۔۔۔ دنیا بڑی ظالم ہے بیٹی۔۔۔۔"

"لیکن میری وجہ سے آپ کا ہنستا بستا گھر۔۔۔۔"

"پنکی ناسمجھ ہے۔ جوشِ جذبات میں صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔۔۔۔"

"عذرا چپ ہو گئی۔ امی اسے تسلی دلاسے دیتی رہیں۔ لیکن عذرا دیکھ رہی تھیں۔ کہ امی خود بھی خاصی الجھن میں ہیں۔

"وہ بولی "میری ایک سہیلی یہیں رہتی ہے۔ اس نے مجھے ایک کمرہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں وہاں چلی جاؤں گی۔ آپ کی محبت اور احسان کی شکر گزار ہوں امی۔۔۔۔

آپ نے اور نوید بھائی نے میرا جتنا خیال رکھا۔ جتنی شفقت سے مجھے حالات سے نبھاہ کرنا سکھایا۔ میں عمر بھر نہیں بھول پاؤں گی۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔۔۔۔"

"لیکن نوید کب مانے گا۔۔۔۔ وہ وعدے اور قول کا جتنا پکا ہے۔۔۔۔ تم شاید نہیں جانتیں۔ اور پھر۔۔۔ یہ وعدہ توڑ کر وہ اپنے آپ کو شہید کے سامنے رسوا نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں کرے گا۔۔۔۔ تم کسی کی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو بیٹی۔۔۔۔"

"لیکن امی۔۔۔۔" عذرا رو دی۔

"امی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔۔۔۔ مسئلے کا حل ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔"

"امی"

"کیا ہے بیٹے"

"ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"کہو۔۔۔۔ پوچھنے کی کیا بات ہے؟۔۔۔۔"

"میں نے بہت غور و خوص کے بعد اک فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔"

"کیا؟"

"شاید آپ کو اچھا نہ لگے لیکن۔۔۔۔"

"نوید کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔۔"

"امی میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔"

"امی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے مسکرا کر نوید کو دیکھا۔ جو بے انتہا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔۔۔۔"

"شادی۔۔۔۔ تو کرنا ہی ہے۔۔۔۔ پنکی کی ممی۔۔۔۔"

"امی میں پنکی سے شادی نہیں کروں گا۔"

"کیا؟....."

"حیرت زدہ نہ ہوں امی... یہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے....."

"تو.... تو.... پھر.... پنکی سے شادی نہیں کرو گے تو.... پھر...."

"امی پنکی نے خود ہی انکار کیا ہے...."

" امی نے سوالیہ نگاہوں سے نوید کو دیکھا...."

" نوید سر جھکاتے ہوئے بولا" امی میں نے فیصلہ کیا ہے.... کہ میں پنکی سے نہیں عذرا سے شادی کروں....."

امی نے دھک دھک کرتے دل کو رکتا محسوس کیا.... بے اختیارانہ سینے پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی نظروں سے نوید کو دیکھا....."

" نوید نے مضبوط لہجے میں کہا" امی یہ نہ تو محبت کی شادی ہے نہ مجبوری کی صرف ضرورت کی شادی ہے۔ عذرا اور بچوں کو سہارے کی ضرورت ہے۔ میرے شہید دوست کے اس خاندان کو میری ضرورت ہے۔

..... نثار کے سامنے سرخرو ہونا میری زندگی کا مقصد ہے امی.... میرے نیک جذبات کو لوگ جو رنگ دے رہے ہیں۔ اس سے عذرا کی بدنامی ہوتی ہے۔ ایک پارسا عورت ناحق بدنام ہو.... میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس سارے مسئلے کا حل یہی ہے کہ میں اس سے نکاح کر کے دینی دنیاوی اور قانونی طور پر ان کا سرپرست بن جاؤں امی چپ ہو گئیں۔ اس بات کو ذہنی طور پر قبول نہ کر پا رہی تھیں، پریشان ہو گئیں۔ بے چینی سے بیٹے کو دیکھا..... "لیکن نوید کا فیصلہ اٹل تھا....."

"عذرا" نوید نے اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"جی" بیڈ کے قریب بیٹھی بنو کے بیٹے کے موزے بنتے ہوئے عذرا نے ہاتھ روک کر جواب دیا۔

" خدا کا شکر ہے ہماری زندگی کا مشن پورا ہو گیا۔ ببلو کو جاب مل گئی.... نمو اپنے گھر کی ہو گئی اور صلو کو بھی میڈیکل میں داخلہ مل گیا....."

" عذرا نے اک گہری سانس لی..... اور عقیدت بھری نظروں سے نوید کو دیکھا....."

"میرے اور میرے بچوں کے لیے آپ نے....."

" اوں ہوں" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا" عذرا یہ بچے میرے بھی تو بچے ہیں.... تم میری بیوی ہو۔ اپنے بیوی بچوں کے لیے ہر کوئی وہی کچھ کرتا ہے جو میں نے کیا....."

" آپ عظیم ہیں....؟ عذرا کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ نوید نے اس سے نکاح کر کے پنکی سے دستبردار ہونے کی جو قربانی دی تھی..... وہ اس سے مخفی نہ تھی....."

" نوید نے چشمہ آنکھوں سے اتارتے ہوئے مسکرا کر عذرا کی طرف دیکھا "عظیم تو تم ہو عذرا....."

" عذرا نے آنچل سے اپنی نم آنکھیں پونچھیں اور گمبھیر لہجے میں بولی..... آپ نے ہماری خاطر بہت بڑی قربانی دی..... آپ برسوں جنگ لڑتے رہے۔ آپ غازی ہیں، نوید غازی ہیں۔ نثار شہید ہے۔ آپ غازی ہیں....."

" غازی" نوید بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا....."

" ہاں"

" بھئی اتنا بڑا اعزاز مجھے کیسے مل گیا..... نثار نے تو وطن کی حفاظت کرتے جان دی.... میں نے کونسا معرکہ مارا عذرا بیگم....."

" آپ نے بڑا عظیم معرکہ مارا ہے....." عذرا اس کی طرف احترام سے دیکھتے ہوئے بولی..... جنگیں صرف ملکی سرحدوں پر ہی نہیں لڑی جاتیں نوید..... دل کے محاذوں پر بھی تو لڑی جاتی ہیں....."

" نوید چند لمحے چپ رہا پھر اٹھ کر عذرا کے قریب آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

جھکتے ہوئے بولا.....؟ مجھے اعتراف ہے عذرا..... میں نے دل کے محاذوں پر جنگ لڑی لیکن میں نے اس جنگ میں ہارا کچھ نہیں..... جیتا ہی ہے. کانچ کے ٹکڑے کو کھو کر ہیرا پایا ہے یہ جیت ہی تو ہے.....''

'' عذرا نے سر اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا.....''چلئے اسی حوالے ہی سے سہی..... غازی تو ہوئے نا آپ.....''

'' نوید نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر رکھا ہاتھ پیار سے دبایا..... عذرا نے اس ہاتھ پہ گال ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں.....''

اس کے چہرے پر عقیدت اور محبت میں گھلی احسان مندی کے رنگ بکھر گئے.
